BOOK HOME

بالی وُڈ کا بے تاج بادشاہ

سوانح عمری

شاہ رُخ خان

انوپاما چوپڑا

KING OF BOLLYWOOD SHAH RUKH KHAN
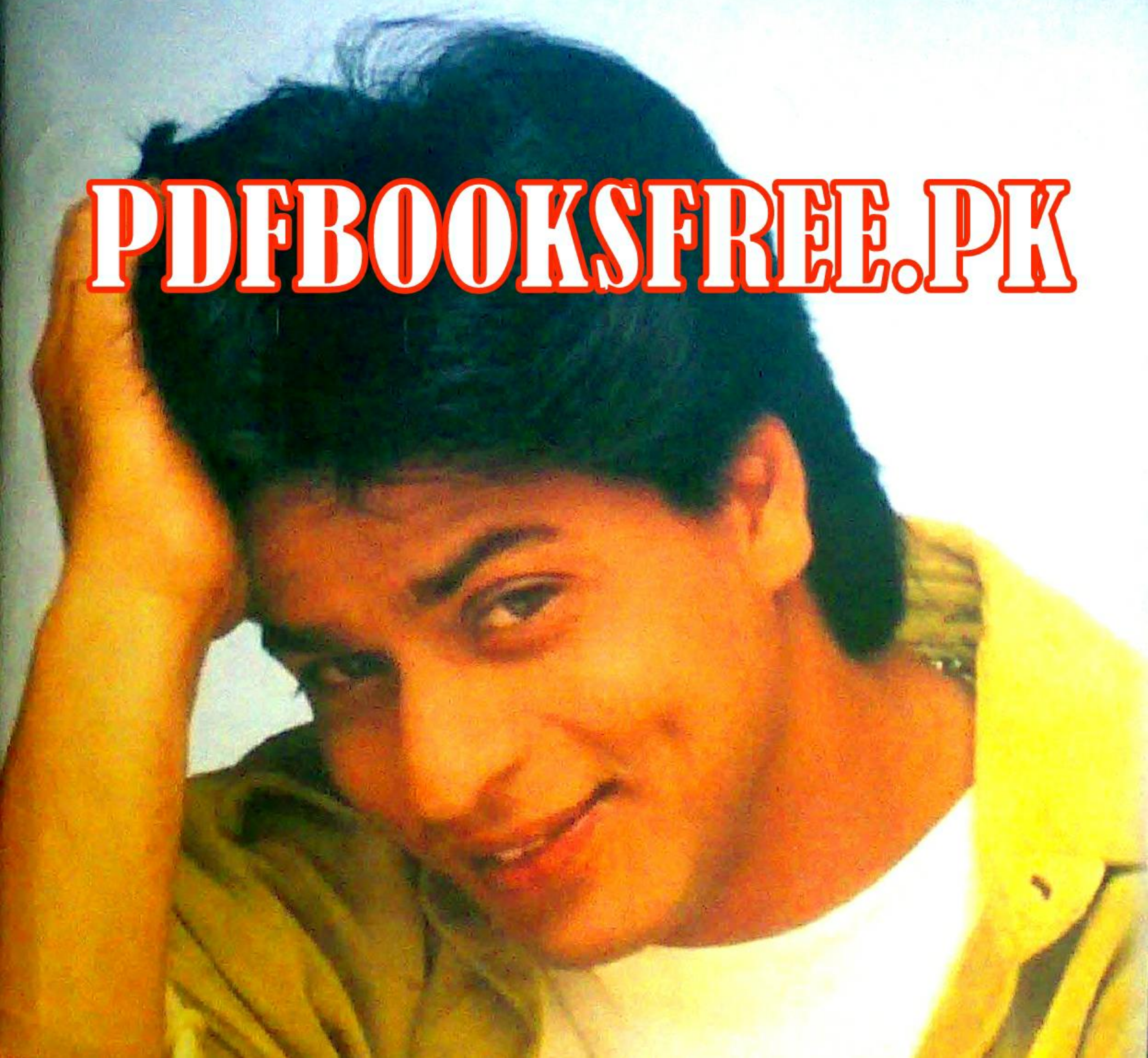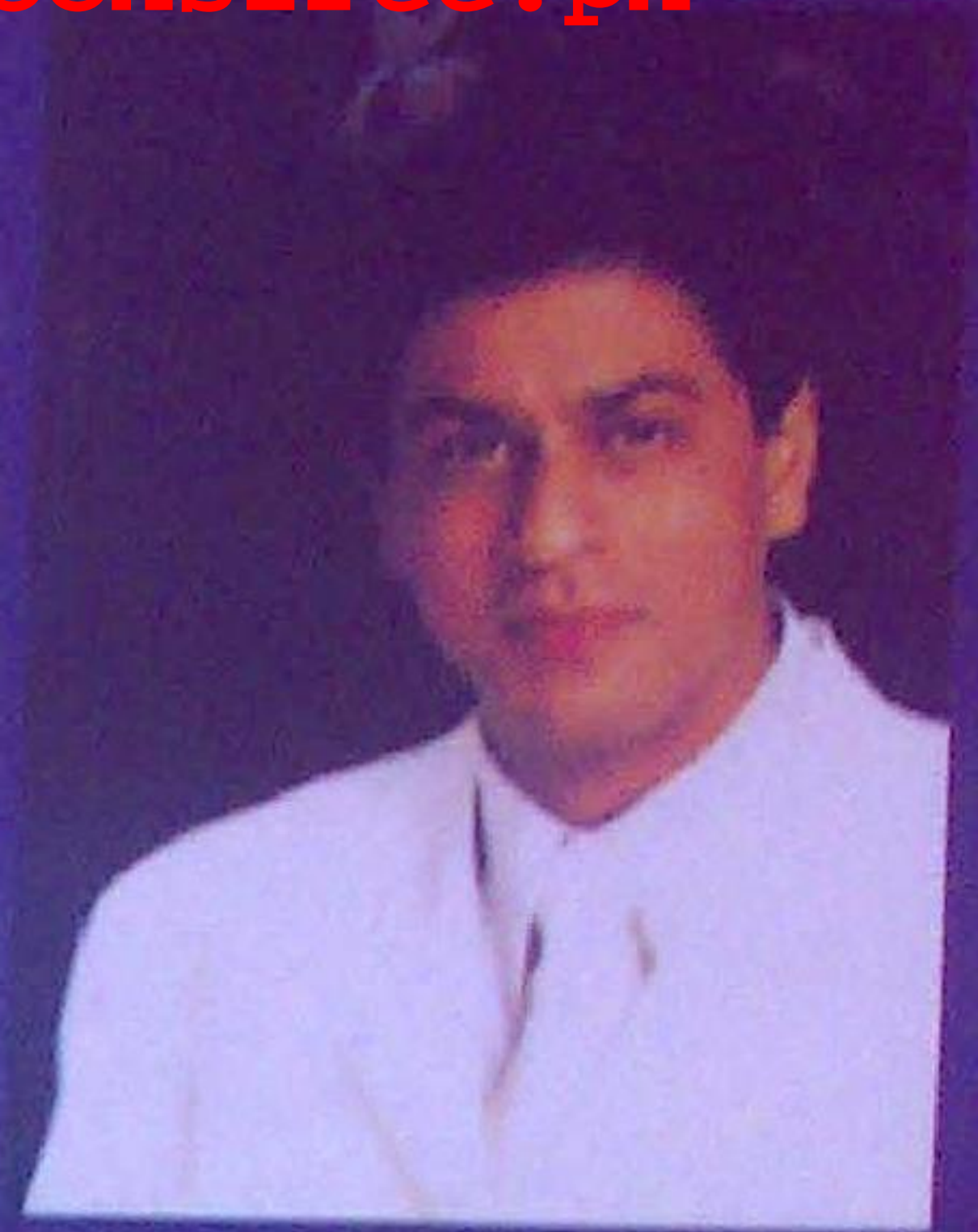
سوانح عمری

شاہ رُخ خان

بالی وُڈ کا بے تاج بادشاہ

مصنف: انوپاما چوپڑا
مترجم: ریاض محمود انجم

BOOK HOME

KING OF BOLLYWOOD Shah Rukh Khan
and the Seductive World of Indian Cinema
By: Anupama Chopra

شاہ رُخ خان

بالی وُڈ کا بے تاج بادشاہ

مصنف: انوپاماچوپڑا

مترجم: ریاض محمود انجم

اہتمام	راناعبدالرحمٰن
پروڈکشن	ایم سرور
کمپوزنگ	محمد انور
پرنٹرز	آب وتاب پرنٹرز، لاہور
اشاعت	2011ء
قیمت	460 روپے
ناشر	بک ہوم لاہور

بک ہوم
بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ لاہور پاکستان
فون:042-37231518-37245072 فیکس:042-37310854
bookhome1@hotmail.com - bookhome_1@yahoo.com
www.bookhomepublishers.com
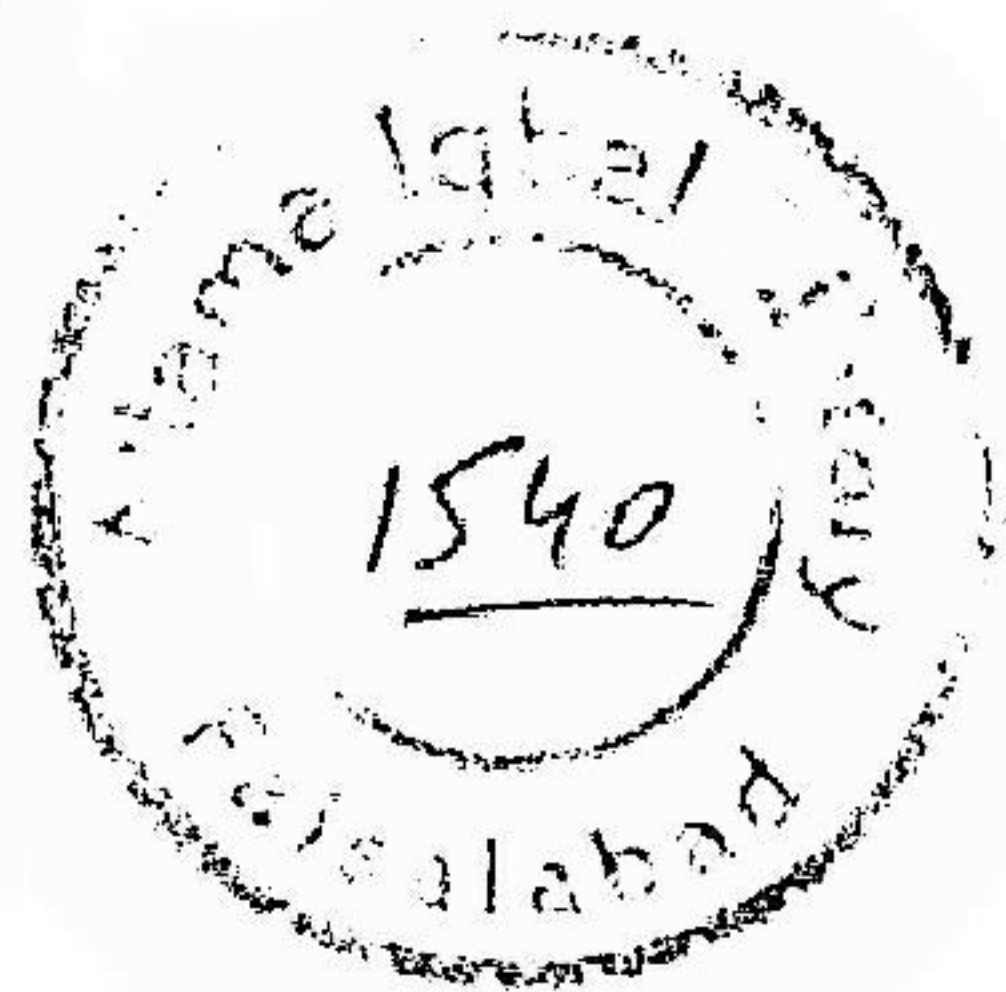
میرے سورج، اگنی
اور
میرے چاند، زونی
اور
ونود
کے لیے!!

فہرست

شاہ رخ خان

روشن اور چمکتے دمکتے جدید اور نئے ہندوستان کا روشن اور تابناک چہرہ

"آج کے دور جدید کا دیوتا...... ہندوستان کی سڑکوں اور گلیوں میں اس کی بڑی بڑی تصاویر، مذہبی دیوی دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ فروخت ہوتی ہیں۔ مزار، معبد اور خانقاہیں اس کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں۔ مشہور عالم ہندی فلمی صنعت کے ہندوستانی اور مختلف غیر ہندوستانی شائقین اور پرستاروں کے لیے شاہ رخ کی شخصیت ٹام کروز اور بریڈ پٹ سے بھی کہیں بڑی ہے۔ ہندوستانی فلمی صنعت میں محض پندرہ سالوں میں پچاس سے زائد فلموں کے ساتھ وہ ایسا دیو قامت مجسمہ نظر آتا ہے جو بے مثال ہے۔ پان کی پیک اور داغ دھبوں سے لتھڑے ہوئے ممبئی کے فلم اسٹوڈیو میں شاہ رخ کی داستان یہ ہے کہ دلی سے تعلق رکھنے والے ایک متوسط مسلمان گھرانے کا نوجوان کیسے دنیا کی ایک سب سے بڑی فلمی صنعت کا عظیم اداکار بن گیا۔ اس وقت شاہ رخ خان اداکاری کے لحاظ سے بالی وڈ کا عظیم بے تاج بادشاہ ہے جس کا کوئی ہمسر نہیں اور نہ ہی مستقبل میں ایسا کوئی امکان ہے۔ جب وہ سگریٹ کا آخری ٹکڑا ہوا میں اچھال کر نیچے پھینک دیتا ہے تو لوگ اس ٹکڑے کو یادگار کی حیثیت سے محبت وعقیدت کے عالم میں محفوظ کر لیتے ہیں۔"

تعارف اور اظہارِ تشکر

اس کتاب کی تصنیف کا بنیادی تصور اور خیال موسم گرما 2003ء میں اس وقت میرے ذہن میں پیدا ہوا جب میں نے پہلی بار شاہ رخ خان سے اس کتاب کی تصنیف کے بارے میں گفتگو کی۔ اس نے قدرے ہچکچاہٹ کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ اتنے بڑے اعزاز کا مستحق نہیں ہے کہ اس کے متعلق کتاب لکھی جائے۔ بہرحال میں نے اپنی کوشش جاری رکھی اور بعد ازاں اسے قائل کر ہی لیا۔

شاہ رخ خان 1.5 بلین ڈالر کی مالیت پر مشتمل ہندوستانی فلمی صنعت کا ایک عظیم اور ذہین اداکار ہے۔ شاہ رخ خان چمکتے دمکتے نئے ہندوستان اور چکا چوند کرتی جدید ہندوستانی فلمی صنعت کا روشن اور تابناک چہرہ ہے۔ وہ ایک ایسی بین الاقوامی شخصیت ہے جس نے دنیا بھر میں سنسنی اور ہیجان برپا کر رکھا ہے۔ اس عظیم شخصیت اور ذہین اداکار کی کامیابی کی داستان ایک زندہ تصویر کے طور پر اس کتاب کی صورت میں منظر عام پر آ رہی ہے۔

سب سے پہلے تو میں شاہ رخ خان کی محبت اور تعاون کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں اور پھر اگلے چار سال تک اس کی مصروفیات میں جس طرح مداخلت کرتی رہی لیکن اس نے نہایت صبر کا مظاہرہ کیا، اس زحمت کے لیے میں خاص طور پر شاہ رخ خان کی بے حد ممنون ہوں اور اس سے بھی بڑھ کر اس نے اپنے قیمتی وقت سے سرفراز کر کے انتہائی فیاضی کا اظہار کیا۔

اس کتاب کی تصنیف کے منصوبے کو حتمی شکل دینے کے ضمن میں بے شمار دیگر افراد کا تعاون بھی مجھے حاصل رہا۔ جن کا میں اپنے اس "اظہار تشکر" کے ذریعے شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔

مزید برآں میں خاص طور پر نسرین منی کبیر کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں اور تحقیق کے سلسلے میں مدد اور تعاون فراہم کرنے پر میں لیو میرانی کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ علاوہ ازیں میں اپنے مدیران "وارنر بکس" دیوی پلائے اور نتالی کانرے کی بھی انتہائی ممنون ہوں۔

ذاتی طور پر میں اپنے خاوند ودھوونود چوپڑا کی قدردانی کو بھی سراہنا چاہوں گی جنھوں نے اس کتاب کی تصنیف کے دوران گھر کی بے ترتیبی اور کی بورڈ کی آوازوں کے شور کو نہایت تحمل کے ساتھ برداشت کیا۔

اور پھر آخر میں میں اپنے والدین نوین اور کامنا چندرا، اپنی بہن تانوجا اور اپنے بھائی وکرم چندرا کا خاص شکریہ ادا کرتی ہوں جو ہر قدم پر مجھے تعاون اور راہ نمائی فراہم کرتے رہے۔

انوپاما چوپڑا

ترتیب کے لحاظ سے اس کتاب میں مذکور کرداروں کے نام اور تعارف

امیتابھ بچن: ہندوستان کی فلمی صنعت میں سب سے زیادہ عرصے تک اداکاری کے جوہر دکھانے والا عظیم اداکار۔ 1970ء اور 1980ء کی دہائیوں میں فلمی صنعت اس کے سہارے کی محتاج رہی۔ اب ساٹھ سال سے زائد عمر میں بھی وہ ہندوستانی فلموں کی کامیابی کا ضامن سمجھا جاتا ہے۔

نسرین منی کبیر: لندن میں مقیم دستاویزی فلمیں بنانے والی یہ شخصیت 1986ء سے اب تک ہندی سینما کے موضوع پر اسی سے زائد دستاویزی فلمیں بنانے کے علاوہ کئی کتابیں بھی لکھ چکی ہے۔

دھنڈی راج پھالکے: ہندوستان میں فیچر فلم بنانے والی پہلی شخصیت۔

مہیش بھٹ: ممتاز ہندوستانی فلم ساز جس کی فلموں کی کہانیاں اصلی اور سبق آموز ہوتی ہیں اور ان کہانیوں کی بنیاد اس کی اپنی اذیتناک اور تکلیف دہ زندگی ہوتی ہے۔

جواہر لال نہرو: پہلے ہندوستانی وزیر اعظم۔

پرتھوی راج کپور: پشاور سے تعلق رکھنے والا ایک خوبصورت اور دلکش نوجوان جو 1930ء اور 1940ء کی دہائیوں میں صف اول کا اداکار رہا۔ اس کے عہد میں بہت سے اداکاروں اور فلم سازوں نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز کیا۔

دلیپ کمار: 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں ایک کہنہ مشق اور ماہر اداکار جو المیہ اداکاری کے بادشاہ کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی موثر اور بہترین اداکاری نے امیتابھ سمیت اداکاروں کی کئی نسلوں پر اپنے اثرات مرتب کیے۔

میر تاج محمد: شاہ رخ کے والد۔

غلام محمد گاما: شاہ رخ کے چچا۔

خان عبدالغفار خان: انہیں ''سرحدی گاندھی'' بھی کہا جاتا تھا۔ انہوں نے عدم تشدد پر مبنی تحریک کا آغاز کیا تھا اور یہ مہاتما گاندھی کے قریبی رفیق تھے۔ شاہ رخ کے والد اور چچا ان کے پیروکار تھے۔

کنہیا لال پوسوال: شاہ رخ کے والد کے قریبی دوست۔

دیو آنند: اداکار اور فلم ساز جس نے 1950ء سے 1970ء تک کی دہائیوں میں اپنا منفرد انداز اداکاری قائم رکھا۔

بمل رائے: ہندوستانی فلمی صنعت کا ایک عظیم ہدایت کار جس نے 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں بے شمار کامیاب فلمیں تخلیق کیں۔

گرودت: ہندوستانی فلمی صنعت کا ایک بہترین فلم ساز جس نے نہایت ہی شاندار اور کامیاب شاعرانہ، رومان پرور ڈرامے تیار کیے اور مادی دنیا کی حسرت میں مبتلا رہا۔ 1964ء میں انتالیس سال کی عمر میں اس نے خودکشی کر لی۔

محبوب خان: انہیں ہندوستان کا "Cecil B. DeMille" کہا جاتا تھا۔ انہوں نے 1957ء میں "Mother India" نامی فلم بنائی۔ اس فلم میں ایک کسان عورت کا متاثر کن کردار دکھایا گیا جس نے تن تنہا اپنے دو بیٹوں کی پرورش کی۔ یہ پہلی ہندی فلم تھا جو آسکر ایوارڈ کے لیے نامزد ہوئی۔

راج کپور: پرتھوی راج کا بڑا بیٹا اور عہد ساز اداکار و فلم ساز۔

کے۔ آصف: شاندار رومانی فلم (مغل اعظم) کے ہدایت کار جو ہندوستانی فلمی صنعت کی بہترین اور متاثر کن فلم تھی۔

سریندر کپور: کے۔ آصف کا ایک نائب جو ممبئی میں شاہ رخ کے والد کا دوست بن گیا تھا۔ بعد ازاں اس نے بذات خود فلمیں تخلیق کیں۔

فاطمہ: شاہ رخ کی والدہ۔

شہناز لالہ رخ: شاہ رخ کی بہن۔

ممتاز: 1960ء کی دہائی کی ایک ممتاز اداکارہ۔

راجیش کھنہ: اسے ہندوستانی فلمی صنعت کا پہلا ''عظیم اداکار'' کہا جاتا تھا۔ 1960ء کی دہائی کے علاوہ 1970ء کی دہائی کے اوائل میں کھنہ نے تمام قوم کو ہیجان اور سنسنی میں مبتلا رکھا۔

جاوید اختر: ایک مشہور اور ممتاز مصنف اور شاعر جس نے اپنے شریک کار کے ساتھ مل کر 1970ء کی دہائی میں امیتابھ بچن کو ''ناراض شخص'' کے طور پر پیش کیا۔

امریتا سنگھ: دلی میں شاہ رخ کی دوست جو بعد ازاں ممبئی منتقل ہو گئی اور 1990ء کی دہائی میں صف اول کی اداکارہ بن گئی تھی۔

گھبر سنگھ: فلم ''شعلے'' میں قاتل غنڈہ اور بدمعاش۔ یہ فلم ہندوستانی فلمی صنعت میں تمام ادوار کے لحاظ سے بہترین فلم تصور کی جاتی ہے۔

دھرمیندر: ہندوستانی پنجاب سے تعلق رکھنے والا ایک بہت ہی دلکش اور خوبصورت نوجوان دیہاتی جس نے 1960ء کی دہائی میں خود کو ''ہیرو'' کی حیثیت سے منوایا۔ اس کے دو بیٹے مشہور اداکار ہیں۔

برادر ایرک ڈی سوزا: شاہ رخ کے سکول کا ایک پادری اور استاد جس کا اس کی زندگی میں معنی خیز اثر تھا۔

ویوک خوش الانی: شاہ رخ کا قریبی دوست اور سی گینگ کا بانی رکن۔

رامن شرما: شاہ رخ کا قریبی دوست اور سی گینگ کا بانی رکن۔

مانی کاؤل: ایک مشہور ''آرٹ ہاؤس ہدایتکار'' جوان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے سب سے پہلے شاہ رخ کو فلم کے لیے اداکار کی حیثیت سے منتخب کیا۔

بیری جان: دلی کے ''تھیٹر ایکشن گروپ'' کا بانی ہدایتکار جو فن اداکاری میں شاہ رخ خان کا پہلا اور واحد اتالیق تھا۔

بینی تھامس: شاہ رخ کا دوست اور ''تھیٹر ایکشن گروپ'' کا اداکار۔

رتوراج: ''تھیٹر ایکشن گروپ'' کا پسندیدہ اداکار جو بعد ازاں ٹیلیویژن کا مشہور اداکار بن گیا تھا۔

سنجائے رائے: دلی میں شاہ رخ کے تھیٹر کے زمانے کا ایک دوست۔ یہ شخص ''تھیٹر ایکشن گروپ'' کا انتظامی افسر تھا۔

پردیپ کرشن: ایک فلم ساز مصنف جس نے اپنی پہلی فلم "In Which Annie Gives It Those Ones"

میں اداکاری کے لیے منتخب کیا۔

اروندھتی رائے: مشہور مصنف اور کارکن جس نے فلم "Annie" کی کہانی لکھی اور اس میں اداکاری بھی کی۔ 1997ء میں اس نے اپنے پہلے ناول "The God of Small Things" پر "Man Booker Prize" حاصل کیا۔

ستیاجیت رائے: عظیم ترین فلم ساز جس نے اپنی پہلی فلم پتھر پنچالی (سڑک کا گیت 1955ء) کے ذریعے ہندوستانی فلمی صنعت کی بنیاد رکھی۔

مری نال سین: انڈین آرٹ ہاؤس موومنٹ کی صف اول کی شخصیت۔ اس نے مشہور اور مرکزی اداکاروں کے بغیر اپنی پہلی ہندی فلم "Bhuvan Shome" (مسٹر شوم) 1969ء میں تخلیق کی۔

شیام بنگال: صف اول کا ہندوستانی فلم ساز۔

گووند نہلانی: فلمی صنعت کا ایک فوٹوگرافر جس کا تعلق بنگال سے تھا جو بعدازاں ایک مشہور فلمی ہدایتکار بھی بن گیا۔

گاوری شیبا: شاہ رخ کی دوست اور بعدازاں بیوی۔

رمیش شیبا: گاوری کا والد۔

تجندر تیواری: گاوری کا چچا۔

رمیش سپی: ''شعلے'' کا ہدایتکار۔

کرنل راج کپور: ایک فوجی جس نے فلمی اور ٹیلی ویژن کی دنیا میں قدم رکھا۔ اس نے مشہور ٹی وی شو ''فوجی'' کی ہدایتکاری کی جس میں شاہ رخ نے ایک فوجی کا کردار ادا کیا۔

لیکھ ٹنڈن: ایک کامیاب فلم اور ٹی وی ہدایتکار جو ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے ٹی وی کے سلسلہ وار ڈراموں میں شاہ رخ کو پہلی بار اداکاری کے لیے منتخب کیا۔

سویتا شیبا: گاوری کی والدہ۔

نیرو تیواری: گاوری کی چچی۔

وکرانت شیبا: گاوری کا بھائی۔

کندن شاہ: اپنے شاہکار ''جانے بھی دو یارو'' (Janne Bhi Do Yaaro) کے لیے بہت مشہور ہے۔ شاہ نے ٹی وی کے سلسلے وار ڈراموں اور فلم کے لیے شاہ رخ کو ہدایات دیں۔

سعید مرزا: آرٹ ہاؤس فلمی ہدایتکار۔

عزیز مرزا: سعید مرزا کا بھائی جو ممبئی میں شاہ رخ کے سوتیلے باپ کے مانند تھا۔ اس نے شاہ رخ کو ٹی وی کے سلسلے وار کھیلوں اور فلموں کے لیے ہدایات دیں۔

ہارون مرزا: عزیز مرزا کا بیٹا۔ شاہ رخ جب ممبئی منتقل ہوا تو عزیز شاہ رخ کا رازدار اور قریبی دوست تھا۔

اشوتوش گواریکر: ایک ایسا اداکار جس نے شاہ رخ کی ابتدائی فلموں اور ٹیلی ویژن کے سلسلے وار ڈراموں میں اس کے ساتھ اداکاری کی۔ بعدازاں اس نے اپنی توجہ ہدایتکاری کی طرف مبذول کرلی اور آسکر ایوارڈ کے لیے نامزد فلم ''لگان'' تخلیق کی۔

کیتن مہتا: ایک فلمی ہدایتکار جس نے "Madam Bovary" کی طرز پر "Maya Mem Saab" نامی فلم بنائی اور اس میں شاہ رخ خان کو اداکاری کے لیے منتخب کیا۔

عامر خان: ایک مشہور فلمساز کا بیٹا جس نے شاہ رخ خان سے چار سال قبل فلموں میں کام کرنا شروع کیا اور ایک بڑا اداکار بن گیا۔

سلمان خان: ایک کامیاب مگر متنازع اداکار جس نے عامر خان اور شاہ رخ خان سے مل کر کامیابی کی ایک تکون تخلیق کی جس نے ہندوستانی فلمی صنعت پر 1990ء کی دہائی اور 2000ء کی دہائی کے اوائل تک بلاشرکت غیرے حکومت کی۔

انور خان: شاہ رخ کا سیکرٹری اس کی وفات 2000ء میں ہوئی۔

ویوک وشوانی: ایک اداکار و فلم ساز جو شاہ رخ خان کا دوست تھا اور جس نے 1990ء کی ہائی میں شاہ رخ خان کو فلموں میں کام دلوانے کے لیے سخت محنت کی۔

راجیو مہرا: ایک فلمی ہدایتکار جس نے اپنی دو فلمیں شاہ رخ کے ساتھ مل کر تیار کیں۔

راج کنور: وہ ہدایتکار جس نے ہندوستانی فلمی صنعت میں شاہ رخ خان کی پہلی فلم ''دیوانہ'' کے لیے ہدایات دیں۔ یہ فلم بہت کامیاب ثابت ہوئی۔

راکیش روشن: ایک معروف فلم ساز جس نے شاہ رخ کی دو فلموں کی ہدایت کاری کی۔

جوہی چاولہ: ایک ممتاز اداکارہ جس نے کئی فلموں میں شاہ رخ کی ہیروئن کا کردار ادا کیا۔ وہ شاہ رخ خان کی فلم تیار کرنے والی کمپنی میں حصے دار بھی تھی۔

سبھاش گئی: ایک مشہور فلمساز جس نے شاہ رخ خان کی کئی فلمیں تیار کیں۔

نشی پریم: ایک ممتاز فلمی صحافی جس نے پہلی دفعہ شاہ رخ خان کے ممبئی منتقل ہونے پر اس کے متعلق بہت زیادہ لکھا۔

کیتھ ڈی کوسٹا: فلمی صحافی۔

عباس مستان: وہ بھائی جنھوں نے سلسلے وار فلمیں تیار کریں۔

یش چوپڑا: ہندوستانی فلمی صنعت کا سب سے زیادہ کامیاب فلمساز۔

بی آر چوپڑا: یش کا بڑا بھائی اور ایک ممتاز فلمساز۔

ادتیا چوپڑا: یش کا بڑا بیٹا جس کی کوششوں کے باعث فلمیں تیار کرنے والے ان کے ادارے نے بین الاقوامی طور پر اپنے دفاتر قائم کیے۔

کرن جوہر: ہندوستانی فلمی صنعت کی دوسری نسل کا ایک ہدایت کار جس نے شاہ رخ خان کی چند فلموں کی ہدایتکاری کی۔

یش جوہر: کرن جوہر کا والد اور مشہور فلمساز جس نے 2004 میں وفات پائی۔

سورج بھرجاتیہ: ہندوستانی فلمی صنعت کی تیسری نسل کا ایک فلمساز جس نے 1990ء کی دہائی میں ''فیملی سینما'' کا آغاز کیا اور اس کی یہ فلمیں بہت زیادہ کامیاب ہوئیں۔

پراہلاد ککر: اشتہاری فلموں کا ایک ممتاز ہدایتکار جس نے کئی اشتہاری فلموں میں شاہ رخ خان کو اداکاری کے لیے منتخب کیا۔

ایشوریا رائے: ایک سابقہ "Miss World" جو صف اول کی اداکارہ ثابت ہوئی۔

گلشن کمار: ایک ممتاز صنعت کار جسے ہندوستان کا ''آڈیو کنگ'' کہا جاتا تھا۔ وہ ایک سڑک پر بدنام زمانہ ممبئی مافیا کے ہاتھوں بندوق کی گولی کے ذریعے ہلاک ہوگیا۔

ابوسلیم: ایک بدنام دہشت گرد اور جرائم پیشہ تنظیم کا سربراہ جس نے 1990ء کی دہائی کے آخر میں ہندوستانی فلم صنعت کو بھتے وصول کرنے اور قتل و غارت کے ذریعے مسلسل دہشت زدہ کیے رکھا۔

داؤد ابراہیم کاسکر: ممبئی کی سب سے زیادہ طاقتور جرائم پیشہ تنظیم کا سربراہ، جس نے مبینہ طور پر 1993ء میں ممبئی میں خوفناک بم دھماکے کیے۔

راکیش ماریا: ایک ممتاز پولیس افسر جس نے بم دھماکوں کے معاملے کی تفتیش کی۔

موہن بھائیز: شاہ رخ خان کا محافظ۔

چھوٹا شکیل: داؤد ابراہیم کی جرائم پیشہ تنظیم کا اعلیٰ عہدیدار۔

سنتوش سیون: ہندوستانی سینما کا معزز فوٹوگرافر اور ہدایتکار جس نے کئی فلموں میں شاہ رخ کے ساتھ کام کیا۔

ہریتک روشن: راکیش روشن کا بیٹا جس نے اپنی پہلی ہی فلم ''کہو نا پیار ہے'' سے فلمی دنیا میں عروج حاصل کرلیا۔

سنجے لیلا بھنسالی: ہندوستانی فلمی صنعت کا ایک ممتاز ہدایت کار جو فلموں میں دولت اور دولت مند گھرانے اور زیادہ سے زیادہ موسیقی/نغمے پیش کرنے کے لیے مشہور ہے۔

بھرت شاہ: ہندی فلموں کا ممتاز سرمایہ کار اور تقسیم کار۔ اسے "Mr. Money Bags" بھی کہا جاتا تھا۔

ناظم رضوی: ہندوستانی فلمی صنعت کا مختصر المدتی فلمساز جسے جرائم پیشہ تنظیموں کے ساتھ روابط کے الزام میں بھرت شاہ کے ساتھ ہی گرفتار کرلیا گیا۔

❁

پہلا باب

سنہرے خواب

امریکی ریاست جارجیا کا ایک چھوٹا سا اور عام شہر ڈالٹن جو دنیا بھر میں ''قالین کے کاروباری مرکز'' کی حیثیت سے مشہور ہے، جلد ہی حیرت انگیز واقعات اور معجزوں کا مرکز بننے والا تھا۔ بھاویش سیٹھ کو علم ہو چکا تھا کہ برسوں سے اس کی آنکھوں میں بسے سنہری خواب حقیقت کا روپ دھارنے والے تھے۔

نہایت ہی باوقار اور خوبصورت شخصیت کا مالک بھاویش جسے اس کے گھنگریالے بال اور مہذب وشائستہ انداز واطوار مزید چار چاند لگا دیتے ہیں، ڈالٹن (DALTON) میں مقیم ہے۔ یہاں اس کے ہم وطن ہندوستانی بہت ہی تھوڑی تعداد میں موجود ہیں اور اس شہر کی آبادی کا صرف دو فیصد حصہ (27,912) ایشیائی افراد پر مشتمل ہے۔ ان میں سے بہت سے افراد ڈاکٹر ہیں لیکن بھاویش موٹل کے کاروبار سے منسلک ہے۔ اس کے والد، رمیش، ڈالٹن کنونشن سنٹر کے نزدیک واقع بہت ہی شاندار اور کثیر المنزلہ موٹل کے مالک ہیں۔ یہ ان کا خاندانی کاروبار ہے۔ اس کے والد موٹل میں جنرل منیجر اور وہ خود اسسٹنٹ منیجر کے طور پر کام کر رہے ہیں، ان کی بیویاں بھی کاروباری امور میں ان کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔

بھاویش ہندوستان میں کبھی نہیں رہا کیونکہ اس کے والد 1970ء کی دہائی کے اوائل ہی میں یہاں آ گئے تھے اور بھاویش کی پیدائش 1974ء میں کینیڈا میں ہوئی۔ اس کے والد روزگار کی تلاش میں مختلف شہروں میں قسمت آزمائی کرتے رہے۔ بھاویش کی پرورش ڈیٹرائٹ، ہوسٹن اور ٹینیسی میں ہوئی۔ جب کبھی جیب اور حالات اجازت دیتے وہ اپنے والدین کے ساتھ ہندوستان چلا جاتا۔ اپنے والدین کی خواہش کے مطابق 1997ء میں ''ارینج میرج'' کے طور پر اس کی شادی ''تجل'' سے ہوگئی۔ اس لڑکی کی پیدائش اور پرورش گجرات میں ہوئی تھی۔

دنیا بھر میں موجود لاکھوں ہندوستانیوں کے مانند بھاویش کا بھی ہندوستان سے رابطہ

ہندی فلموں کے ذریعے ہوا۔ اس کے والدین نہایت باقاعدگی سے یہ فلمیں دیکھتے تھے لیکن سینما گھر کے بجائے عام طور پر وہ یہ فلمیں ''وِیڈیو'' کے ذریعے دیکھتے تھے۔ اگرچہ یہ فلمیں دھندلی اور مسروقہ ہوتی تھیں لیکن ان فلموں کی سحر انگیزی کی قوت کے باعث ان کا ناطہ ان فلموں سے نہیں ٹوٹا تھا۔ جب ہر دفعہ فلم کے اختتام پر امیتابھ بچن نہایت ماہرانہ اور فنکارانہ انداز میں مر جاتا تو نو (9) سالہ بھاویش زاروقطار رونے لگتا۔ اس کے والد اسے یقین دلاتے کہ ہندوستانی فلمی صنعت کے اکثر مشہور اور عظیم اداکار ''مرنے'' کی صرف ''اداکاری'' کرتے ہیں۔ حقیقت میں مرتے نہیں ہیں۔ بھاویش جوں جوں بڑا ہوتا گیا ہندی فلمیں دیکھنے کے اس کے شوق میں بھی اسی قدر اضافہ ہوتا گیا۔ تجل بھی ہندی فلموں کی بہت شوقین اور پرستار تھی۔ 2002ء میں ان کے ہاں پیدا ہونے والا ان کا بیٹا کشن بولنے سے پہلے ہی ''ناچ گانے'' کی طرف راغب ہو چکا تھا۔ اس لیے جب ممبئی کے چند صف اول کے اداکاروں پر مشتمل موسیقی اور نغموں کا پروگرام "Temptation 2004" اٹلانٹا کے ''گوِنٹ سنٹر'' پہنچا تو پھر اس میں شرکت کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ بھاویش نے شادی کی سالگرہ پر وصول ہونے والے تحفوں کو نقدی میں تبدیل کروایا اور ایک سو پچاس ڈالر مالیت کی ایک ایک ٹکٹ اپنے خاندان کے ہر فرد کے لیے خرید لی مگر بہترین نشستوں کے لیے مخصوص 200 ڈالر فی کس کی ٹکٹیں پہلے ہی فروخت ہو چکی تھیں۔

موسیقی اور نغموں کا یہ پروگرام روایتی طور پر مقبول نغموں پر لب کشائی، رقص، مزاح اور ظرافت کے علاوہ شائقین اور پرستاروں کی حوصلہ افزائی پر مبنی کارکردگی کا ایک حسین امتزاج تھا۔ اس پروگرام میں چھ بہترین اداکار شامل تھے جنہوں نے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا لیکن سب سے شاندار اور بہترین لمحہ وہ تھا جب شاہ رخ خان جیسے عظیم ترین اداکار نے اس پروگرام کو چار چاند لگا دیے۔ یورپ، انگلستان، امریکہ اور کینیڈا کے سولہ شہروں میں دو ماہ تک یہ پروگرام جاری رہا اور ہر شہر میں نشستوں کی تعداد سات ہزار سے بیس ہزار تک تھی اور ان میں سے کوئی بھی نشست خالی نہ رہی تھی۔ سب سے مہنگی ٹکٹوں کی قیمتیں تین سو سے چار سو ڈالر کے درمیان تھیں لیکن اس کے باوجود یہ ٹکٹیں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئیں۔ کینیڈا کے شہر ٹورنٹو کے عظیم الشان ''ایئر کینیڈا سنٹر'' میں 19800 نشستوں کی گنجائش تھی لیکن پھر بہت سے شائقین واپس لوٹ گئے اور ان کے لیے تین دن بعد دوبارہ پروگرام منعقد کیا گیا۔ لندن میں یکے بعد

دیگر دو پروگرام کیے گئے۔ انٹورپ میں سامعین گاہ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ یہ وہ ہندوستانی تھے جو اپنے سابقہ نو آبادیاتی علاقے سوری نیم سے ہالینڈ منتقل ہوئے تھے۔ سوری نیم میں یہ ہندوستانی پناہ گزین 1872ء اور 1916ء کے درمیان ایک معاہدے کے تحت افرادی قوت کے طور پر آئے تھے۔ حالانکہ ہندوستان سے بیشمار لوگ غیر ممالک ہجرت کر چکے ہیں لیکن ہندوستانی فلمی صنعت کے لیے ان کی محبت کم نہیں ہوئی۔

یہ وہ وقت تھا جب فلم ساز نسرین منی کبیر نے اپنی دستاویزی فلم "The Outer World of Shah Rukh Khan" تیار کی جس نے دنیا بھر میں ہیجان اور سنسنی پھیلا دی۔ خالص امریکی لہجے میں گفتگو کرتے ہوئے شائقین اپنے پسندیدہ بہترین اداکار کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ہوٹل کی بالکونیوں میں رات دو بجے تک کھڑے رہے۔ انہیں اپنی نیند قربان کرنے پر کوئی پچھتاوا نہ تھا۔ مختلف پروگراموں کے دوران روتی ہوئی لڑکیاں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں: ''شاہ رخ خان! ہمیں تم سے پیار ہے!'' مقامی منتظمین نے اعتراف کیا کہ انہیں چور دروازے سے دو ہزار فی کس ٹکٹیں خریدنے کی پیشکش ہوئی لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ پروگرام کے بعد اگلے ماہ ٹائم رسالے نے اپنی ایشیائی اشاعت میں خصوصی اشاعت کے طور پر "Asia's Heros" کے عنوان کے تحت شاہ رخ کی تصویر سرورق پر شائع کی۔ اس رسالے کی اطلاع کے مطابق شاہ رخ کے ذاتی محافظ کو جو ایک ہٹا کٹا اور گنجا شخص تھا اور جس کی دو نوعمر بیٹیاں بھی تھیں، شاہ رخ خان سے ایک لمحہ ملاقات کروانے کے عوض لڑکیوں کی طرف سے جنسی تعلق قائم کرنے کی بیشمار پیشکشیں وصول ہوئیں کیونکہ یہ شخص ان کی شاہ رخ خان سے ملاقات میں ''حائل'' ہو رہا تھا۔

3 ستمبر کو ''گونٹ سنٹر'' میں تیرہ ہزار افراد پر مشتمل سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ بھاولیش، تجیل، کشن اور بھاولیش کا بھائی روپیش، ڈالٹن سے اپنی کار کے ذریعے روانہ ہو چکے تھے۔ بھاولیش کے ہاتھ میں انٹرنیٹ کے ذریعے حاصل ہونے والا مواد تحریری اور تصویری شکل میں موجود تھا، نقشے اس کی جیب میں تھے۔ جب تجیل نے اس سے پوچھا کہ وہ یہ کاغذ اپنے ہاتھوں میں کیوں تھامے ہوئے ہے تو بھاولیش نے جواب دیا: ''تمہیں معلوم ہی نہیں ممکن ہے کہ میں سیدھا سٹیج پر چلا جاؤں اور شاہ رخ خان سے ملاقات کر لوں۔ پھر میں کشن کے لیے اس کے دستخط حاصل کروں گا۔'' اس پروگرام سے ایک ہفتہ قبل بھاولیش نے تجیل کو بتایا کہ اس کا یہ

خواب ہے کہ وہ سٹیج پر شاہ رخ کے ساتھ محو رقص ہے۔ تجیل نے قہقہہ لگایا تھا اور کہا تھا کہ ایسا تو کسی صورت میں بھی ممکن نہیں۔

یہ لوگ سٹیج سے بارہ قطاریں پیچھے بیٹھے تھے۔ اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے ضمن میں مددگار کے طور پر شاہ رخ نے دو ناظرین منتخب کیے۔ پہلی تو ایک لڑکی تھی جس نے قرعہ اندازی کے ذریعے انعامی مقابلہ جیتا تھا۔ اب شاہ رخ نے اعلان کیا کہ اسے ایک ایسے شخص کی تلاش ہے جو رقص کر سکے۔ بھاولیش کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے تجیل سے کہا کہ اس کے ذہن میں ایک ایسا عجیب و غریب خیال آیا ہے جو اسے خوفزدہ کر سکتا ہے۔ تجیل جو اس وقت روشنیوں کی چکا چوند کے سحر میں کھوئی ہوئی تھی کہنے لگی کہ اسے کوئی اعتراض نہیں۔ لہٰذا بھاولیش جس کا وزن دو سو پونڈ اور قد پانچ فٹ نو انچ تھا، اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور شمالی ہندوستان کا روایتی ناچ ''بھنگڑا'' شروع کر دیا۔ شاہ رخ نے اس کی طرف اشارہ کیا اور کہا ''تم یہاں سٹیج پر آ جاؤ!''

اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ شاہ رخ خان نے اسے اپنے ساتھ رقص کرنے کے لیے سٹیج پر بلایا ہے۔ بھاولیش ابھی تک اپنی کرسی کے نزدیک حیران و پریشان کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا: ''کیا شاہ رخ اسے بلا رہا ہے یا یہ کسی اور شخص کی آواز ہے؟'' اسی اثنا میں اسے تجیل کی چلا کر بولنے کی آواز سنائی دی: ''فوراً چلے جاؤ یہ نہ ہو کہ وہ کسی اور شخص کو بلا لیں!'' یہ سنتے ہی بھاولیش نے دوڑ لگائی۔ اس کی ٹانگیں تو اپنی رفتار سے حرکت کر رہی تھیں لیکن اس کا دل اس کے قابو میں نہیں تھا، وہ اس وقت شدید حیرت و استعجاب کی کیفیت میں تھا پھر اپنے دل کو تھامتے ہوئے وہ بھاگ کر سٹیج پر چڑھ گیا، اس کا سانس پھول رہا تھا لیکن شدید جذباتی کیفیت اسے اپنے آپ پر قابو پانے میں مدد دے رہی تھی۔ تجیل کا خیال تھا کہ شاید وہ سٹیج پر جا کر چیخنے لگے۔

جب شاہ رخ خان نے آلہ صوت (مائیک) اس کے حوالے کیا تو شدت جذبات سے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے بہرحال بھاولیش نے جلد ہی اپنی اس کیفیت پر قابو پا لیا اور کہنے لگا ''میں نے ایک ہفتہ قبل یہ خواب دیکھا تھا کہ میں اٹلانٹا میں شاہ رخ کے ساتھ رقص کر رہا ہوں۔ مجھے خدا کی قسم ہے میری بیوی مجھ پر یقین نہ کرتی اس نے کہا بھاولیش تم پاگل ہو۔ میں نے کہا تم پر خدا کی لعنت ہو، ہونی کو کوئی نہیں روک سکتا۔'' شاہ رخ یہ سب کچھ ایک بہت ہی پسندیدہ دیوتا کے مانند سن رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک دیو مالائی اور شفیق مسکراہٹ چھائی ہوئی تھی۔ پھر اس نے جواب دیا: ''میں تمہارے اس جذبے سے بہت متاثر ہوا ہوں لیکن ایک

انسان کی حیثیت سے تمہاری خواہش اور خواب یہ ہونا چاہیے کہ تم ایک برہنہ خاتون کے ساتھ ہم بستری کرو۔" بھاویش بڑبڑانے لگا: "میں یہ بھی کروں گا، اس میں میرے لیے توہین کا کوئی پہلو نہیں ہے۔" اور پھر ہندوستانی مخصوص روایت کے مطابق اپنی طرف سے تعظیم و تکریم کا اظہار کرنے کے لیے جو صرف اپنے گھرانے کے بڑے افراد اور اولیائے اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے، بھاویش رکوع میں گیا اور اس نے شاہ رخ خان کے پاؤں نہایت عقیدت و احترام سے چھو لیے۔

بھاویش تقریباً نصف گھنٹے تک شاہ رخ کے ساتھ سٹیج پر موجود رہا۔ انہوں نے اکٹھے فلم "دیوداس" کے ایک مشہور رقص کا مظاہرہ کیا۔ پھر شاہ رخ نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ کسی اور شخص کو خاص طور پر یہاں بلانا چاہتا ہے۔ تجل کی سالگرہ نزدیک آ رہی تھی اس لیے بھاویش نے شاہ رخ خان سے درخواست کی کہ وہ اس سالگرہ کے موقع پر ان کے لیے نیک اور خوشگوار تمناؤں کا اظہار کرے۔ بھاویش نے شاہ رخ خان کو کشن کے نقشوں کی کتاب پر دستخط کرنے کے لیے درخواست کی جو ان کے ساتھ ہی محوِ خواب تھا۔ بالآخر ایک شاندار طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاہ رخ خان نے انہیں جان واکر بلیک لیبل وسکی کی ایک دستخط شدہ بوتل اور دنیا کے کسی بھی حصے میں سیر و تفریح کے لیے جانے کے لیے ٹکٹ تحفے میں عطا کیا۔

گونٹ سنٹر کے یہ لمحات بھاویش کے لیے ناقابل فراموش اور عظیم لمحات تھے۔ وہ ایک ایسے شخص کی حیثیت سے مشہور ہو گیا جسے شاہ رخ خان کے ساتھ رقص کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ بھاویش نے محسوس کیا کہ اسے ایک نہایت ہی اعلیٰ و ارفع انعام و تحفہ حاصل ہوا ہے۔ اس نے اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا: "میری شادی اور میرے بیٹے کی پیدائش کے بعد یہ میری زندگی کا نہایت ہی تابناک اور ناقابل فراموش واقعہ ہے۔"

ہندوستانی اپنی فلموں کو جنون اور پاگل پن کی حد تک پسند کرتے ہیں۔ دنیا بھر کے لحاظ سے ہندوستان میں سب سے زیادہ فلمیں تیار ہوتی ہیں جن میں مختلف قسم کی آٹھ سو فلمیں شامل ہیں جو ایک سال کے اندر تکمیل کے مراحل طے کر لیتی ہیں۔ ان میں سے تقریباً دو سو فلمیں ممبئی (سابقہ بمبئی) میں تیار ہوتی ہیں۔ ان فلموں میں کم اخراجات سے محض بیس دنوں میں تیار شدہ فلموں سے لے کر کروڑوں مالیت کی فلمیں شامل ہیں جن میں بڑے بڑے اداکار اور اداکارائیں کام کرتی ہیں۔

ایک ایسا ملک جو غربت، بے تحاشا آبادی اور بے رحم تپش اور حرارت کا شکار ہے، وہاں ہر روز، پندرہ ملین افراد، بارہ ہزار پانچ سینما گھروں میں ہجوم کی شکل میں داخل ہوتے ہیں۔ ٹکٹوں کی بے تحاشا طلب کے باعث ٹکٹیں کم پڑ جاتی ہیں اور غیر قانونی طور پر ٹکٹیں فروخت کرنے والے افراد بے تحاشا تعداد میں منظر عام پر آ جاتے ہیں اور چاندی بناتے ہیں۔ وہ سینماؤں کے داخلی دروازوں پر منڈلاتے پھرتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ مطلوب ٹکٹوں کی زیادہ قیمتیں سرگوشیوں میں شائقین کو بتاتے ہیں۔ جہاں فلمیں دکھائی جاتی ہیں اور ڈرامے دکھائے جاتے ہیں، ان میں بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے ڈرامائی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ممبئی اور دہلی ایسے علاقے ہیں جہاں متمول اور دولت مند افراد کو وردی پوش ان کی مخملیں نشستوں تک راہ نمائی کرتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ گاؤں بھی ہیں جہاں تماشائی زمین پر بیٹھتے ہیں اور فلم کو حرکت دینے والے پروجیکٹر کو ہاتھ سے چلایا جاتا ہے لیکن ان ہر دو مختلف مقامات پر فلم کی نوعیت ایک جیسی ہوتی ہے یعنی زیادہ سے زیادہ گانے اور رقص جس میں رومانی مناظر، طربیہ، مزاحیہ، المیہ کے علاوہ مار دھاڑ سے بھرپور مناظر نہایت مہارت سے شامل کیے جاتے ہیں، بعض اوقات یہ ملغوبہ چوں چوں کا مربا بھی بن جاتا ہے لیکن بہرحال ایک شاندار اور بہترین فلم تیار ہو جاتی ہے۔

پردۂ سیمیں پر حرکت کرنے والے مناظر میں ناظرین جذباتی طور پر بہت زیادہ ملوث ہو جاتے ہیں، اچھے مناظر اور اچھی اداکاری کو داد دینے کے لیے عوام شور مچاتے ہیں اور بعض اوقات ناظرین، بری اداکاری اور برے مناظر کے باعث جارحانہ رویے اور طرزِ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ناظرین اس وقت بھی بلند آواز میں داد و تحسین کا اظہار کرتے ہیں جب ایک نیا اداکار پہلی بار اداکاری کے جوہر دکھاتا ہے اور خاص طور پر تماشائی اس وقت بہت جوش و خروش اور خوشی کا اظہار کرتے ہیں جب یہ اداکار پہلا مکالمہ ادا کرتا ہے۔ بعض اوقات ناظرین، کرداروں کے ہونٹوں سے ابھرنے والے نغمے کے ساتھ خود بھی گاتے ہیں، پردۂ سیمیں کی طرف سکے پھینکتے ہیں اور اس کے ساتھ رقص کرتے ہیں۔ ہندوستان میں کامیاب فلم۔۔ کہلاتی ہے جسے پرستار اور شائقین بار بار دیکھتے ہیں۔ کچھ عظیم ترین کامیاب فلمیں مسلسل پانچ سال بلکہ دس سال تک متواتر چلتی رہتی ہیں۔ ہندوستانی تماشائی مغربی طرز کے حقیقی مناظر دیکھنا پسند نہیں کرتے بلکہ وہ زندگی کی حقیقتوں سے ماورا، شاندار اور بہترین مناظر دیکھنا پسند

کرتے ہیں۔

جمالیاتی حس رکھنے والے افراد نے فلموں میں جذباتی مناظر کی ہمیشہ حمایت کی۔ ہندی فلموں میں گھریلو مناظر، مقامات، انداز اور لہجہ بلاتکلف استعمال ہوتا ہے۔ ہندوستانی فلموں میں ہر چیز، ہر منظر ممکن ہے۔ قتل وغارت کے پراسرار مناظر جن کے دیکھنے سے شائقین کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں، اس وقت منتشر ہو سکتے ہیں جب ہیرو اور ہیروئن، سوئزرلینڈ کی پہاڑیوں پر نغمہ گانے کے خواب دیکھتے نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات مرکزی کہانی میں معینہ وقفوں پر مشتمل مزاحیہ مناظر کا ایک سلسلہ، دلچ پیدا کرنے کا سبب ثابت ہوتا ہے۔ فلم کا ہیرو کسی خاص کوشش کے بغیر دسیوں افراد کو زخمی بلکہ ان کے ساتھ لڑ بھی سکتا ہے اور پھر بھی فاتح بن کر ابھرتا ہے۔ ہیروئن نئے انداز کے "مختصر فراک" پہنتی ہے اور بے شمار مواقع پر سحر انگیز رقص کا مظاہرہ کرتی ہے لیکن اپنے مرکزی کردار کے اختتام پر کنواری رہتی ہے۔ کرداروں اور گھروں کو غیر معمولی حد تک بھڑکیلے اور چکاچوند سے مزین دکھایا جاتا ہے حتیٰ کہ "غریب اور مفلس" کرداروں کو بھی شوخ اور بھڑکیلے وضع قطع میں دکھایا جاتا ہے۔ ہندوستانی فلم کی تیاری کے لیے صرف دو اصول لازمی ہیں: "رومانی مناظر اور نغمے۔"

نغمے اور گانے ایک ہندی فلم کا مرکزی اور مقبول حصہ ہے اور موسیقی ہندی فلم کے ایک روایتی حصے کے طور پر ہمیشہ سے ہی موجود رہی ہے۔ عظیم ہندوستانی رزمیہ داستانیں، مہابھارت اور رامائن اشعار میں لکھی گئی ہیں۔ تین ہزار سالہ قدیم سنسکرت زبان کے ڈرامے "Mirch Kattika" میں جگہ جگہ نغمے شامل کیے گئے۔ ہندوستانی فلم کا آغاز تھیٹر (تماشا گاہ میں زندہ اداکاری) سے ہوا۔ ان تھیٹروں کی روایات بہت شاندار تھیں۔ اردو، پارسی تھیٹر کے علاوہ روایتی دیہاتی تھیٹر مثلاً گلی کوچوں کے تھیٹر میں نغمے، کھیل کے لازمی حصے کے طور پر موجود ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہندوستانی فلموں میں موسیقی کی موجودگی منطقی ترقی کا شاخسانہ ہے۔

1930ء اور 1940ء کی دہائیوں میں فلموں میں زیادہ سے زیادہ چالیس نغموں کی موجودگی خلاف معمول نہیں تھی۔ "اندر سبھا" یا "اندرا دیوتا کی عدالت" جسے 1932ء میں تیار کیا گیا میں اکہتر نغمے شامل تھے لیکن 1950ء کی دہائی تک نغموں کی تعداد "ایک فلم میں دس تک" کم ہو چکی تھی پھر اکثر فلموں میں اوسطاً چھ نغمے شامل کیے جانے لگے۔

یہ نغمے دنیا بھر میں موجود ایشیائی افراد کے دلوں میں گھر کر گئے۔ یہ نغمے اور گانے، شادی

بیاہ، مختلف تقریبات، شبینہ مجالس اور مذہبی رسومات کے مواقع پر گائے جاتے ہیں۔ وقت گزارنے کے لیے ایک مشہور ہندوستانی طریقہ "انتا کشری کا کھیل" ہے جس میں ہندی فلموں کے نغمے گائے جاتے ہیں۔ 1970ء کی دہائی تک فلمی موسیقی میں "پاپ میوزک" کی روایت قائم رہی۔ ہندوستان میں فلمی ستارے "راک ستارے" بھی ہیں۔

ہندوستانی فلموں کی کہانیوں کے مرکزی خیال بہت محنت سے تیار کیے جاتے ہیں لیکن سادہ ہوتے ہیں۔ ہندی فلمیں زیادہ تر بنیادی طور پر اخلاقی سبق پر مشتمل ہوتی ہیں جن کے کردار قابل تقلید ہوتے ہیں۔ ابتدائی ہندی فلمیں دیومالائی نوعیت کی حامل تھیں۔ پہلا ہندوستانی فلمساز، دھندی راج پھلکی، جس نے 1913ء میں "راجہ ہریش چندر" تخلیق کی ایک پادری گھرانے کا فرد تھا۔ ایک روایتی ہندی فلم کا ہیرو لازمی طور پر "رام دیوتا" کا خادم اور چیلا ہوتا ہے جسے رامائن میں "عزت وغیرت" کے دیوتا سے یاد کیا جاتا ہے یہ دیوتا خوبصورت (عام طور پر کھلے رنگ) ایماندار، سچا اور بے عیب ہوتا ہے جبکہ ہیرو نہایت ہی نیک اور پاکباز اور ولن (ہیرو کا مخالف) بدکار اور بدمعاش ہوتا ہے اور نیکی ہمیشہ بدی پر غالب آجاتی ہے۔ فلم کی کہانی میں ایک ایسا نغمہ بھی شامل ہو سکتا ہے جسے بارش میں گایا جاتا ہے (جس میں ہیرو اور ہیروئن عموماً گیلے اور بدن کے ساتھ چپکے لباس میں عشقیہ انداز واطوار اختیار کرتے ہیں) یا پھر بدمعاشی اور بدکاری کے خوفناک اقدامات شامل ہوتے ہیں لیکن پھر بھی شاعری کے بجائے لفاظی کی شرح زیادہ ہوتی ہے۔ یہ فلم مکمل تفریحی فلم ہوتی ہے۔ جس میں گھریلو اخلاقی روایات اور ہیروئن کی پاکباز حیثیت قائم اور برقرار رہتی ہے۔ ہندی فلمیں زندگی کو حقیقی انداز میں پیش نہیں کرتیں بلکہ زندگی کو ایسے پیش کرتی ہیں جس طرح زندگی کو ہونا چاہیے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہندی فلمیں بہت دور دور تک جاتی ہیں۔ اس کے برعکس غیر ہندوستانی افراد ہندوستان کے برعکس ممالک مثلاً پیرو، انڈونیشیا، یونان اور ایتھوپیا میں کسی حد تک نغمے مناظر اور بے رحم حقیقت کو پسند کرتے ہیں۔ اس وقت عالمی سطح پر سالانہ 3.6 ملین افراد ہندوستانی فلمی صنعت کو پسند کرتے ہیں جس کے باعث یہ صنعت نہایت اطمینان کے ساتھ ترقی کے مراحل طے کر رہی ہے اور اجتماعی طور پر کامیابی اور ترقی کی امیدوں کا مرکز ہے۔

لیکن درحقیقت ہندوستانی فلمی صنعت محض فلمسازی کے پیشے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ تہذیب اور مذہب کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ ہندوستانی فلمیں یہ بتاتی ہیں کہ کون ولی

(سان فرانسسکو کے جنوب مشرق میں واقع سانتا کلارا نامی ایک وادی جہاں مائیکرو الیکٹرانکس کے بہت سے امریکی ادارے واقع ہیں) کے ایک سافٹ ویئر انجینئر اور ہندوستان کی ایک نہایت پسماندہ ریاست بہار کے ایک دیہاتی کو لباس کیسا پہننا چاہیے، زبان کون سی بولنی چاہیے اور ان کے رسوم ورواج کون سے ہونے چاہئیں اور ان کی خواہشات کون سی ہونی چاہئیں۔ جدید فنی مہارت نے ہندوستانی فلمی صنعت کے دنیا بھر میں پھیلاؤ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ڈی وی ڈی، سیٹلائٹ اور انٹرنیٹ نے ان ممالک میں ہندی فلموں کے شائقین پیدا کیے ہیں جہاں یہ سینما کے ذریعے ممکن نہیں۔

جنوبی کوریا میں ہر ہفتے شائقین کی ایک تنظیم ہندوستانی فلمیں دکھانے کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ تنظیم خود کو ”بالی وڈ لورز کلب“ (Bollywood Lovers Club) کے نام سے پکارتی ہے جو ہندی فلموں کی نمائش کا انتظام کرتی ہے اور نہایت محنت سے ان فلموں کا ہندی زبان میں ترجمہ ساتھ ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اپنی تنظیم کے سربراہ کے الفاظ میں یہ لوگ ”ہندوستانی طرز زندگی اور تہذیب وثقافت“ کا مشاہدہ کرتے ہیں یعنی یہ لوگ بھی ”شور وغل کرتے، قہقہے لگاتے اور ولن کو برا بھلا کہتے ہیں۔“ اس کے علاوہ یہ تنظیم (کلب) ہندوستانی فلموں میں پیش کیے جانے والے رقص کو سکھانے اور اس کی تربیت کے لیے باقاعدہ اور منظم طور پر اہتمام کرتی ہے۔ تقریباً سات ہزار مختلف قسم کے ارکان شاہ رخ خان کی تصویر والی ”ٹی شرٹس“ پہنتے ہیں اور ان پیالیوں میں کافی پیتے ہیں جن پر شاہ رخ خان کی تصویر چھپی ہوتی ہے۔ 1998ء تک صرف ایک ہندوستانی فلم جنوبی کوریا میں دکھائی گئی۔ تامل زبان میں بنائی گئی اس فلم کا نام ”متھو“ (رقص کرتا ہوا مہاراجہ) تھا۔

"Indian Films and Nigerian Lovers: Media and the Creation of Parallel Modernities"

نامی ایک مقالے میں ماہر بشریات برائن لارکنز شمالی نائجیریا میں ہندوستانی فلموں کے اثرات کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے جہاں 1950ء کی دہائی میں لبنانی تقسیم کنندگان نے ہندوستانی فلمیں درآمد کرنا شروع کیں۔ اس ضمن میں لارکنز رقم طراز ہے:

”آج بھی یہاں ہندوستانی فلموں اور اداکاروں کے بڑے بڑے اشتہار اور تصویریں کرائے کی کاروں، بسوں کو سجانے کے لیے استعمال

کی جاتی ہیں۔ مزید برآں درزی خانوں اور گاڑیاں مرمت کرنے والی دکانوں میں بھی ہندوستانی فلموں کے تصویری اشتہار آویزاں کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ نعتیں پڑھنے والے گلوکار ہندوستانی فلموں کے نغموں کے الفاظ تبدیل کر کے انہیں نعتوں (مسلمانوں کے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں اشعار) کی شکل میں ڈھال لیتے ہیں اور پھر وہ یہ نعتیں نہایت عقیدت واحترام سے پڑھتے ہیں۔

گزشتہ تیس برس سے زائد عرصے سے ہندوستانی فلمیں، اداکار، اداکارائیں، لباس، بالوں اور آرائش حسن کے جدید انداز، موسیقی اور کہانیاں شمالی نائجیریا کی تہذیب وثقافت کے ایک غالب حصے کے طور پر موجود ہیں۔“

جرمنی کے عوام بھی اب ہندوستانی فلموں کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے اہم کامیابی 2003ء میں اس وقت حاصل ہوئی جب یہاں ”کبھی خوشی کبھی غم“ نامی ہندوستانی فلم دکھائی گئی۔ جرمنی میں ڈی وی ڈی پر جرمن زبان میں ڈھالی گئیں ہندوستانی فلمیں اس عنوان کے ساتھ فروخت کی جاتی ہیں: ”ہندوستانی فلمیں آپ کو خوشی اور لطف مہیا کرتی ہیں۔“

پاکستان میں ہندوستانی فلمیں ناجائز طور پر برآمد کرنے کا رجحان ہمیشہ سے ہی کثرت سے موجود رہا ہے۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان دوسری جنگ (1965) کے بعد حکومت پاکستان نے ہندوستانی فلموں کی درآمد اور نمائش پر پابندی عائد کردی لیکن ہندوستانی فلمیں پھر بھی پاکستان میں موجود ہیں۔ نئی ہندوستانی فلموں کے مسروقہ نسخے ڈی وی ڈی کے ذریعے ان کی ہندوستان میں نمائش کے روز پاکستان میں بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ انگریزی اور اردو اخبارات میں ان فلموں کے متعلق جائزے اور تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ اگرچہ ریڈیو پاکستان سے ہندوستانی فلموں کے نغمے نشر نہیں کیے جاتے لیکن پاکستانی شائقین کو مشہور نغموں، رقصوں، کپڑوں، بالوں اور آرائش حسن کے جدید انداز کے علاوہ ہندوستانی فلمی صنعت کے حالات سے بھی مکمل طور پر آگاہی ہوتی ہے۔ کراچی اور لاہور کی سڑکوں اور شاہراہوں پر شاہ رخ خان کی تصاویر پر مشتمل تجارتی اشتہار نصب ہوتے ہیں۔ پاکستان میں اس کا آبائی شہر پشاور سیاحتی

مرکز ہے۔ فلمساز مہیش بھٹ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ پاکستان کی طرف سے ہندوستان کے ساتھ کبھی نہ جنگ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شاہ رخ خان پاکستان کا رہائشی ہے۔

ہندوستانی فلمی صنعت کے لیے استعمال کیا جانے والا مختصر نام ''بالی وڈ Bollywood'' جو ''بمبئی Bombay'' اور ''ہالی وڈ Hollywood'' کا مرکب ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی کافی عرصے سے متنازعہ حیثیت کے حامل ہیں۔ نیویارک ٹائمز کے ماہر لسانیات ولیم سیفائر اس لفظ کے ڈانڈے جرم وسزا کے موضوع پر کہانیاں لکھنے والے مصنف ایچ۔ آر۔ ایف کیٹنگ کے ساتھ ملاتا ہے جس نے یہ لفظ پہلی بار 1976ء میں استعمال کیا۔ تہذیبی طور پر اس تحقیر آمیز نام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی فلمی صنعت جس نے امریکی فلمی صنعت کی کوکھ سے جنم لیا ہے، تیسری دنیا کی شکل کا یہ ہمزاد اپنے مغربی ماخذ سے کہیں زیادہ طاقتور، ماہر اور خوبصورت و حسین ہے۔ ہندوستانی فلموں کے اداکار اور فلمساز اس لفظ پر مسلسل اعتراض کرتے رہے۔ ہندوستانی فلمی اخبارات اور جرائد نے یہ لفظ اپنا لیا اور اسے ہندوستانی فلمی صنعت کے مترادف کے طور پر مقبول عام بنا دیا۔ پھر یہ نئی تشکیل شدہ اجزائے ترکیبی عمومی طور پر مروج ہوگئی (2001ء میں اسے آکسفورڈ ڈکشنری کے تدوین شدہ پانچویں شمارے میں شامل کر دیا گیا) پھر آہستہ آہستہ اس لفظ نے عالمی حیثیت حاصل کر لی۔ یوں گویا تاج محل کے مانند بالی وڈ بھی ہندوستان کے مختصر نام کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

ہندوستان رقبے کے لحاظ سے یہ دنیا کا ساتواں بڑا ملک ہے اور آبادی کے لحاظ سے اس کا دوسرا درجہ ہے۔ اس ملک میں سرکاری طور پر تسلیم شدہ زبانوں کی تعداد تیئیس (23) ہے اور دو ہزار مختلف مقامی زبانیں ہیں۔ یہاں پر بیشمار مختلف مذاہب موجود ہیں اور انڈونیشیا و پاکستان کے بعد مسلمانوں کی تیسری بڑی آبادی یہاں موجود ہے۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جو سماجی انتہاؤں کا مظہر ہے جہاں ایک طرف دولت مندی، خوشحالی، ترقی اور تعلیم کا دور دورہ ہے تو دوسری طرف غربت، افلاس، پسماندگی اور جہالت بھی اپنے پورے کمال کے ساتھ موجود ہے۔ صدیوں سے ہی بالکل مختلف حالات ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ ممبئی میں واقع ایشیا کا سب سے گندا اور غلیظ علاقہ اس فائیو سٹار ہوٹل سے صرف منٹ کے فاصلے پر ہے جہاں لوئیس ویوٹون کے تھیلے شیشے کی الماریوں میں سجے ہوئے ہیں اور کھانے کی قیمت کئی سو ڈالر ہے۔ یہ دونوں حقیقتیں زمینی حقیقتیں ہیں۔ اپنی کتاب "From Midnight to Millennium" میں ششی

تھرور یہ سوال پوچھتا ہے: ''تو کون سی چیز ان مختلف افراد کو ایک رکھتی ہے؟''

اس سوال کا ایک جواب ''بالی وڈ'' یعنی ہندوستانی فلمی صنعت ہے۔ ہندوستانی فلمیں عالمی طور پر ایک ایسے بندھن کا کردار ادا کرتی ہیں جس سے دنیا بھر میں موجود افراد جنس، علاقے، مذہب اور عمر سے قطع نظر منسلک ہیں۔ ان افراد میں اندازاً بیس ملین وہ غیر ہندوستانی بھی شامل ہیں جو دنیا کے ایک سو دس ممالک میں موجود ہیں۔ ان کے لیے ہندوستانی فلمیں ان کے اپنے مادر وطن سے اٹوٹ رشتے کا ذریعہ ہیں۔ ہندوستانی پناہ گزینوں کی دوسری اور تیسری نسل ہندی فلموں کو مقامی زبان کے ترجمے کے ساتھ دیکھتی ہے کیونکہ اب وہ اپنی مادری زبان نہیں جانتے۔ ہندوستانی فلمیں بلکہ ہندوستان ان کا ایک ایسا بدیسی مادر وطن ہے کہ اس کے متعلق انہوں نے سنا تو ہے لیکن شاید وہ کبھی بھی یہاں نہیں آئے۔ نیویارک اور لندن جیسے شہروں میں ہندوستانی شبینہ کلبوں میں ''دیسی شبینہ محفلیں'' منعقد کرتے ہیں جہاں ہندوستانی نغمے مغربی موسیقی کے ساتھ بجائے اور گائے جاتے ہیں۔ درحقیقت ہندوستان اب ایک پسماندہ، مفلس اور قدرے خطرناک ملک نہیں تھا۔ اب ہندوستانی فلمیں عالمی سطح پر نئے رجحانات پھیلاتی ہیں اور دوسرے اس کی تقلید کرتے ہیں اور اس طرح ہندوستان بھی ایک ایسا ملک ہے جو اپنی مثال آپ ہے اور جہاں سے دنیا تہذیب وتمدن سیکھتی ہے۔

شاہ رخ خان آج کے روشن اور چمکتے دمکتے اور نئے ہندوستان کا روشن اور تابناک چہرہ ہے۔ وہ دور جدید کا دیوتا ہے...... ہندوستان کی سڑکوں اور گلیوں میں اس کی بڑی بڑی تصاویر، مذہبی دیوی دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ فروخت ہوتی ہیں۔ مزار، معبد اور خانقاہیں اس کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں۔ مشہور عالم ہندی فلمی صنعت کے ہندوستانی اور غیر ہندوستانی شائقین اور پرستاروں کے لیے شاہ رخ کی شخصیت ٹام کروز اور بریڈپٹ سے زیادہ بڑی ہے۔ ہندوستانی فلمی صنعت میں محض پندرہ سالوں میں پچاس سے زائد فلموں کے ساتھ وہ ایسا دیوقامت مجسمہ نظر آتا ہے جو بے مثال ہے۔ پان کی پیک اور داغ دھبوں سے لتھڑے ہوئے ایک متوسط مسلمان گھرانے کا نوجوان کیسے دنیا کی ایک سب سے بڑی فلمی صنعت کا عظیم بے تاج بادشاہ ہے جس کا کوئی ہمسر نہیں اور نہ ہی مستقبل میں ایسا کوئی امکان ہے۔ جب وہ سگریٹ کا آخری ٹکڑا ہوا میں اچھال کر نیچے پھینک دیتا ہے تو لوگ اس ٹکڑے کو یادگار کی حیثیت سے محبت وعقیدت کے عالم میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ جب اسے ''کنگ خان'' کہہ

کر پکارتے ہیں تو بجا طور پر اس کے مستحق ہیں۔

ممبئی کے مضافات میں شاہ رخ کا گھر تہذیبی ورثے کا حامل ایک وسیع وعریض بنگلہ کافی عرصے سے سیاحتی کشش کا مرکز رہا ہے۔ تعطیل کے موقع پر سیر وتفریح کرنے والے افراد سے بھری ہوئی بسیں اپنے معمول کے مطابق صدر دروازے کے سامنے رکتی ہیں۔ ہر اتوار کی شام کو جب اٹھارہ ملین آبادی پر مشتمل یہ خبطی شہر سانس لینے کے لیے رکا ہوتا ہے، ہزاروں مرد اور عورتیں اسے دیکھنے کی سعادت حاصل کرنے کے لیے وہاں جمع ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات جب شاہ رخ گھر پر ہوتا ہے تو وہ برآمدے میں نکل آتا ہے اور اپنے پرستاروں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتا ہے۔

لیکن شاہ رخ خان کی ذاتی زندگی فلمی دنیا میں اس کی غیر معمولی داستانِ کامیابی سے کہیں ماورا اور مختلف ہے۔ وہ ہندو اکثریت رکھنے والے ملک کی فلمی دنیا کا ایک نہایت ہی کامیاب اور عظیم مسلمان اداکار ہے اور اس کی زندگی اس قوم میں موجود بنیادی تضادات کی عکاس ہے جو آزاد ہونے کے بعد دنیا میں اپنا مقام بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ شاہ رخ کی داستان آج کے جدید ہندوستان کی تہذیب کی تشکیل کی ذمہ دار قوتوں اور عناصر کا واضح اور تفصیلی انداز میں جائزہ مہیا کرتی ہے۔

شاہ رخ خان کی کامیابی اور عروج کو ایک ایسے ملک کا استعارہ سمجھا جا سکتا ہے جس میں نہایت خطرناک رفتار سے تبدیلی واقع ہو رہی ہو۔ 1990ء کی دہائی میں ہندوستان بے شمار تبدیلیوں میں سے گزرا۔ مالیاتی بحران کے خدشے کے پیش نظر اور عالمی بینک کے قرضوں کی عدم ادائیگی کے خطرے کا سامنا کرتے ہوئے 1991ء میں حکومت کی طرف سے وسیع پیمانے پر معاشی اصلاحات متعارف کروائی گئیں۔ اشتراکیت پر مبنی معاشی حکمت عملی ختم کر دی گئی۔ کئی ایک بڑی صنعتوں کی ازسرِنو تنظیم کاری کی گئی اور کثیر الاقوامی تجارتی اور کاروباری اداروں کے قیام کی اجازت دے دی گئی۔ اسی سال مصنوعی سیارے کے ذریعے کام کرنے والی ٹی وی نشریاتی اداروں سی این این، سٹار ٹی وی، ایم ٹی وی۔۔۔ نے اپنے پروگرام پیش کرنے شروع کر دیے۔

آزادی کے بعد پچاس برسوں تک ہندوستان پر ایک منجمد معیشت مسلط رہی۔ ماہر معاشیات راج کرشنا نے اس معاشی صورتحال کو ''ہندوانہ شرح ترقی'' سے تعبیر کیا جو اوسطاً تین

اعشاریہ پانچ فیصد سالانہ تھی۔ ہندوستان کے پہلے وزیراعظم جواہر لال نہرو نے ''اشتراکی معاشرتی انداز زندگی'' وضع کیا جو اشتراکی اور سرمایہ داری نظام کا حسین امتزاج ہوتا تاکہ ہندوستانی عوام معاشی اور جمہوری آزادی دونوں سے لطف اندوز ہو سکیں مگر اس کے برعکس سخت حفاظتی اقدامات اور حکومت کے زیر انتظام چلنے والے تجارتی اور کاروباری اداروں نے ''لائسنس راج Lincence Raj'' تخلیق کیا جو ایسے اصول وضوابط کا ملغوبہ تھا جس کے باعث کاروباری افراد اور عوام الناس، اعلیٰ حکام سے کام کروانے کے ضمن میں ''رشوت'' اور ''تعلقات'' استعمال کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس ''لائسنس راج'' کے باعث معیشت منتشر ہو گئی اور منڈیوں میں کمتر معیار کی حامل ''ہندوستان میں تیار شدہ'' مصنوعات کی بھرمار ہو گئی جو مغربی مصنوعات سے دو یا تین دہائیاں پیچھے تھیں۔ کارخانوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ سویت یونین کی طرز پر مرکزی حکومت کے تشکیل شدہ ''پانچ سالہ منصوبے'' کے مطابق مصنوعات تیار کریں۔۔۔ یعنی ایک سال میں اپنے لیے مقررہ حد سے زیادہ سے زیادہ سکوٹر تیار کریں اور پھر کم تعداد میں تیاری کو سرکاری طور پر ''گناہ'' قرار دیا گیا۔ اس قسم کے ماحول میں "Kellogg's Cereals" اور "Levi's Jeans" جیسی معمولی امریکی مصنوعات کو بلند سماجی مرتبے کی علامت سمجھا جانے لگا۔ ان کا موقف تھا کہ ایک طرف تو ایک شخص کے پاس اس قدر دولت اور اچھے حالات ہوتے تھے کہ وہ غیر ممالک میں سیر وتفریح کے لیے جا سکتا تھا اور پھر یہ بھی امریکہ، جس کے بازار اور منڈیاں آسائشات پر مشتمل مصنوعات سے بھری پڑی ہیں، ایک دور افتادہ (ناقابل حصول) جنت کی حیثیت رکھتا ہے۔

ان اصلاحات کے باعث ہندوستان کا شہری منظرنامہ تبدیل ہو گیا۔ یک لخت مختلف قسم کے سربمہر کھانے، جینز اور دیگر مشہور مصنوعات گلی کوچوں میں واقع دکانوں میں نظر آنے لگیں۔ ٹی وی جس پر اس سے پہلے حکومتی انتظام کے تحت چلنے والے نشریاتی اداروں سے حکومت کی مرضی اور پسند کے مطابق پروگرام نشر کیے جاتے تھے۔ مزید برآں زیر آب برقی تار (کیبل) کے ذریعے کام کرنے والے درجنوں نشریاتی ادارے وجود میں آ گئے۔ یہ نظام اس قدر سستا تھا کہ ایک ٹیلیویژن خریدنے کی استطاعت رکھنے والا فرد اس قسم کا نشریاتی ادارہ قائم کر سکتا تھا۔ مشکل، پیچیدہ اور طویل سیاسی تقریروں اور زراعت پر گفتگو کے بجائے "The Bold and the Beautiful" اور "Baywatch" جیسے لطف انگیز اور دلچسپ پروگرام نشر

ہونے لگے۔ مغرب، جس نے جدیدیت، چکاچوند اور پرتکلف، مہنگے اور پرآسائش طرز زندگی
کا دلفریب وعدہ کیا تھا، متوسط درجے کے مکانوں میں منتقل ہو گیا۔

جب 1990ء کی دہائی میں ہندوستان کی معاشی ترقی کی شرح سات فیصد سے بھی زیادہ ہو گئی تو پھر وہ متوسط طبقہ منظر عام پر آیا جو بہت زیادہ قوت خریداری سے مالا مال تھا۔ دہلی میں قائم ''نیشنل کونسل آف اپلائیڈ اکانومک ریسرچ'' جو متوسط طبقے کے بجائے ''صارف'' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے، نے اندازہ لگایا کہ 1990ء کی دہائی کے وسط میں اس ''صارف'' کے پاس 32.5 سو ملین مالیت کے اثاثے پایا یہ ''صارف'' 128 ملین افراد پر مشتمل تھے۔ ماہرین کے اندازے کے مطابق 2005ء میں ان افراد کی تعداد 250 ملین سے زائد تھی اور یہ تعداد امریکہ کی کل آبادی سے صرف پچاس فیصد کم ہے۔

عالمگیریت، صارفین کی تعداد میں بے تحاشہ اضافے اور مسابقت کے باعث دنیا بھر میں تجارتی اور کاروباری اعتبار سے ایک طوفان خیز ماحول تخلیق ہوا، روایتی اصول وقوانین اور رسم ورواج ترک کر دیے گئے۔ قدیم اور جدید روایات، نئی خواہشات وضروریات اور قدیم توقعات کے درمیان توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں متوسط طبقہ اضطراب اور عدم تحفظ میں مبتلا ہو گیا۔ دولت مند اور خوشحال مغربی معاشرے کو لاحق بے چینی وپریشانی، مایوسی وانتشار، طلاق کا معمول اور دیگر برائیاں اور امراض وسیع پیمانے پر پھیل گئے۔ ہندوستانی گھریلو زندگی، عورت کا کردار، شادی اور باہمی تعلقات کے حوالے سے نئے رسوم ورواج مروج ہو گئے۔

ہندوستانی معاشرے میں رونما ہونے والی ان تبدیلیوں کے ردعمل کے طور پر بے شمار مختلف النوع رجحانات بھی سامنے آئے۔ ان میں خاص طور پر دائیں بازو کی ہندو طاقتور تنظیم قابل ذکر ہے۔ پھر دسمبر 1992ء میں شمالی ہندوستان میں واقع ایک متنازعہ مقام بابری مسجد کو ہندو بنیاد پرستوں نے تباہ وبرباد کر کے کھنڈر میں تبدیل کر دیا جس کے بعد ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے۔ ممبئی جو عرصہ دراز سے ایک صلح کل اور آزاد خیال شہر سمجھا جاتا تھا فسادات کے ان ادوار کے باعث منتشر ہو گیا اور اس کی وسیع المشربی تارتار ہو گئی۔ حکومت کے حکم کے مطابق جاری کی گئی ''سری کرشنا رپورٹ'' کے مطابق نوسو (900) افراد ہلاک ہوئے اور دو ہزار چھتیس (2036) زخمی ہوئے۔ پچاس ہزار سے زائد افراد بے سروسامان اور بے گھر ہو گئے۔ عالمگیریت کی سحر انگیزی اس مذہبی تضاد، غربت، افلاس، بدعنوانی اور تشدد کو نہ تو چھپا سکی اور نہ ہی ان

عناصر پر قابو پا سکی جو لاوے کی شکل میں اندر ہی اندر ابل رہے تھے۔ ایک دقیانوسی معاشرہ جو پانچ ہزار سال کی تہذیبی اور روایتی غلاظت میں لتھڑا ہوا تھا جب اس کا سامنا ''جدیدیت کی چکاچوند'' سے ہوا تو اس نے خود سے پوچھا: ''کیا ایک ''ہندوستانی معاشرہ'' ایسا ہوتا ہے؟''

شاہ رخ خان نے اس سوال کا نہایت ہی ولولہ انگیز اور حوصلہ افزا جواب مہیا کیا۔ اپنی فلموں مثلاً ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' (1995) ''دل تو پاگل ہے'' (1997) ''کچھ کچھ ہوتا ہے'' (1998) ''کبھی خوشی کبھی غم'' (2001) اور ''کل ہو نہ ہو'' (2003) کے ذریعے اس نے ہندوستانیوں کو بتا دیا کہ ایک ہندوستانی وسیع المشرب اور صلح کن فرد ہونے کے علاوہ نہایت آسانی سے مغرب کی آسائشات سے مستفید بھی ہو سکتا ہے اور مشرق کی روحانی آسودگی بھی حاصل کر سکتا ہے۔

آپ کو ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ دونوں پہلو بغیر کسی الجھن اور پریشانی کے ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر فلم ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' میں شاہ رخ کے کردار کا نام ''راج'' ہے۔ ایک ایسا ہندوستانی نوجوان جو لندن میں پیدا ہوا، جو بیئر (شراب) پیتا ہے، جو ''ہارے ڈیوڈسن'' کی جیکٹ پہنتا ہے اور ایک مکمل یورپی نظر آتا ہے لیکن راج نشے میں مدہوش ومخمور اپنی ہیروئن سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا کیونکہ وہ ایک ہندوستانی خاتون کی عزت وحرمت کا احترام کرتا ہے۔ دیگر فلموں میں بھی شاہ رخ کے کردار اس نظریے کا اعادہ کرتے نظر آتے ہیں کہ ایک ہندوستانی کی شخصیت پر بین الاقوامی رنگ چڑھنے کے باوجود اس کے اندر کا اصل ہندوستانی تشخص بدستور قائم اور زندہ رہتا ہے۔ شاہ رخ خان نئی صدی کے اس ہندوستان کا تابناک اور روشن چہرہ ہے جو عالمگیر روایات کے ساتھ ساتھ اپنی مقامی اقدار کو بھی اپناتا ہے اور دنیا میں سکون واطمینان محسوس کرتا ہے۔

شاہ رخ خان ہندوستان کے نئے متوسط طبقے کا چہرہ بھی ہے اور اس چہرے میں تبدیلی لانے کا سبب بھی ہے۔ وہ ہندوستانی فلمی صنعت کا پہلا اداکار ہے جس نے اشتہار بازی کی صنعت میں قدم رکھا۔ شاہ رخ خان کبھی بھی اس مصنوعہ کے اشتہار میں کام نہیں کرتا جو اس کے نزدیک معیاری نہ ہو۔ اس نے پیپسی کولا سے لے کر ٹیگ میچور گھڑیوں کی فروخت کے لیے اداکاری کی۔ ان اشتہاروں میں شاہ رخ خان کی فلمی اداکار کی حیثیت سے اس کی زوردار شخصیت کے ذریعے صارفین کو مصنوعات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔

1955ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی ایک فلم "شری 420" کا ایک مقبول نغمہ اس نظریے پر عین صادق آتا ہے:

میرا جوتا ہے جاپانی
یہ پتلون انگلستانی
سر پہ لال ٹوپی روسی
پھر بھی دل ہے ہندوستانی

1955ء میں پیش کی گئی یہ وسیع المشربی، صلح جوئی اور ملن ساری شاید بہت سے ہندوستانیوں کے لیے ایک تابناک اور روشن امید کی حیثیت رکھتی تھی اور آج یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔ مارلن منرو کے مانند شاہ رخ بھی اپنے عہد کا استعارہ اور علامت ہے۔ یہ ہے شاہ رخ کی داستان۔

❁

دوسرا باب

پشاور: قصہ خوانوں کا بازار

پشاور میں واقع قصہ خوانی بازار ایک گنجان آباد، ولولہ انگیز، پرجوش اور متحرک علاقہ ہے۔ جو قدیم و جدید روایات کا حسین امتزاج ہے۔ مرکزی سڑک کے دونوں طرف دکانوں کی اس قدر بھرمار ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دکانوں کے قیام کے وقت کسی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ کتابوں کی دکانوں کے ساتھ ڈاکٹروں کے شفاخانے ہیں، کپڑے کی دکانوں کے ساتھ مٹھائیوں کی دکانیں ہیں پھر چائے خانوں کے ساتھ ساتھ قہوہ خانے ہیں۔ نوادرات، پشاوری چپلوں، خشک پھلوں، مسور کی دالوں سے دکانیں اوپر سے نیچے تک بھری ہوئی ہیں۔ فضا میں ہر وقت شوروغل برپا رہتا ہے، لوگوں کے ریلے ادھر ادھر آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ کوئلوں پر گوشت بھوننے کے باعث پیدا ہونے والی تلخ و تیز بو فضا کو بھی کثیف کر دیتی ہے لیکن تازہ تازہ پکتی روٹیوں اور تازہ پھلوں کے ڈھیروں کی بھینی بھینی خوشبو فضا کو کسی حد تک لطیف کر دیتی ہے۔ دکانوں کے اوپر لوگوں کی رہائش ہے اور ان کے پیچھے محلے ہیں جہاں اونچے نیچے مکانات پرپیچ گلیوں کے ذریعے آپس میں منسلک ہیں۔ یہ گلیاں اس قدر تنگ ہیں کہ بعض جگہوں سے دو افراد بیک وقت نہیں گزر سکتے اور ایک فرد کو گزرنے کے لیے دوسرے فرد کو راستہ دینا پڑتا ہے۔

صدیوں سے ہی پشاور مذہبی، تاریخی اور جغرافیائی طور پر دوراہوں کا مرقع رہا ہے۔ یہ شہر درہ خیبر کی مشرقی حد کے نزدیک واقع ہے اور برصغیر میں داخل ہونے والوں کے لیے ایک قدرتی پڑاؤ کی حیثیت کا حامل رہا ہے۔ بادشاہ، فوجیں، حملہ آور اور سوداگر سب پشاور ہی کے ذریعے برصغیر میں داخل ہوئے۔ انیسویں صدی کے وسط میں پشاور کے برطانوی کمشنر سر ایڈورڈ ہربرٹ نے "قصہ خوانی بازار" کو "وسطی ایشیا کا پکاڈلی" قرار دیا۔ سیاح بازار میں رک کر قہوہ (مقامی سبز چائے) پیتے اور ایک دوسرے کو قصے کہانیاں سناتے۔ ماضی میں پیشہ ور داستان گو سامعین کو اپنے لہجے اور انداز سے مبہوت اور سحر زدہ کر دیتے تھے۔ قصہ خوانی بازار

سے مراد ''قصہ خوانوں کا بازار'' ہے۔ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ہندوستانی سینما کے کچھ بڑے بڑے نام جنہوں نے آئندہ نسلوں پر اپنے اثرات مرتب کیے ان کی بنیادی اور ابتدائی تربیت یہیں سے ہوئی تھی۔

''ڈھکی نال بندی'' نامی ایک محلے میں وہ مکان واقع ہے جہاں ایک زمانے میں پرتھوی راج کپور کی رہائش تھی۔ خوبصورتی کے ایک مجسمے کی صورت کے اس نوجوان نے صرف بائیس سال کی عمر میں پشاور کو الوداع کہا اور دو دن اور دو راتوں کے سفر کے بعد ممبئی پہنچا اور پھر 1930ء اور 1940ء کی دہائیوں میں وہ صف اول کا ادارہ بن چکا تھا۔ اس کے ذریعے اداکاروں اور فلمسازوں کی ایک سلطنت تخلیق ہوئی۔ کپور خاندان کی چار نسلوں نے ہندوستانی فلمی صنعت کو اپنی سحر انگیزیوں میں جکڑے رکھا ہے۔

یہاں سے پانچ منٹ سے بھی کم فاصلے پر واقع محلہ ''ڈوما گلی'' کے ایک مکان میں دلیپ کمار نے جنم لیا۔ اس کے باپ کی پھلوں کی دکان تھی جو 1930ء کی دہائی کے اوائل میں ممبئی منتقل ہو گیا لیکن ہر دو یا تین سال بعد بچے چھٹیوں میں واپس یہیں آجاتے۔ بالوشاہی اور سیلونی قلفے کے مانند بچے یہاں کی دیگر لذیذ اور خوش ذائقہ مٹھائیوں سے پیٹ بھرتے اور یہاں کے پراسرار تہہ خانوں میں گھنٹوں کھیلتے رہتے۔ 2000ء میں جب دلیپ کمار (آج ہندی فلموں کا وہ اداکار ہے جس کی پوجا کی جاتی ہے) اپنے گھر واپس آیا تو وہ رو دیا اور سیڑھیوں کے نیچے ان شگافوں اور درزوں کی طرف اشارہ کیا جہاں وہ ایک بچے کی حیثیت سے رقم چھپایا کرتا تھا۔ ان دونوں مکانوں سے پیدل فاصلے پر ''محلہ شاہ ولی قاتل'' میں ایک تنگ گلی کے آخر میں مکان نمبر 1147 واقع ہے جہاں شاہ رخ خان کے والد میر تاج محمد 1928ء میں پیدا ہوئے تھے۔

میر چھ بچوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کے چار بھائی اور ایک بہن تھی۔ ان کے والد میر جان محمد ایک جسیم اور لمبے تڑنگے، ہیبت ناک شخص تھے جن کا قد چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ اس قدر لمبے تھے کہ جب ان کی وفات ہوئی تو گھر میں اس قدر بڑی چارپائی موجود نہ تھی جس پر ڈال کر انہیں قبرستان لے جایا جاتا۔ میر تاج محمد اپنے گھرانے کے ''خوبصورت بچے'' تھے۔ ان کے بہن بھائی انہیں پوتڑے باندھتے اور ان کی حفاظت کرتے۔ ان کے بڑے بھائی غلام محمد گاما اکثر کہا کرتے ''یہ میرا سوہنا پتر اے'' (یہ بہت اچھا اور خوبصورت بیٹا ہے)۔

یہ خاندان بانسوں کے کاروبار سے منسلک تھا لیکن یہ کاروبار اکثر مندے کا شکار رہتا۔ دیگر عام ہندوستانیوں کے مانند انہیں بھی اس سے بھی زیادہ سخت اور شدید جدوجہد میں شریک ہونا پڑا یعنی ہندوستان کی آزادی کی جنگ۔ میر اور ان کے بھائی خان عبدالغفار خان کے پیروکار تھے، انہیں باچا خان بھی کہا جاتا تھا۔ باچا خان مہاتما گاندھی کے سیاسی حلیف تھے۔

اگرچہ بالآخر پشاور پاکستان کا ایک حصہ بن گیا تھا لیکن یہ شہر جغرافیائی، افرادی اور تہذیب و ثقافت کے لحاظ سے ہمیشہ ہی افغانستان کے قریب رہا۔ یہ پٹھانوں کا مرکز ہے جسمانی طور پر غیر معمولی طاقت ور لوگ جو اپنی بے رحمانہ قوت، طاقت اور ہر قسم کے مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کے جذبے کے باعث مشہور ہیں۔ اس علاقے کی ایک عظیم روایت اور حکایت کے مطابق ان کی کمر پر پیدائشی نیلے نشان کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ عظیم منگولین شہنشاہ چنگیز خان کی براہ راست نسل میں سے ہیں۔

روایتی طور پر پٹھانوں کی تہذیب، ثقافت، جنگی مہارتوں اور صلاحیتوں سے مرصع ہے لیکن باچا خان عدم تشدد پر مبنی ایک اسلامی تحریک سے متاثر تھے اور اس سے منسلک بھی تھے اور انہیں ''سرحدی گاندھی'' کا خطاب ملا تھا۔ باچا خان کے خدائی خدمتگاروں یا انگریزوں کے کہنے کے مطابق ''ریڈ شرٹس'' نے ہندوستان کی نیشنل کانگرس کی حمایت کی۔ برطانوی فوج نے پٹھانوں کو تشدد پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، انہیں قید میں ڈالا، ان پر کوڑے برسائے گئے، انہیں اذیتیں دی گئیں لیکن باچا خان کے پرامن سپاہیوں کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی۔ 1937ء میں صوبائی انتخابات ہونے پر ''ریڈ شرٹس'' اور کانگرس کی مخلوط حکومت قائم ہوئی۔ یہ صوبہ مسلم اکثریت کا حامل واحد صوبہ تھا جہاں کانگرس نہایت طاقتور اور مضبوط تھی۔

میر کے بڑے بھائی گاما ایک معزز سیاسی رہنما تھے۔ وہ ایک ان تھک کارکن تھے جو انگریز مخالف مظاہروں اور جلسوں کا انتظام و انصرام کرتے تھے۔ بذات خود میر بھی ایک ایسے شعلہ بیان مقرر تھے جن کی ضرورت و طلب ہر وقت رہتی تھی۔ اردو میں ان کی شعلہ بیان تقریریں اتنی ہی پراثر تھیں جس قدر شاندار ان کی فلمی اداکاروں جیسی شخصیت تھی۔ 1941ء میں کانگرس نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک کا آغاز کیا جس کا مطالبہ یہ تھا کہ ہندوستان سے برطانوی حکومت کا فوری طور پر خاتمہ ہونا چاہیے۔ کانگرس نے اپنے پیروکاروں اور کارکنوں کو پرامن رہنے کی ہدایت کی لیکن جب حکومت نے نہرو اور گاندھی سمیت اکثر کانگرسی رہنما گرفتار کر لیے تو یہ

احتجاج تشدد میں تبدیل ہوگیا۔ بم پھٹنے لگے، سرکاری عمارتوں کو آگ لگادی گئی اور پھر برطانوی حکومت نے بے شمار افراد کو گرفتار کرلیا۔ تقریباً ایک ہزار افراد ہلاک ہوئے اور ساٹھ ہزار گرفتار ہوئے۔ گرفتار ہونے والوں میں میر اور گاما بھی تھے۔ اس کے بعد میر کنگ ایڈورڈ کالج میں داخل ہوگئے لیکن اگلے دو سال تک وقفے وقفے سے قید خانوں کی سیر کرتے رہے حالانکہ ان کے کسی بہن بھائی نے ہائی سکول کی تعلیم مکمل نہیں کی تھی لیکن انہوں نے پڑھائی کے لیے میر کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کی۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ سیاسی اور سماجی بے چینی و بدامنی میر کی تعلیم پر اثر انداز ہوگی ان کے بھائیوں نے انہیں دہلی بھیج دیا جہاں میر نے یونیورسٹی میں قانون کے طالب علم کی حیثیت سے داخلہ لے لیا۔

ایک سال بعد 15 اگست 1947ء کو ہندوستان آزاد اقوام کی صف میں شامل ہوگیا لیکن تقسیم کے وقت خون ریزی نے آزادی کی حسین جنت کو داغدار کردیا۔ پانچ ہفتوں کے اندر ریڈکلف نے پاکستان سے پنجاب اور بنگال کے کچھ حصوں کو کاٹ دیا اور اس طرح صدیوں پر محیط دشمنی، عداوت اور المیے کی بنیاد رکھی۔ آزادی سے ایک ماہ پہلے اور ایک ماہ بعد کے دوران دونوں اطراف سے گیارہ ملین افراد نے سرحدیں عبور کیں۔ ہندو اور سکھ پاکستان سے ہندوستان چلے گئے۔ دہلی کے ایک اخبار ''ہندوستان ٹائمز'' نے نقل مکانی اور منتقلی کی اس صورت حال کے بارے میں یوں اطلاع دی: ''امرتسر کے نزدیک ایک لاکھ پچاس ہزار افراد سڑک کے ساتھ ساتھ ساٹھ میل میں پھیلے ہوئے ہیں شاید یہ انسانی تاریخ کا سب سے بڑا قافلہ ہے!'' اس دوران ہونے والی خون ریزی بھی بے مثال تھی۔ قتل و غارت، لوٹ کھسوٹ اور آبروریزی کے بے شمار واقعات سرحد کی دونوں جانب پیش آئے۔ لاکھوں انسان ہلاک ہو گئے۔ دو آزاد ممالک کے قیام کی خوشی وسیع پیمانے پر قتل عام نے دھندلا دی اور یہ قتل عام دو آزاد اقوام کی پیدائش کے ضمن میں ایک ناقابل فراموش واقعے کی حیثیت رکھتا ہے۔

راتوں رات میر ایک بے وطن شہری کی حیثیت اختیار کر گئے۔ جب ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے برصغیر کی تقسیم کا اعلان کیا تو باچا خان ان چند افراد میں شامل تھے جنہوں نے گاندھی کی طرف سے مسلم لیگ کے دو قومی نظریے کی مخالفت کی حمایت کی تھی۔ دونوں افراد نے بالکل درست اندازہ لگایا تھا کہ مذہب کی بنیاد پر ملک کی تقسیم کے ذریعے صرف فرقہ وارانہ تشدد کو ہوا ملے گی۔ پٹھان مسلمان ہونے کے باوجود بدستور ہندوستان

کے ساتھ رہنا چاہتے تھے لیکن سرداروں کے چنگل میں پھنسا ہوا صوبہ انگریزوں نے پاکستان کے حوالے کردیا۔ کانگرس کے کہنے کے مطابق: ''باچا خان نے خود کو بے بس سمجھتے ہوئے پختونوں کو ان کے دشمنوں کے حوالے کردیا۔'' آزادی کے فوراً بعد باچا خان پر ہندوؤں کے حامی ہونے کا الزام لگایا گیا اور پاکستان کی اسلامی حکومت نے انہیں قید میں ڈال دیا۔ میر کے گھرانے سمیت باچا خان کے پیروکار مجبور ہو کر منتشر ہو گئے۔ گاما نے آئندہ سات سال قید میں گزارے۔ ''ریڈ شرٹس'' کے آزادی پسندوں کی حیثیت سے میر کا نام ''ملک دشمن افراد'' کی فہرست میں شامل کردیا گیا اور ان کے پاکستان داخلے پر پابندی لگادی گئی۔ وہ پھر کبھی اپنے گھر نہیں جا سکے۔

تقسیم ہند کے وقت پھوٹنے والے فسادات کے دوران دہلی یونیورسٹی کے میر کے دوستوں نے انہیں اپنی حفاظت میں لے لیا اور رات کو میر کے بستر کے گرد پہرہ دیتے تا کہ مسلم کش تشدد کے کسی بھی ممکنہ قدم سے انہیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔ ان میں سے ایک کا نام کنہیا لال پوسوال تھا جو قانون کا طالب علم تھا جس کا تعلق ایک دولت مند گھرانے سے تھا جو بعد ازاں کانگرس کی حکومت میں وزیر مقرر ہوا۔ میر نے 1949ء میں قانون کی ڈگری سیکنڈ ڈویژن میں حاصل کی۔ وہ اپنے دوست کنہیا لال کے ساتھ کئی ماہ تک رہے۔ آئندہ جو کچھ واقعات پیش آئے، وہ نہایت ہی مبہم اور عجیب و غریب ہیں۔ میر نے وکالت کا پیشہ اختیار نہیں کیا بلکہ اس سفر پر روانہ ہو گئے جو ان کا بیٹا چالیس سال بعد اختیار کرنے والا تھا۔ میر اپنا مستقبل اداکاری میں ڈھونڈنے کے لیے دہلی سے ممبئی جا پہنچے۔

1950ء کی دہائی میں ممبئی تین ملین افراد کے لیے نرم اور مہربان آغوش مادر کی حیثیت رکھتا تھا۔ عظیم اور دیوہیکل کثیر المنزلہ عمارتوں نے فضا میں انتشار نہیں پھیلایا تھا اور سڑکوں کے دونوں جانب پیدل چلنے والے افراد کی گزرگاہوں کو ناجائز تجاوزات نے آلودہ نہیں کیا تھا۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ اس وقت یہاں چند ہی اقسام کی کاریں تھیں جو برطانوی راج کی یادگار تھیں۔ ٹرامیں اور فنکارانہ انداز میں تعمیر شدہ عمارتیں شہر کو جدید انداز کی خوبصورتی اور چمک دمک و کشش مہیا کرتی تھیں۔ فضا اور ماحول نئی آزادی کے احساس اور مستقبل کی امید سے منور تھا۔

تقسیم ہند کے باعث پیدا ہونے والے ناخوشگوار حالات و واقعات اور جسمانی و ذہنی صدمات سے قدرے سنبھلنے کے بعد قومی تعمیر نو کا کام شروع ہوا۔ وسط شب میں قوم کے ساتھ

اپنے تاریخی خطاب میں ہندوستان کے پہلے وزیراعظم جواہر لال نے اپنے ارادوں اور عزم کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''بہت سالوں پہلے ہم نے اپنی منزل حاصل کرنے کا وعدہ اور عزم کیا تھا اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے اس وعدے کو بے دلی یا نامکمل انداز میں نہیں بلکہ پورے زور وشور کے ساتھ پورا کریں۔ اس وقت جبکہ ساعتیں نصف شب کا اعلان کر رہی ہیں۔ ہندوستان اپنی زندگی اور آزادی کے لیے جاگتا رہے گا۔''

نہرو نے ایک جدید، جمہوری، صنعتی اور لامذہب ملک کا خواب دیکھا تھا۔ 1950ء میں اس نے نیشنل پلاننگ کمیشن قائم کیا جس نے ملک کی ترقی کے لیے خاکہ اور خدوخال وضع کیے۔ زیادہ سے زیادہ زرعی پیداوار اور وسیع پیمانے پر صنعتکاری کے باعث ملک میں موجود پسماندہ اور گھٹیا معیار زندگی بلند ہو جاتا۔ اس زمانے میں سیاست، بدعنوانی کا استعارہ نہیں تھی جو بعد کی دہائیوں میں سیاست کے لیے ناسور ثابت ہوئی اور عظیم توقعات اور امیدیں ''نہرو کی ریاست'' سے منسلک ہو گئیں۔ اپنی کتاب "India Unbound" میں مصنف گورچرن داس لکھتا ہے:

''1950ء کی دہائی میں یہ امر خلاف معمول نہ تھا کہ ہر شخص اپنے لیے ''مثالیت'' کے خواب دیکھتا...... اس وقت یہ یقین کیا جا سکتا تھا کہ ہندوستان اس لیے عظمت حاصل کر لیتا کیونکہ وہ بذات خود بہت اچھا تھا۔''

اس وقت ہندوستانی فلمی صنعت بھی پھل پھول رہی تھی۔ 1950ء کی دہائی ہندی فلموں کا سنہرا دور تھا۔ اس تخلیقی اور تجارتی نشاۃ ثانیہ کے دوران بننے والی فلموں نے بعد میں آنے والی کامیاب فلموں کے لیے معیارات مقرر کیے اور ہدایتکاروں و اداکاروں کی آنے والی نسلوں پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران قابل نمائش فلم کے لیے خام مال کی لمبائی گیارہ سو فٹ مقرر کی گئی تھی لہٰذا خام مال کی فراہمی میں کمی کے باعث فلموں کی تعداد میں کمی واقع ہو گئی۔ مثلاً 1935ء میں فلموں کی تعداد 154 تھی جو 1941ء میں کم ہو کر محض 78 رہ گئی لیکن جنگ ختم ہونے کے فوراً بعد جب خام مال (فلم) پر پابندی ختم ہوئی تو سیکڑوں نجی ہدایتکار جنہوں نے جنگ کے دوران دولت سے خوب ہاتھ رنگے تھے فلمی صنعت میں کود پڑے اور فلموں کی تعداد دگنی ہو گئی۔ مثلاً 1945ء میں تیار شدہ فلموں کی تعداد 73 تھی جبکہ 1946ء میں 150 فلمیں تیار ہوئیں۔

نقدی سے بھرے صندوق ہاتھ میں لیے فلمساز اداکاروں کو ورغلا رہے تھے اور لامحالہ

اداکاروں کے لیے انکار ممکن نہ تھا۔ 1930ء اور 1940ء کی دہائیوں میں ہندوستانی فلمی صنعت پر امریکی فلمی صنعت ہالی وڈ کا انداز غالب تھا جہاں اداکار اور ہدایتکار تنخواہ دار ملازم ہوتے تھے۔ اداکار دیو آنند، جس کے بھرے بھرے بال اور مکالمے کی ادائیگی کا خوبصورت اور مترنم انداز جسے بعد کی نسلوں نے بھی اپنایا، پربھت فلم کمپنی کے پاس ملازم تھا اور اس کی تنخواہ چار سو روپے (9 ڈالر) تھی جس میں سے 35 روپے (80 سینٹ) انکم ٹیکس کی مد میں منہا ہو جاتے تھے لیکن فلمی صنعت میں نجی فلمسازوں کے قدم رکھنے کے بعد معاشی نظام اور حالات بدل گئے اور فلمی اداروں کے لیے ممکن نہ رہا کہ وہ کلی طور پر اداکاروں اور تکنیک کاروں پر انحصار کر سکیں۔ 1951ء میں ایک ''فلم انکوائری کمیشن'' قائم کیا گیا جس نے بتایا کہ خام مال پر پابندی ختم ہونے کے تین سال کے اندر اندر فلمی صنعت کی قیادت تبدیل ہو گئی۔ 1953ء میں پربھت فلم کمپنی بند ہو گئی۔ ایک سال بعد ایک اور مشہور فلمی ادارہ ''بمبئی ٹاکیز'' نے فلمیں تیار کرنا بند کر دیں۔

فلمسازی کے ایک اور مرکز لاہور سے باصلاحیت فنکار اور اداکار و اداکارائیں ممبئی منتقل ہو گئیں۔ فلمسازوں، ہدایتکاروں، اداکاروں، موسیقاروں، مصنفوں اور شاعروں کے لیے ممبئی ایک مقدس شہر کی حیثیت اختیار کر گیا۔ ان سب مرد و خواتین نے اپنے فن میں مزید نکھار پیدا کیا اور ہندوستانی فلم صنعت میں نئے رجحانات قائم کیے۔ انہوں نے اپنی ذاتی فہم و فراست سے کام لیتے ہوئے مکالمہ بازی میں مقبول عام انداز اختیار کیے اور اس طرح گہری اور نفیس فلمیں تخلیق کیں۔ یہ فلمیں مہارت اور صلاحیت کے لحاظ سے وسیع النوع اور تعداد کے لحاظ سے کثیر النوع تھیں۔

اطالوی جدید حقیقت پسندی نے ہندوستانی فلموں کے ایک عظیم ہدایتکار بمل رائے کو بہت متاثر کیا۔ اس کی فلمیں سماجی معاملات، فطری انداز اور نغموں کا حسین امتزاج تھیں۔ گرو دت بھی ایک صف اول کا ہدایتکار تھا جس نے ہندوستان کی آزادی کے بعد مادہ پرستی کے دور میں نغموں اور رومان پر مبنی فلمیں بنائیں۔ 1957ء میں محبوب خاں نے ''مدر انڈیا'' کے نام سے ایک فلم بنائی۔ یہ ایک کسان خاتون کی دردناک کہانی تھی جس نے تن تنہا اپنے دو بیٹوں کی پرورش کی لیکن اس وقت وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو گولی مارنے پر مجبور ہو گئی جب وہ ایک قانون شکن بن گیا۔ 1955ء میں یہ پہلی ہندی فلم تھی جو آسکر ایوارڈ کے مقابلے میں صرف ایک ووٹ سے ہار گئی لیکن اس فلم نے ہندوستانی فلم صنعت کو بہت ہی عظیم رجحانات سے روشناس کرایا۔

"ماں ایک علامتی نیکی اور اچھائی کا مرکز پھر باغی اور نافرمانبردار بیٹا پھر عزت، غیرت اور قربانی کی اہمیت۔

1950ء کی دہائی میں تین اداکاروں نے ہندوستانی فلمی صنعت پر اپنی دھاک بٹھائے رکھی۔ دلیپ کمار ایک خوبصورت، افسردہ خاطر شخص جس کا منفرد انداز اداکاری، المیہ اداکاری کے لیے بہت ہی مناسب تھا۔ راج کپور ایک مشہور ہدایتکار بھی تھا، مزاح اور ظرافت کا مرقع تھا۔ اس نے مغربی مزاحیہ فلموں کی کامیابی کے لیے ناگزیر چارلی چپلن کے انداز اداکاری کے ذریعے سادہ اور خیالی سحر انگیز رجحانات کو پھیلا دیا۔ دیو آنند ایک خوش انداز اور پرتکلف اداکار تھا جو ہندوستانی فلموں میں مغربی بے تکلفانہ اور تیز و تند انداز اداکاری کا ترجمان سمجھا جاتا تھا۔ ان افراد نے اپنی بہترین اداکاری اور فنکارانہ مہارت کے ذریعے سالہا سال سے محکوم رہنے والے ملک میں خوابوں اور امیدوں کی ایک دنیا بسا دی جو آزادی اور جدیدیت کے لیے ابھی آغاز ہی کر رہا تھا۔

اس دور کی ایک بہت بڑی فلم "مغل اعظم" تھی۔ اس فلم کی کہانی بنیادی طور پر انارکلی کے متعلق ہے جو درباری کنیز تھی اور شہزادہ سلیم کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ شہزادہ سلیم عظیم مغل شہنشاہ اکبر کا بیٹا تھا۔ کے۔ آصف اگرچہ ان پڑھ تھا لیکن اس کا تصور اور خیال بہت پرشکوہ تھا جسے اس نے سیلولائیڈ پر منتقل کرنے کا پختہ عزم کر رکھا تھا لیکن اس کی راہ میں رکاوٹیں بہت تھیں، جن میں مالی معاملات کے علاوہ دیگر نامساعد حالات بھی شامل تھے۔ جس طرح مغل اعظم بذات خود ایک ڈرامائی اور غیر معمولی فلم تھی اسی طرح اس کی تیاری کے مراحل بھی ڈرامائی اور غیر معمولی تھے۔

مغل اعظم کی تیاری کا مرحلہ پندرہ برس پر محیط تھا۔ مرکزی کردار کے لیے منتخب کیا جانے والا اداکار چندر موہن اس وقت فوت ہو گیا جب صرف ابتدائی مناظر ہی فلم بند ہوئے تھے اس فلم کو ضائع کر دیا گیا اور نئے سرے سے فلمبندی شروع کی گئی۔ کچھ مناظر اس قدر پیچیدہ اور مشکل تھے کہ انہیں فلمانے کے لیے کئی ہفتے صرف ہو گئے۔ آصف معیار کے لحاظ سے کسی بھی چیز پر سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ خواہ یہ اداکاروں کے لباس تھے یا پھر گلوکار۔ لہٰذا زرق برق اور کڑھائی والے لباس تیار کرنے کے لیے دہلی سے درزی بلائے گئے پھر مشہور کلاسیکی گائیک استاد بڑے غلام علی خاں کی خدمات پچیس ہزار روپے (550 ڈالر) کی خطیر رقم کے عوض

حاصل کی گئیں۔ فلمبندی کا عرصہ ڈیڑھ سال مزید بڑھا دیا گیا اور فلم کے اخراجات غیر متوقع طور پر پندرہ ملین روپے (تین لاکھ پینتیس ہزار ڈالر) تک پہنچ گئے۔ فلم کے اداکاروں میں سیکڑوں شوقیہ اور ناتجربہ کار اداکار بھی شامل تھے جنہیں "آصف صاحب" کے حکم پر ہر وقت تیار رہنا پڑتا تھا۔

اس فلم کی تیاری کے دوران "میر" بھی فلم بندی دیکھنے آتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے پٹھان نقش و نگار کے باعث پشاور کے سیاسی جلسوں میں خواتین کثیر تعداد میں شرکت کرتی تھیں۔ شاید انہیں یہ امید تھی کہ ان کی دلکش اور حسین صورت ان کے اداکاری کے میدان میں آنے اور ایک بڑا اداکار بننے میں مددگار ثابت ہوتی۔ بعد ازاں میر نے اپنے بچوں کو بتایا کہ انہیں ثانوی کردار کی پیشکش کی گئی اور یہ بھی کہ ملکوتی حسن کی مالک اداکارہ مدھوبالا بھی ان کے حسن کی معترف تھی لیکن اس فلم کے ایک نائب تکنیک کار سرندر کپور نے حقیقت یوں بیان کی۔

جب میر نے خود کو ایک اداکار کی حیثیت سے متعارف کرایا تو انہیں سرسری انداز میں ان اداکاروں کی قطار میں کھڑا ہونے کے لیے کہا گیا جو چھوٹے موٹے کردار ادا کرنے کے لیے مخصوص تھے تو "میر" فوراً ہی وہاں سے چلے آئے۔ مگر میر اداکاری کے بارے سنجیدہ دکھائی دیتے تھے۔ سرندر کپور نے بتایا کہ انہوں نے اپنی آواز میں بھاری پن پیدا کرنے کے لیے سگریٹ نوشی کا سہارا بھی لیا لیکن ان کا معدہ تمباکو کا ستم سہنے کے قابل نہ تھا۔ پھر میر نے اداکاری کو بطور پیشہ اپنانے کے لیے ایک اور کوشش کی۔ انہوں نے اس دور کے مشہور اداکار اشوک کمار سے ملاقات کرنے کی کوشش کی لیکن دربان نے ان کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔ پھر "میر" نے فلموں میں اداکاری کرنے کا خواب جھٹک دیا لیکن وہ مزید ایک سال تک ممبئی ہی میں قیام پذیر رہے۔ وہ اپنا وقت ساحل سمندر پر چہل قدمی کرتے اور تلخ چائے کی پیالیاں پیتے صرف کرتے۔ پھر "میر" اکثر بیمار رہنے لگے اور ان کے دوست کنہیا لال نے انہیں واپس دہلی جانے کے لیے قائل کر ہی لیا۔

میر ابھی بے روزگار ہی تھے کہ ان کی ملاقات فاطمہ لطیف سے ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر انتیس برس تھی۔ فاطمہ لطیف ان سے تیرہ سال چھوٹی تھی اور ہر لحاظ سے ان سے متضاد تھی۔ میر ایک طویل القامت شخص تھے اور ان کا بدن کھلاڑیوں جیسا تھا۔ چربی کی ایک فالتو تہہ بھی ان کے جسم پر موجود نہ تھی، ان کی جلد کا رنگ سفید بلکہ شفاف تھا کہ جلد کے نیچے نیلی رگیں صاف نظر

آتی تھیں۔ وہ سادہ کرتے پاجامے میں ملبوس ہوتے یا گھیر دار پٹھان لباس استعمال کرتے۔

اس پستہ قد لڑکی نے میر کو بہت متاثر کیا۔ میر ایک نہایت ہی پرسکون مسکراتی ہوئی شخصیت کے مالک تھے ان میں حس مزاح بھی بہت زیادہ تھی اور تحمل و برداشت کا مادہ وافر مقدار میں ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا جب انہیں کوئی چیز ناپسند ہوتی تو وہ صرف یہ کہتے: "یہ حلال نہیں ہے۔" اردو کتابوں اور شاعری کے دلدادہ تھے، وہ مشکل سے مشکل شعر پڑھ سکتے تھے۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر بولتے، اس کے علاوہ ان کی شخصیت میں بھی بہت ٹھہراؤ تھا۔ "میر" کا مستقل ساتھی ان کا چھوٹا سا بیگ تھا جس میں ان کے پان بنانے کا تمام سامان موجود ہوتا تھا جب ان سے کوئی شخص پان طلب کرتا تو وہ سپاری کترنے اور چونا لگانے میں بہت زیادہ وقت صرف کر دیتے تاکہ پان کے پتے میں تمام ذائقہ اور خوشبو رچ جائے۔ ان کے دوست اکثر ان سے مذاق میں کہتے کہ وہ پان بنائیں ہم سو جاتے ہیں۔ میر کے نزدیک زندگی وقار اور زندہ دلی ہی کا نام تھا۔

فاطمہ لطیف کا قد چھوٹا اور قدرے فربہ تھی لیکن خوبصورتی میں وہ ان سے کم نہ تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ سفید اور اس سفید رنگ پر کالے لمبے بال بہت خوبصورت معلوم ہوتے تھے۔ اس کا مزاج سیمابی اور شوخ و چنچل تھا۔ فاطمہ لطیف نے حیدر آباد میں شاہی ماحول میں پرورش پائی تھی، وہ اپنے بال ایک خاص طریقے کے ذریعے خشک کرتی جسے "ادھ" کہا جاتا تھا۔ ایک ٹوکری میں کوئلے دہکا کر اس میں خوشبو ڈال دی جاتی اور پھر ٹوکری کسی جالی دار تختے کے نیچے رکھ کر اس تختے کے اوپر بال پھیلا دیئے جاتے اور اس طرح بالوں میں خوشبو رچ جاتی۔ کافی سالوں تک شاہ رخ خان کو اپنی والدہ کے بالوں کی سحر انگیز خوشبو یاد تھی۔ فاطمہ لطیف کی تین بہنیں تھیں لیکن حسن میں کوئی بھی اس کے برابر نہ تھی اور سہیلیوں کے کہنے کے مطابق وہ سب سے لاڈلی تھی۔ اس کا باپ ایک تجربے کار انجینئر تھا اور ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھا لیکن فاطمہ لطیف میر کے مانند تعلیم یافتہ نہ تھی۔ فاطمہ لطیف میں جذبہ اور ولولہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ شادی کے چند سال بعد اس نے اپنے ایک عزیز سے کہا کہ وہ اسے کشتی کا مقابلہ دکھانے لے چلے اس نے انکار کر دیا تو فاطمہ لطیف اکیلے ہی یہ مقابلہ دیکھنے چلی گئی۔

میر اور فاطمہ لطیف کی ملاقات اتفاقیہ ہوئی تھی اور میر کے لیے یہ "پہلی نظر کی محبت" تھی۔ ایک دفعہ جب فاطمہ لطیف اپنے والد کے پاس دہلی گئی ہوئی تھی، وہاں اسے مشہور سیاحتی مقام

"ہندوستانی دروازے" کے نزدیک کار کا ایک شدید حادثہ پیش آ گیا۔ میر بھی یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے فاطمہ لطیف کو تباہ شدہ کار میں سے نکالا اور فوراً ہسپتال پہنچا دیا۔ ایک اچھی ہندوستانی روایت کی مطابق فاطمہ لطیف کو خون کی ضرورت تھی اور میر کے خون کا "بلڈ گروپ" بھی وہی تھا جو فاطمہ لطیف کا تھا لیکن خدا کو جو منظور تھا اس کا اندازہ ایک ہندوستانی مصنف بھی کس طرح کر سکتا تھا۔ جب فاطمہ لطیف کی والدہ کو اپنی بیٹی کے حادثے کی خبر ملی تو وہ اس کے کچھ عرصہ بعد اپنے پانچویں بیٹے کی ماں بننے والی تھی اسے اپنی بیٹی کے حادثے سے اس قدر صدمہ پہنچا کہ اس کا یہ حمل ساقط ہو گیا۔ اس ضمن میں اسے بھی خون کی ضرورت تھی اور فاطمہ لطیف کے خون کا گروپ بھی وہی تھا جو اس کی والدہ کا تھا۔ اب میر اپنا خون عطیہ کرنے کے لیے بہت ذوق و شوق کے ساتھ بنگلور پہنچ گئے جہاں فاطمہ لطیف کا گھرانہ رہائش پذیر تھا۔

میر کے تمام تر جذبے اور شوق اور بہادری کے باوجود فاطمہ لطیف کے والدین اس پرکشش اور جاذب نظر نوجوان کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کرنے کے لیے زیادہ پرجوش نہ تھے۔ میر کے پاس ڈگری تو تھی لیکن نہ ہی ان کا باقاعدہ خاندان تھا اور نہ ہی ان کے پاس روزگار تھا۔ درحقیقت اس شادی کے رکنے یا نہ ہونے کی یہ وجہ سامنے آئی کہ چونکہ میر نے اپنا خون عطیہ کیا تھا اس لیے وہ تکنیکی لحاظ سے اس خاندان کے رشتہ دار بن گئے تھے اور اس خاندان میں شادی نہیں کر سکتے تھے لیکن میر نے صبر و استقلال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور انہوں نے کنہیا لال سے عاریتاً لی ہوئی کاروں اور فاطمہ لطیف کو مرغوب مٹھائیوں کے ذریعے اسے اپنی طرف راغب کر ہی لیا۔ بالآخر 1959ء میں ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ شادی کی تقریب کے بعد بارات ریواری میں واقع کنہیا لال کے گھر واپس گئی۔ اس وقت کنہیا لال میونسپل کمیٹی کا صدر تھا۔ تمام گاؤں نے نئے شادی شدہ جوڑے کا پرجوش استقبال کیا۔ شادی میں شریک مہمانوں کا کہنا تھا کہ لمبے تڑنگے اور طویل القامت میر کا چہرہ دلہن کے مانند سرخ ہو رہا تھا۔

❀

تیسرا باب

"لیڈی کلر" کی دنیا میں آمد

شاہ رخ خان 2 نومبر 1965ء کو دہلی کے تلکور نرسنگ ہوم میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے والدین کا دوسرا بچہ تھا۔ ان کی بیٹی شہناز لالہ رخ 1960ء میں پیدا ہوئی۔ شاہ رخ خان کی پیدائش کے وقت ایک پیچیدگی یہ پیدا ہوگئی کہ ناڑ اس کی گردن کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔ اس صورت کے باعث عام طور پر سانس رک جاتا ہے، دماغی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے اور حتیٰ کہ موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ بہرحال ایک نرس نے بروقت حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا اور ہنومان (بندر دیوتا) کی کرپا (ہندو عقیدے کے مطابق) سے اس نے یہ جان لیوا ناڑ سیدھی کر دی اور شاہ رخ خان کو کسی بھی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ نرس نے پیشگوئی کی تھی کہ یہ بچہ بہت خوش قسمت ثابت ہو گا۔

لیکن یہ خوش قسمتی جلد ہی ظاہر نہیں ہوئی جب شاہ رخ خان پیدا ہوا تو اس کے والد مالی مشکلات کا شکار تھے۔ ٹرانسپورٹ کے کاروبار میں میر کے شراکت دار نے انہیں دھوکا دیا اور کاروبار ختم کرنا پڑا۔ پھر میر نے فرنیچر کے کاروبار میں ہاتھ ڈالا اور ایک دفعہ تو انہوں نے مشہور "نیشنل سکول آف ڈرامہ" میں لوازمات خورد و نوش کی دکان بھی چلائی لیکن انہوں نے بہت کم کامیابیاں حاصل کیں۔ ان کا خاندان غربت و افلاس کا شکار رہا۔ شاہ رخ کا خیال تھا کہ اس کے والد جن کے پاس قانون کی ڈگری تھی اور وہ چھ زبانوں میں ماہر تھے ناجائز ذرائع کے ذریعے دولت مند نہیں ہونا چاہتے تھے۔

شاہ رخ خان منگل وار کو پیدا ہوا تھا یعنی منگل کا دن۔ فاطمہ نے اپنے بیٹے کو بتایا تھا کہ وہ "منگلک بچہ" ہے لیکن ہندی فاطمہ کی مادری زبان نہیں تھی اس کا تعلق حیدر آباد سے تھا اور وہ اردو بولتی تھی۔ لہٰذا شاہ رخ خان کو کبھی بھی یہ معلوم نہیں ہوا کہ اس کی والدہ کا دراصل مطلب کیا تھا کہ وہ منگل کے روز پیدا ہوا تھا یا وہ فلکیاتی علامت منگلک کے زیر اثر پیدا ہوا تھا جو

ہندوؤں کے نزدیک بدقسمتی کا استعارہ سمجھا جاتا ہے۔

ان کی رہائش مغربی دہلی کے ایک پسماندہ علاقے راجندر نگر میں تھی۔ میر نے مختلف قسم کے کاروبار اختیار کیے جس کے باعث ان کی قلیل آمدنی میں قدرے اضافہ ہوتا رہا اور یہ خاندان اپنے لیے آرام و آسائش کے حصول کے لیے جدوجہد میں مصروف رہا۔ میر کاروبار میں دھوکے بازی اور بے ایمانی کے قائل نہ تھے۔ اپنے کاروبار کے لیے انہیں کئی دفعہ رقم ادھار لینا پڑی۔ مسلسل مالی مسائل اور مشکلات نے میر کے حوصلے اور ایمانداری کو منتشر اور متاثر نہیں کیا۔ ان کا مزاج شاعرانہ تھا یعنی میر رومان پسند تھے اور وہ اردو کے بہترین شاعروں کی روایت کے مطابق زندگی گزارنے کے قدیم انداز کو پسند کرتے تھے اور اپنے وقار اور غیرت پر کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھے۔ تمام مشکلات و مصائب کے باوجود انہوں نے اپنی حسِ مزاح برقرار رکھی۔ وہ اپنی بیوی کو پیار سے "کانہا" کہتے تھے یہ اردو لفظ ہے جسے رخساروں میں پڑنے والے گڑھوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی معمولی زندگی کو اپنی فہم و فراست کے ذریعے ایک طلسماتی زندگی بنا دیا۔

فاطمہ کو اپنے گھر میں غربت و افلاس گوارا نہیں تھی اور وہ میر کے مانند صابر نہیں تھی۔ اپنے سیاسی تعلقات استعمال کرنے سے مسلسل انکار جبکہ وزیر اعظم اندرا گاندھی کے سامنے موجود "آزادی پسندوں" کی فہرست میں میر کا پہلا نام تھا ان کے شراکت دار انہیں مسلسل دھوکا دیتے رہتے لیکن وہ پھر بھی تحمل و برداشت کا مظاہرہ کرتے۔ میر کی اس ضد سے تنگ آ کر فاطمہ بہت ہی زیادہ مایوس ہوگئی۔ وہ انہیں "ناکام ایماندار انسان" کے نام سے پکارتی تھی۔ ایک دفعہ شدید لڑائی جھگڑے کے بعد فاطمہ چند دنوں کے لیے کنہیالال کے گھر چلی گئی۔ ہر چند سال بعد یہ خاندان ایک چھوٹے سے کرائے کے گھر سے دوسرے کرائے کے گھر میں منتقل ہوتا رہا۔

اس صورتحال کے باوجود ان کی قلیل آمدن ان کی زندگی میں آرام و آسائش اور آسانیاں مہیا نہ کر سکی۔

پٹھانوں کی طرزِ زندگی میں غیر معمولی مہمان نوازی ان کی مرکزی روایات میں شامل ہے۔ پشاور میں کہا جاتا ہے کہ جب کسی شادی پر کسی مہمان کو مدعو کیا جاتا ہے تو اسے اپنے میزبان کی عزت افزائی کے لیے کم از کم چار دوست اپنے ہمراہ لانے لازمی ہیں۔ پشاور کے لوگوں کو اکثر "خرن لوگ" کہا جاتا ہے یعنی وہ لوگ جو دل جمعی اور خلوص کے ساتھ کھانا کھاتے

ہیں۔ میر نے یہ تمام روایات جاری رکھیں۔ میر اور فاطمہ دونوں کھانے کے شوقین تھے اور ان کا دسترخوان وسیع ہوتا تھا۔ ان کے دوستوں کو ابھی تک یاد ہے کہ حیدر آبادی طرز کی مزیدار مٹھائیاں اور پشاوری طرز کے لذیذ کھانے مثلاً ران گوشت، مہمانوں کی ضیافت کے لیے پیش کیے جاتے تھے۔ ان کا گھر تو زیادہ پرآسائش نہیں ہوتا تھا لیکن ان کا دسترخوان عام طور پر اشیائے خورونوش سے بھرا ہوتا تھا۔

میر ایک سادہ انسان تھے جنہیں اپنی کڑوی چائے اور پان کے علاوہ کسی اور چیز کی کم ہی ضرورت محسوس ہوتی تھی لیکن فاطمہ زیادہ پرتکلف تھی۔ خاص طور پر اسے یہ شوق تھا کہ اس کے بچے مادی آسائشات سے لطف اندوز ہوں۔ شاہ رخ اور اس کی بڑی بہن شہناز کی پرورش اس ''پرآسائش'' ماحول میں ہوئی جو فاطمہ نے ان کے لیے تشکیل دیا تھا۔ انہیں مشکل سے ہی یہ علم تھا کہ ان کے تقریباً مثالی بچپن میں غربت وافلاس کا کبھی گزر تھا۔

شاہ رخ خان کو سنجیدگی، متانت اور طمانیت اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی۔ ایک ننھے بچے کی حیثیت سے وہ ایک چھوٹے سے گلابی کھلونے پیانو سے گھنٹوں کھیلتا رہتا۔ تین برس کی عمر میں شاہ رخ خان اپنے اس کھیل میں اس قدر مستغرق اور منہمک ہوتا کہ بعض اوقات فاطمہ اسے گھر میں اکیلا چھوڑ کر گھر کے کام کاج کے لیے باہر چلی جاتی۔ ایک خاندانی لوک قصے کے مطابق ایک دفعہ ایک کوبرا سانپ مرکزی کمرے میں داخل ہوگیا۔ دہلی کے زیادہ تر علاقے کے مانند راجندر نگر پختہ اور کچے (جنگل) علاقے پر مشتمل تھا اور گھروں میں سانپوں کی موجودگی کے متعلق اکثر سنا جاتا تھا۔

شاہ رخ خان دیوان پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد روشنائی بکھری ہوئی تھی اور سانپ شاہ رخ خان کے نزدیک نہ آسکا کیوں کہ روشنائی کی گیلی موٹی تہہ نے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

شاہ رخ خان کا بچپن بیماری اور حادثات سے بھرپور تھا وہ اکثر ملیریا میں گرفتار رہتا تھا، اس کی کمر کے پٹھے کمزور تھے اور کتوں کے کاٹے کا بھی اکثر شکار رہتا تھا لیکن یہ بیماریاں اس کے جذبے اور ولولے کو سرد نہیں کرسکیں۔ وہ گھنٹوں اپنے آپ میں مگن رہتا۔ اس نے اپنے گھر میں کاٹھ کباڑ رکھنے والے چھوٹے سے کمرے میں اپنی والدہ کی لاکھ کی جوڑیاں پگھلانے کی خفیہ تجربہ گاہ قائم کر رکھی تھی۔ اس کا ایک پسندیدہ کھیل یہ تھا کہ وہ سرخ جانگیہ پہن کر اپنی کمر پر

تولیہ لپیٹ کر سپرمین بن جاتا اور گول تکیے ''بدمعاش'' ہوتے۔ شاہ رخ خان ان لمبے گول تکیوں پر اس وقت تلوار بازی کرتا جب تک ان میں موجود روئی کٹ پھٹ نہ جاتی۔ یہ ''بدمعاش'' ہر دفعہ شکست کھا جاتے اور شاہ رخ خان ہر دفعہ ''فاتح'' ہوتا۔

شاہ رخ خان کے بہت سے دوست بھی تھے۔ وہ اپنے گھر کے نزدیک مٹی کی پچ پر کرکٹ کھیلتے۔ بعض اوقات ان کا کھیل نصف شب تک جاری رہتا۔ فاطمہ اور میر اپنے بچوں کی پرورش کے سلسلے میں سخت گیری کے قائل نہ تھے۔ اس گھر میں زندگی نہایت آسان تھی جہاں چند اصول وضوابط نافذ تھے اور شہناز کے لیے بھی اسی معمول کی پابندی لازمی تھی۔ جب تک بچے اپنی پڑھائی میں اچھے رہتے انہیں پڑھنے پر مجبور نہیں کیا جاتا تھا بعض دفعہ انہیں سکول سے چھٹی کرنے کی اجازت محض اس وجہ سے مل جاتی کہ ''ان کا سکول جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔''

ان کی مذہبی اور دینی تعلیم بھی غیر رسمی تھی۔ فاطمہ اپنے خاوند سے زیادہ روایتی مسلمان تھی۔ وہ نہایت پابندی سے پانچ وقت کی نماز ادا کرتی لیکن میر اعتقاد کے اعتبار سے معتدل مزاج کے مالک تھے۔ میر ایک سچے، دنیاوی اور لادینی انسان تھے اور انہوں نے اپنے گھر میں بھی اسی روایت کو فروغ دیا۔ ہندو مسلم فسادات پر مشتمل صدمہ خیز واقعہ بھی انہیں باچا خان کے دیے گئے اس سبق کو بھلانے پر آمادہ نہ کرسکا کہ تمام انسان اور مذاہب برابر ہیں۔ میر کا قریبی دوست کنہیا لال ہندو تھا۔ اگرچہ یہ چیز مسلمانوں کے نزدیک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی توہین اور بے حرمتی تھی پھر بھی ہندو دیوتا جگناتھ کی ایک تصویر گھر میں موجود تھی۔ فاطمہ کے برعکس میر رمضان میں کبھی کبھار ہی روزے رکھتے۔ بعض اوقات بطور مذاق وہ فاطمہ کی گھڑی کا الارم بند کر دیتے تاکہ وہ سحری کے لیے اٹھ نہ سکے۔ اتوار کو بچے اپنے چچا کے ساتھ مسجد چلے جاتے۔ بعض اوقات جب قاری صاحب گھر میں قرآن مجید پڑھانے کے لیے آتے تو شاہ رخ اور شہناز قاری صاحب سے چھپنے کے لیے گھر میں ادھر ادھر بھاگے پھرتے۔

میر اور شاہ رخ خان ایک دوسرے کو ''یار'' کہہ کر پکارتے جو ''یارا'' کا بگاڑ ہے جو پٹھانوں میں دوست کے لیے بولا جاتا ہے۔ میر جس قدر باپ تھے اسی قدر دوست بھی تھے۔ انہوں نے شاہ رخ خان میں بھی اپنی بہترین حس ظرافت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ فاطمہ اپنے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتی رہتی تھی اور بعض اوقات انہیں مارنے سے بھی دریغ نہ کرتی۔ اس کے برعکس میر ایک نہایت ہی شفیق اور مہربان باپ تھے۔ وہ اپنے بچوں کو آزادی

کی خاطر جنگ کرنے والے افراد کے متعلق قصے کہانی پڑھنے کی حوصلہ افزائی کرتے اور انہیں ان کے کارناموں کے متعلق بتاتے۔ اس گھر میں سونے کے وقت سنائی جانے والی کہانیاں جنوں پریوں کے قصے نہیں ہوتے تھے۔ ایسوپ (Aesop) کی افسانوی کہانیاں ہی تھیں جو بچوں کے کانوں میں ''افسانے'' کی حیثیت سے سنائی دیتی تھیں۔ لہٰذا میر اپنے بچوں کو ولولہ انگیز حقیقی زندگی پر مشتمل باچا خان اور سیف الدین کچلو جیسے بہادر انسانوں کی زندگیوں کے قصے سناتے جنہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ میر اپنے بچوں کو انگریزوں کے قید خانوں میں گزارے ایام کی بھی روداد سناتے جب باچا خان دہلی آئے تو میر شاہ رخ خان کو ان سے ملاقات کروانے کے لیے لے گئے۔ وہ شاہ رخ خان کو اٹل بہاری واجپائی جیسے شعلہ بیان مقرر کے پاس بھی لے کر گئے جو ایک دن ہندوستان کا وزیراعظم مقرر ہوا۔

موسم گرما میں بچے بنگلور میں واقع اپنی نانی کے پرآسائش گھر چلے جاتے۔ میر کبھی بھی اپنے بچوں کے ساتھ اپنے سسرال نہیں گئے۔ وہ اپنے سسرالیوں کی میزبانی کو اپنے لیے باعث فخر نہیں سمجھتے تھے۔ چار سال کی عمر میں ہی شاہ رخ خان نے اپنی فنکارانہ زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔ اس نے ریڈیو کے لیے رقص کیا تھا اور اس کی چچیوں اور خالاؤں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ: ''وہ لیڈی کلر بنے گا۔'' گھر میں ریڈیو ہی ان کے لیے مقام فخر تھا۔ شاہ رخ کے والدین میں ٹیلی ویژن خریدنے کی استطاعت نہ تھی۔ گھرانے کے تمام افراد ہر شام مرکزی کمرے میں اس وقت موجود واحد سٹیشن سننے کے لیے جمع ہو جاتے۔ یہ واحد سٹیشن ''آل انڈیا ریڈیو'' تھا جو سرکاری انتظام میں تھا۔ اس کے پروگرام عام طور پر خبروں اور ہندوستانی فلموں کے نغموں پر مشتمل ہوتے۔ جب خاص طور پر ریڈیو سے اداکارہ ممتاز کی کسی فلم کا کوئی نغمہ نشر ہوتا تو شاہ رخ خان کمرے میں جھومتا اور لہراتا۔ وہ ممتاز کے لچکتے مٹکتے کولہوں اور اس کے ناز و ادا پر مبنی انداز و اطوار کی نقل کر کے اپنے گھرانے کا دل بہلاتا۔

ممتاز 1960ء کی دہائی کی ایک بھڑکیلی اداکارہ تھی۔ وہ زیادہ حسین اور خوبصورت تو نہ تھی لیکن اس میں وہ تھرکتی کشش موجود تھی جو اس قسم کی عامیانہ فلموں کے لیے موزوں تھی جو اس دور میں کامیابی کی ضامن تھی۔ 1950ء کی دہائی کے دوران بننے والی معاشرتی مسائل اور سنجیدہ معاملات پر فلموں کے باعث بعد میں ہلکی پھلکی اور غیر سنجیدہ فلموں کا دور آیا پھر رنگین فلمیں بننا

شروع ہوئیں۔ 1960ء میں صرف ایک فلم واحد رنگ پر مشتمل تھی لیکن 1970ء میں ہر فلم رنگین تیار ہو رہی تھی۔ جدید فلمسازی کے لیے بدلتے ہوئے تقاضوں کے سبب غیر ممالک میں فلم بندی کا رواج زور پکڑ چکا تھا۔ ممتاز کا بدن بجلی کے مانند تھرکتا تھا اور اس کے بالوں کا پانچ انچ لمبا جوڑا اس کے حسن کو مزید نکھار دیتا تھا۔ یہ اداکارہ رومان انگیز اور گھریلو فلموں میں اپنے رقص سے شائقین کا دل موہ لیتی تھی۔

ہندوستانی فلموں میں بڑھتی ہوئی بے ہودگی اور مغربیت تنقید نگاروں کو متاثر نہ کر سکی۔ ہندوستانی فلمی صنعت کے ہر دور میں مقبول اور بااثر جریدے ''فلم انڈیا'' کا مدیر بابوراؤ پٹیل ان بے ہودہ ہندوستانی فلموں پر تنقید کرتے ہوئے انہیں ''ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی آبروریزی'' قرار دیتا ہے اور انہیں ''تہذیبی ملاپ سے خارج ہونے والی بدبو'' سمجھتا ہے لیکن شاہ رخ خان ان فلموں سے مکمل طور پر متاثر رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ رقص اور اداکاری کے فنون کی طرف میری رغبت کا سبب اور کچھ ہو نہ ہو لیکن ''ممتاز'' سب سے اہم وجہ تھی۔ شاہ رخ خان کے دل میں پیدا ہونے والے ابتدائی جذبات شاید اس کے مستقبل کا استعارہ تھے۔ تین دہائیاں بعد شاہ رخ خان 1990ء کی دہائی میں بننے والی ان فلموں کا عظیم اور کامیاب ترین اداکار ثابت ہوا جو ماضی کی چٹپٹی فلموں کی تازہ اقسام تھیں اور جن میں زیادہ سے زیادہ فلمبندی غیر ممالک میں کی جاتی تھی اور نت نئے جدید قسم کے لباسوں کے علاوہ زیادہ سے زیادہ رومان اور گھریلو اقدار دکھائی جاتی تھیں۔

ہندوستانی فلمیں شاہ رخ خان کے لیے رشوت کا سب سے پہلا ذریعہ ثابت ہوئیں۔ سات سال کی عمر میں جب شاہ رخ خان پہلی جماعت میں تھا تو وہ حسب معمول ہندی زبان کے آزمائشی امتحانات میں ناکام ہو گیا۔ پھر ایک دفعہ اس کی والدہ نے اس سے وعدہ کیا کہ اگر وہ آئندہ آزمائشی امتحان میں کامیابی حاصل کر لے تو وہ اسے تھیٹر میں ہندی فلم دکھانے لے جائے گی۔

شاہ رخ خان جو صرف امتحانات کے ایام ہی میں پڑھتا تھا، وہ رات بھر تیاری کرتا رہا حتیٰ کہ صبح ہو گئی لیکن اس نے اس آزمائشی امتحان میں پورے نمبر حاصل کر لیے۔ فاطمہ اپنے وعدے کے مطابق اسے اور شہناز کو پٹیل نگر میں واقع ویوک سینما ہال میں ''جوشیلا'' نامی فلم دکھانے لے گئی۔

اس فلم میں دیو آنند نے مرکزی کردار ادا کیا تھا جو زیادہ جوشیلا اداکار نہیں تھا اور یہ فلم پہلے ہی سے ناکام نظر آ رہی تھی جس کے باعث ٹکٹ بھی با آسانی دستیاب تھے لیکن شاہ رخ خان اس کہانی میں موجود اتار چڑھاؤ سے بہت متاثر ہوا حالانکہ یہ نشیب و فراز عامیانہ قسم کے تھے۔ ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے قطار میں کھڑے ہونے کا لطف، کرسیوں میں سے برآمد ہونے والی چرچراہٹ کی آوازیں، کرسیوں پر منڈھے سخت ریکسین کی خوشبو، باسی پاپ کارن کی بو اور ہزاروں نشستوں پر بیٹھے ادھر ادھر چلتے شائقین ان سب عناصر نے شاہ رخ خان پر ناقابل فراموش نقوش مرتب کیے۔ شاہ رخ خان کا قد اس قدر چھوٹا تھا کہ اس نے اپنی والدہ کے بٹوے کے اوپر بیٹھ کر پردہ سیمیں کا نظارا کیا لیکن اب وہ فلموں کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ چند سال بعد شاہ رخ خان کے جذبے نے ایک چہرہ ڈھونڈھ لیا امیتابھ بچن۔

امیتابھ بچن ہندوستانی فلمی صنعت کا ایک ایسا عظیم اور کامیاب ترین اداکار ہے جو ہر قسم کا کردار ادا کر سکتا ہے۔ جب امیتابھ نے اداکاری کی ابتدا کی تو وہ ایک پرکشش اور جاذب نظر قسم کا لڑکا تھا جسے اس دور میں مرکزی کرداروں کے لیے مناسب سمجھا جاتا تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا ڈھیلا ڈھالا لڑکا تھا جو اپنے چہرے مہرے میں پائی جانے والی افسردگی و دل گرفتگی کے باعث پرکشش معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت ویرانی اور مایوسی چھائی رہتی حتیٰ کہ مزاحیہ اداکاری کرتے ہوئے بھی وہ اپنی آنکھوں سے ویرانی کے تاثرات سے چھٹکارا نہ حاصل کر سکتا۔ وہ ایک ایسا انسان معلوم ہوتا تھا جس کی روح زخمی ہو۔ 1970ء کی دہائی میں امیتابھ نے ہندوستانی فلموں میں مرکزی کرداروں کو ایک نئے رجحان سے آشنا کیا۔

فلموں میں انتہائی کامیاب اور عظیم ترین اداکار کے مرتبے اور درجے کا حصول، ایک ایسی پراسرار اور انوکھی صورتحال ہے جب اداکار محض شہرت سے کہیں ماورا ہو کر ایک دیومالائی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور یہ حیثیت صلاحیت، خوش قسمتی اور وقت کے صحیح استعمال کا مجموعہ ہوتی ہے۔ 1970ء کی دہائی کے اوائل میں ہندوستانی فلمی صنعت کے حالات تبدیلی کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ بہت سے پرانے اداکار نئے رومانوی اداکار راجیش کھنہ کے ہاتھوں مات کھا گئے۔ اس نے تمام قوم کو اپنے سحر میں گرفتار کر رکھا تھا (اس کی بے شمار کامیاب ترین فلموں میں ممتاز ہیروئن تھی)۔ اس کے عروج کے دور میں پرستار خواتین اسے اپنے خون سے تحریر کردہ خط بھجوایا کرتی تھیں لیکن غیر معمولی عظمت اور شہرت حاصل کر لینے کے بعد (اس نے تین سالوں

میں گیارہ کامیاب فلمیں بنائیں) اس کے زوال کے آثار نظر آنے لگے۔ 1972ء میں وہ صورت حال پیش آئی جس کے متعلق سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ راجیش کھنہ کی چھ فلمیں یکے بعد دیگرے ناکام ہو گئیں۔ اس کے آٹوگراف دینے کے انداز، "کن انکھیوں سے دیکھنے کی ادا، اور پراسرار مسکراہٹ" یہ سب کچھ مزید طلسم آرائی کا باعث نہ بن سکے۔ فلمساز بھی نقصان اٹھانے لگے تھے۔ کامیاب فلموں کے لیے ضروری لوازمات، رنگین مقامات فلمبندی، لباس اور دیگر عناصر میں جدت اور نغموں کی شمولیت بھی کامیابی کے ضامن نہ بن سکے۔ فلموں کے ناظرین بھی بے چینی اور اکتاہٹ محسوس کرنے لگے کہ فلموں میں دکھائی جانے والی بیزار کن اور یکسانیت سے بھرپور چمک دمک کا حقیقت سے بہت کم تعلق رہ گیا تھا۔

1970ء کی دہائی ہندوستان کے لیے بے چینی و پریشانی کا دور تھا۔ آزادی کے بعد 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں پائی جانے والی روشن امید اور رجائیت پسندی نے کامل یقین کے ساتھ گہری حقیقت پسندی کی طرف جانے کا راستہ ہموار کر دیا تھا۔ آزادی کے متوالوں اور آزادی کی خاطر لڑنے والوں کے قائدین کی طرف سے ورثے میں چھوڑی جانے والی ایثار پسندی اور ایمانداری کی جگہ بدعنوانی اور جنونیت نے لے لی۔ سیاست معزز افراد کے اپنانے کی چیز نہ رہی۔ نہرو کے بعد وجود میں آنے والی انتظامیہ غیر اخلاقی اور غیر قانونی حکمت عملیوں کی دلدل تھی، اس دور میں ان افراد کی چاندی تھی جو چاپلوسی اور خوشامد میں ماہر، اقتدار و قوت کے دلال اور موقع پرست تھے، جنہیں قومی مفاد کے بجائے ذاتی مفاد عزیز تھا۔ مجرمانہ اور سیاسی مقاصد کے لیے تشدد کا استعمال عروج پر تھا۔

1971ء میں اندرا گاندھی کی زیر قیادت کانگرس کے دھڑے نے قومی انتخابات میں "غریبی ہٹاؤ" کے نعرے کی طاقت کے بل پر کامیابی حاصل کی لیکن حکومت کے پاس اپنے اس نعرے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی منصوبہ موجود نہ تھا۔ افراط زر اور بے روزگاری کی شرح میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ سالانہ 12 سے 13 ملین بڑھتی ہوئی آبادی نے معاشی فوائد کا اثر زائل کر دیا۔ خوشی اور خوشحالی ناممکن خواب معلوم ہو رہی تھی۔ "مکمل انقلاب" کے لیے مظاہرے ہو رہے تھے اور آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ کانگرس کی ایک ریاستی حکومت گر چکی تھی اور دوسری خطرے میں تھی۔ حالات میں بے چینی اور تناؤ عروج پر تھا جب الٰہ آباد ہائیکورٹ نے اندرا گاندھی کو گزشتہ انتخابات میں بدعنوانی کا مجرم ٹھہرایا تو پھر اس کے استعفے کے لیے چیخ و پکار

شروع ہوگئی لیکن استعفیٰ دینے کے بجائے اندرا گاندھی نے ملک میں ہنگامی حالت نافذ کردی۔
26 جون 1975ء کو ہندوستان جمہوریت کے بجائے آمریت کی طرف چلا گیا۔ آئین
معطل کردیا گیا نصف شب کو سیاسی مخالفین کو گرفتار کرکے قید میں ڈال دیا گیا۔ ذرائع ابلاغ پر
پابندی عائد کردی گئی۔ اگلے اکیس ماہ کے دوران جب تک 23 مارچ 1977ء کو ہنگامی حالت ختم
نہیں کی گئی، ریاستی اور سرکاری انتظامیہ، پولیس، عدلیہ اور افسر شاہی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ
چکا تھا۔ ایک موقع پر ایک لاکھ افراد بغیر کسی مقدمے کے قید خانوں میں پڑے تھے۔ عام شہری
یہ سمجھتا تھا کہ امن و امان کی صورت حال ختم ہوچکی تھی۔ ملک میں بے بسی، ناامیدی اور مایوسی کا
دور دورہ تھا۔ سڑکوں اور گلی کوچوں میں ایک نیا اخلاقی معیار تشکیل پا رہا تھا۔

امیتابھ نے مایوسی، بے کسی اور ناامیدی کے اس دور میں امید کی ایک نئی شمع روشن کی۔
اس نے نہایت ہی اولوالعزم محافظ کا کردار ادا کیا۔ فلموں کی کہانی لکھنے والی بانی ٹیم پر مشتمل
جاوید اختر اور سلیم خان نے تین متاثر کن فلموں کے ذریعے امیتابھ کی شخصیت کی تشکیل کی۔
''زنجیر'' میں اس نے ایک ایسے ایماندار سپاہی کا کردار ادا کیا جو اپنے والدین کے قتل کے
باعث صدمے کا شکار ہوجاتا ہے۔ ''شعلے'' میں وہ ایک مخبر کا کردار ادا کرتا ہے جو ایک قاتل
غنڈے کو گرفتار کرنے کے لیے جال پھیلاتا ہے اور ''دیوار'' میں وہ ایک خفیہ تنظیم کے سربراہ
''وجے'' کا کردار ادا کرتا ہے جو اپنی زندگی میں کسی ایسے کا شکار ہوا ہوتا ہے جب وہ اپنے
سامنے پھینکی گئی رقم اٹھانے سے انکار کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ ''آج بھی میں اپنے سامنے پھینکی
گئی رقم نہیں اٹھاتا'' تو وہ اپنے اس مکالمے کے ذریعے ہندوستانی قوم کی موجودہ نسل کے
بھڑکتے ہوئے غصے کا اظہار کرتا ہے۔

امیتابھ بچن اپنے دور میں فلموں کی کامیابی کا ضامن سمجھا جاتا تھا۔ سینما ہال کے باہر
منڈلانے والے تماشائی اور آوارہ گرد آج بھی حسرت سے ان سنہری دنوں کو یاد کرتے ہیں
جب انہوں نے فلم شعلے کی چار روپے (ایک سینٹ سے کم) کی ٹکٹ پانچ سو روپے (گیارہ
ڈالر) میں فروخت کی تھی۔ لوگوں کو یہ بھی یاد ہے کہ دہلی کے پلازہ سینما کے باہر موجود پرکاش
نامی شخص نے اسی طرح فلم شعلے کی ٹکٹیں زیادہ داموں فروخت کرکے بالآخر ایک چھوٹا سا گھر
خرید لیا تھا اور اس گھر کو فلم ''شعلے'' کے بڑے بڑے تصویری اشتہاروں سے سجا دیا تھا۔ امیتابھ
میں اس قدر جذبہ اور ولولہ موجود تھا کہ جس کا اظہار جون 1982ء میں اس وقت ہوا جب وہ فلم

''قلی'' میں مار دھاڑ کے ایک منظر کی اداکاری میں مصروف تھا امیتابھ ایک آہنی میز کے کنارے
سے جا ٹکرایا اور اس کی انتڑیاں پھٹ گئیں۔ یہ ایک جان لیوا زخم تھا۔ تمام ہندوستان پر سکتہ
طاری ہوگیا۔

وزیراعظم اندرا گاندھی زخمی عظیم اداکار کی عیادت کے لیے ممبئی پہنچیں۔ امیتابھ کے
پرستار، ہدایتکار، ساتھی اداکار اور تکنیک کار سب بیچ کینڈی ہسپتال پر مسلسل نظریں جمائے
ہوئے تھے۔ سیکڑوں افراد نے خون اور دیگر اعضائے رئیسہ عطیہ کرنے کی پیشکش کی۔ تمام شہر
میں مسلمانوں اور ہندوؤں نے اپنے اپنے طور پر دعائیہ مجالس کا اہتمام کیا جس میں امیتابھ کی
صحت کے لیے اپنے اپنے خدا سے درخواست اور التجا کی گئی۔ ایس رام ناتھ نامی ایک فلمساز
امیتابھ کے خون کی شیشیاں بھر کر جنوبی ہندوستان کے ایک مندر میں لے گیا تاکہ امیتابھ پر
برکت و رحمت نازل ہو۔ پونیت اسر نامی اداکار جس کے گھونسے کے باعث یہ حادثہ پیش آیا
اسے قتل کرنے کی دھمکیاں وصول ہوئیں اور اسے نتھو رام گوڈسے کا لقب دے دیا گیا۔ قومی
اہمیت اور تصور کے لحاظ سے اس اداکار کو اس شخص کے ہم پلہ قرار دیا گیا جس نے مہاتما گاندھی کو
قتل کیا تھا۔

عوام کی مسلسل اور متواتر دعائیں رنگ لائیں اور ایک معجزہ رونما ہوگیا۔ جب ایک دفعہ
امیتابھ کے زخمی بدن نے جنبش کرنے سے انکار کردیا تو ڈاکٹروں نے امید کا دامن ہاتھ سے
چھوڑ دیا۔ چند ثانیوں کے لیے امیتابھ طبی طور پر مرچکا تھا۔ اس کی نبض اور دل کی دھڑکن معدوم
ہوچکی تھی پھر ایک نئی زندگی بخش دوا آخری کوشش کے طور پر اس کے بدن میں داخل کی گئی۔ اس
کی بیوی جایا جو بستر کی پائنتی کی طرف کھڑی دعا مانگ رہی تھی، کہنے لگی: ''دیکھو اس کے پنجے
حرکت کررہے ہیں۔'' فلموں کے مانند امیتابھ نے برائی کو شکست دے دی تھی اور سٹوڈیو میں
فاتحانہ طور پر واپس لوٹ آیا تھا۔ امیتابھ کی ''اینگری ینگ مین'' کی شخصیت مزید پختہ ہوگئی۔

لاکھوں ہندوستانی افراد کے مانند شاہ رخ خان نے بھی امیتابھ کی چال ڈھال (چیتے کے
مانند) اور لہجہ (درمیانہ لہجہ) اپنالیا۔ اس نے امیتابھ کے ایک کردار کی نقالی کرنے کے لیے اپنے
بالوں میں ٹالکم پاؤڈر ڈال لیا۔ یہ کردار امیتابھ نے "Seven Brides For Seven Brothers"
میں ادا کیا تھا اور اس فلم کو ''ستے پہ ستا'' کے نام سے دوبارہ بنایا گیا۔ شاہ رخ خان امیتابھ کی
ناکام فلموں کو بھی اچھا سمجھتا۔ اس نے یہ تمام فلمیں دیکھ ڈالیں۔ فلمی دنیا میں شاہ رخ خان کی

ایک ساتھی اس سے چند سال بڑی تھی اس کا نام امریتا سنگھ تھا۔

امریتا کی والدہ رخسانہ سلطانہ کانگرس کے ایک رہنما سنجے گاندھی کی دوست تھی۔ اگر رخسانہ سلطانہ جدید فیشن کی دلدادہ کے طور پر مشہور تھی، اس نے شہر کے ان علاقوں میں سنجے کے متنازعہ ''خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام'' کو متعارف کروانے میں اس کی مدد کی تھی جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ فاطمہ نے بھی ایک ملازمت حاصل کر لی تھی، اسے "Juvenile Court" میں ''مجسٹریٹ برائے کار خاص'' مقرر کیا گیا تھا۔ دہلی کے پرانے اور قدیم علاقے میں عموماً خواتین اکٹھی کام کرتیں۔ امریتا بھی اسی سکول میں تھی جہاں شہناز تھی۔ سکول کے بعد تینوں سہیلیاں اکٹھی ہو جاتیں۔ عام طور پر ان کا ٹھکانا امریتا کا پرآسائش گھر ہوتا۔ اس نے شاہ رخ خان کو تیراکی سکھانے کی کوشش کی اور اس مرحلے کے دوران اسے تقریباً ڈبو ہی دیتی۔ وہ گھنٹوں راتوں رات امیر ہونے کے سحر انگیز خوابوں میں محو رہتیں اور امیتابھ بچن کے متعلق باتوں میں وقت گزار دیتیں۔ امریتا نے بتایا کہ شاہ رخ خان امیتابھ بچن بننا چاہتا تھا اور میں بچن کی محبوبہ بننا چاہتا تھی۔ دونوں کی یہ خواہشیں پوری ہوئیں۔ بالآخر شاہ رخ خان نے امیتابھ بچن سے ''کامیاب اور عظیم اداکار'' کا خطاب لے کر اپنے سر پر سجا لیا اور امریتا ایک اداکارہ بن گئی جس نے کئی فلموں میں شاہ رخ خان کے ساتھ رومانوی کردار ادا کیے۔

لیکن اس وقت ان کے لیے یہی امر باعث اطمینان و خوشی تھا کہ وہ سینما ہال کی سب سے آگے والی سستی نشستوں پر بیٹھ کر امیتابھ کی فلمیں دیکھ لیتے جن کی قیمت فی کس ایک روپیہ پچھتر پیسے (ایک سینٹ سے بھی کم) تھی کیونکہ مہنگی ٹکٹیں خریدنے کی ان میں استطاعت نہ تھی پھر اس کے بعد وہ امریتا کے گھر چلے جاتے ان فلموں پر سیر حاصل بحث ہوتی، ان کی نقالی کی جاتی۔ جب ان کی جیب میں رقم ہوتی تو امیتابھ کی فلموں کے صوتی حصے (Sound Tracks) خرید لیتے۔ وہ اس کے مکالمے یاد کرتے اور اس کے مقبول لہجے کی نقالی کرتے۔

سکول میں بھی نقل کی اس صلاحیت کے باعث شاہ رخ خان نے اپنے بہت سے پرستار پیدا کر لیے تھے۔ شاہ رخ خان کے استاد مختلف غیر نصابی تقریبات کے موقع پر اسے نئی ہندی فلموں کے اداکاروں کی نقالی کے لیے سٹیج پر مدعو کرتے۔ خاص طور پر فلمساز راج کپور اور فلم شعلے کے غنڈے گبر سنگھ کی نقالی کے لیے شاہ رخ خان بہت مشہور ہو چکا تھا۔ گھر میں شاہ رخ خان اور اس کے دوست برآمدے میں ڈرامہ کرتے۔ وہ ''ریڈی میڈ'' سٹیج بنانے کے لیے پردہ

تان لیتے۔ اکثر اوقات شاہ رخ خان مصنف، ہدایتکار اور مرکزی کردار کے فرائض سرانجام دیتا۔

سات یا آٹھ سال کی عمر میں شاہ رخ خان نے شعر کہنے شروع کر دیئے۔ وہ روزمرہ معمولات زندگی کے متعلق سادہ شاعری کرتا۔ شاہ رخ خان کی ایک خالہ چمکدار گلابی رنگ کی سرخی استعمال کرتی تھی۔ اس کے والد میر اپنے رومال سے پان کے پختہ داغ دھونے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ شاہ رخ خان نے اس پر ایک نظم لکھی:

لوگ کہتے ہیں میری آنٹی کے ہونٹ گلابی ہیں
میں کہتا ہوں میری آنٹی کی آنکھیں شرابی ہیں

شاہ رخ خان کے والد اس کی نظمیں ایک کاپی میں لکھتے جاتے۔ انہوں نے اردو کے عظیم شاعروں مرزا غالب، میر تقی میر کے شاندار قصے کہانیوں کے ذریعے شاہ رخ خان میں شاعری کی رغبت میں مزید نکھار پیدا کیا۔ میر نے اپنے بیٹے میں شاعری کا شوق مزید بڑھانے کے لیے ایک بے ہودہ شاعر چرکین کے متعلق بھی بتایا جس نے صرف ایک موضوع انسانی چہروں کے متعلق قدرے اچھی شاعری کی۔ اس وقت شاہ رخ خان کو یقین ہو گیا تھا کہ ایک ''رومانی ہیرو'' کے طور پر اس کی عملی کامیابی کا آغاز ہو چکا ہے جو مکمل طور پر نہ سہی لیکن کم از کم ایک حد تک تو ''بے لوث اور بے غرض رومان اور محبت و چاہت کی خواہش'' کی صورت میں ظاہر ہو چکی ہے۔ ایک دفعہ اس نے کہا: ''درحقیقت میں ایک شاعر ہوں شاید ایک مادہ پرست شاعر لیکن بہر حال میں ایک شاعر ہوں۔''

شاہ رخ خان چھابرا رام لیلا کا بھی ایک حصہ تھا۔ رام لیلا رزمیہ داستان رامائن کی نئی شکل ہے۔ یہ دسہرا نامی ایک تہوار کا حصہ ہے جو عموماً ستمبر کے آخر میں آتا ہے اور دس سروں والے شیطان دیوتا پر رام دیوتا کی فتح کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ دہلی کے میدانوں میں راون اور اس کے دو بھائیوں میگھناتھ اور کھمباکرن کے عظیم الجثہ پتلے کھڑے کر دیے جاتے ہیں اور تہوار کے آخری روز انہیں آگ لگا دی جاتی ہے۔

دسہرے کا تہوار دس روز تک منایا جاتا ہے۔ اس دوران رامائن کو ڈرامے کی شکل میں اکثر اوقات شاموں کو کھیلا جاتا ہے اور اس کا عظیم الشان انتقام اس وقت ہوتا ہے جب راون ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ نیکی اور بدی کی اس کائناتی جنگ میں رام دیوتا کی مدد ''وانر سینا'' یعنی بندروں

کی نوج کرتی ہے۔ شاہ رخ کا کردار ''جنگجو بندر'' کا تھا۔ گھر کے نزدیک ایک کھلے میدان میں سٹیج بنا لیا جاتا اور اداکار رات گئے تک اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔ میر اور فاطمہ نے کبھی اعتراض نہ کیا۔ اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے اس ''سینما ہال'' میں شاہ رخ خان اداکاری کرکے بہت ہی خوش ہوتا۔

ضروری نہیں تھا کہ اداکاری میں جذباتی رنگ بھرا جائے یا ہو بہو الفاظ ادا کیے جائیں۔ ''وانر سینا'' کا کام صرف یہ تھا کہ وہ کیلے کھائے اور راون کی سلطنت 'لنکا' کی طرف پیش قدمی کرے اور ساتھ یہ نعرہ بھی لگائے ''رام دیوتا کی جے، ہوا کے بیٹے 'ہنومان' کی جے۔'' سٹیج کے پیچھے ایک ہڑ بونگ کا عالم ہوتا تھا۔ راون کا کردار ادا کرنے والا اداکار اکثر اوقات شراب پی لیتا تاکہ کردار کے مطابق منحوس قہقہے ''ہو، ہا، ہا'' میں مزید تاثر پیدا کیا جا سکے۔ بعض اوقات ایک مرد اداکار رام دیوتا کی بیوی سیتا کا کردار ادا کرتا۔ ڈرامے کے دوران بے انتہا شور اور غل غپاڑا مچا ہوتا حتیٰ کہ میک اپ بھی اسی انداز کا ہوتا۔ سرد راتوں میں بچے، گچک اور ریوڑیاں اتنی زیادہ کھا جاتے کہ ان کے پیٹ میں جگہ نہ رہتی۔ شاہ رخ خان کو یہ سب کچھ بہت پسند تھا۔ بعض اوقات ڈرامے کے مناظر کے دوران وقفوں میں وہ تھکے ماندے ناظرین کا اپنی شاعری سے دل بہلاتا۔ بعض اوقات ناظرین بھی ایک ذہین بچے کو ایک یا دو روپے دے دیتے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اسے اداکاری کے لیے معاوضہ ادا کیا گیا۔

❁

چوتھا باب

غیر مقبوضہ علاقہ

1980ء میں میر اپنے چودہ سالہ بیٹے شاہ رخ خان کو اپنے ساتھ پاکستان لے کر آئے۔ یہ ان کا دوسرا دورہ تھا۔ مسلسل درخواستوں کے بعد پاکستانی حکام نے بالآخر میر کو 1970ء کی دہائی میں پاکستان آنے کی اجازت دے دی۔ اس سے پہلے انہوں نے اپنی بہن کی وفات اور بعد میں اپنے بھائی کی وفات پر، جن کی عرفیت ''کنوارہ'' تھی کیوں کہ انہوں نے شادی نہیں کی تھی، کے مواقعوں پر پاکستان آنے کی اجازت طلب کی تھی لیکن حکومت پاکستان کی جانب سے مشتبہ قرار دیے جانے والے حریت پسند کی دونوں درخواستیں مسترد کر دی گئیں۔ پاکستانی حکام انہیں پاکستان آنے کی اجازت دینے پر اس وقت آمادہ ہوئے جب میر نے یہ درخواست پیش کی کہ انہیں اپنے افراد خانہ سے ملاقات کی اجازت دی جائے یہ نہ ہو کہ یہ افراد بھی اس دنیائے فانی سے کوچ کر جائیں۔

سفر بہت طویل اور دشوار تھا۔ باپ اور بیٹے نے پہلے تو ریل گاڑی کے ذریعے امرتسر تک کا سفر کیا اور پھر ایک چھوٹے سے سرحدی قصبے اٹاری پہنچے۔ یہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سڑک کے راستے آمد و رفت کا واحد راستہ تھا۔ میر اور شاہ رخ خان دونوں ممالک کے درمیان سرکاری طور پر واقع ''غیر مقبوضہ علاقے'' کے راستے سے چلتے ہوئے واہگہ پہنچے اور پھر وہاں سے پشاور کے لیے عازم سفر ہوئے اور میر کے آبائی گھر پہنچ گئے۔ راستے میں میر اپنے بیٹے شاہ رخ خان کو اپنے بچپن کے قصے سناتے رہے اور یہ بھی بتایا کہ شاہ رخ ان کے بھائی ''کنوارہ'' سے کس قدر مشابہ ہے جس میں نقالی کا جوہر موجود تھا اور وہ عملی طور پر مذاق کیا کرتا تھا۔

جب میر پہلی دفعہ پاکستان آئے تو اس وقت شاہ رخ کی عمر بارہ سال تھی اور اس کی یادیں بہت خوشگوار تھیں۔ آبائی حویلی بہت ہی وسیع اور کشادہ تھی اور وہاں بے شمار افراد آباد

تھے۔ کئی نسلیں مشترکہ خاندان کی حیثیت سے رہائش پذیر تھیں۔ شاہ رخ خان کی اپنے کئی دور دراز کے رشتے داروں سے ملاقات ہوئی اور وہ اپنے ہم عمر عم زادوں کے ساتھ کھیلتا کودتا رہا۔ اس کے سب سے قریبی عم زاد منصور خان میر نے اپنی یادیں دہراتے ہوئے کہا کہ شاہ رخ خان زنانہ کپڑے پہن کر آنکھوں میں کاجل لگا کر اور بالوں میں پھول سجا کر اپنے افراد خانہ کے لیے تفریح اور دل بہلانے کا سامان مہیا کرتا تھا۔ شاہ رخ خان کی بہت سی خوبصورت اور گوری خواتین عم زاد بھی تھیں۔ وہ اپنا سر ڈھکے بغیر گھر سے باہر نہیں نکل سکتی تھیں لیکن گھر میں انہوں نے اچھا خاصا میک اپ کیا ہوتا تھا۔ وہ شاہ رخ خان کو گنجان بازاروں میں لے جاتیں۔ اس نے پاکستانی فلمیں بھی دیکھیں اور درہ خیبر کا سفر بھی کیا لیکن جب دوسری دفعہ شاہ رخ خان اپنے والد کے ساتھ پاکستان آیا تو ان کے لیے ان کے خاندان کی محبت میں کمی واقع ہو چکی تھی۔ ایک مشترکہ دوست نے شاہ رخ خان کو خبردار کیا کہ اس کے عم زاد اس کے ساتھ صرف اس لیے محبت جتلاتے تھے کہ میر پاکستان میں اپنی جائیداد سے دستبردار ہو کر ان کے حوالے کر دیں۔

شاہ رخ خان اس نظریے پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن جب وہ سرحد پار واپس پہنچے تو اسے اپنے والد کی آنکھوں میں خفگی کے آثار نظر آئے۔ اب میر نے پشاور میں اپنا خاندان اور اپنی گزشتہ زندگی چھوڑ کر اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے دہلی میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب وہ ظاہری اور عملی طور پر ''خلا میں معلق'' تھے۔ پاکستان کے سفر سے چند ماہ بعد میر بیمار ہو گئے۔ شاہ رخ خان کا خیال تھا کہ اسی سال کے آخر میں اس کے والد کی وفات کا سبب کینسر سے زیادہ ''غم'' تھا۔

میر کی زبان پر نمودار ہونے والا آبلہ جب کئی ماہ تک موجود رہا تو انہوں نے ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ ڈاکٹر نے ''منہ کے کینسر'' کی تشخیص کی۔ میر کی زبان سے خون بہنے لگا تھا۔ وہ کھا بھی نہیں سکتے تھے اور جلد ہی وہ چلنے سے بھی معذور ہو گئے۔ چھ ماہ کے اندر ہی یہ خوبصورت اور دلکش شخص ہڈیوں کے ڈھانچے میں تبدیل ہو گیا جو درد کی تکلیف کے باعث خمیدہ ہو چلا تھا۔ حاجات ضروریہ سے فارغ ہونے کے لیے انہیں اٹھا کر لے جایا جاتا۔ بعض اوقات ان کے منہ سے خون پرنالے کے مانند بہنے لگتا اور دو فٹ دور دیواریں چھینٹوں سے سرخ ہو جاتیں۔

ابتدا میں میر نے اپنی وصیت تحریر کی لیکن جب مرض نے ان کے بدن کو بالکل بے بس کر

دیا تو ان کی تحریر میں بھی لرزش آ گئی۔ وہ اس قدر زیادہ کمزور ہو چکے تھے کہ پنسل بھی اٹھانے سے قاصر تھے۔ پھر شاہ رخ خان اور اس کے والد کے درمیان اشاروں کنائیوں میں بات ہونے لگی اور وہ پہیلیوں پر مشتمل ایک دلخراش اور افسوسناک کھیل کھیلنے لگے۔ یہ ایک عجیب و غریب صورتحال تھی کہ جہاں ایک بیٹا حرکات و سکنات کے ذریعے اس شخص سے بات کر سکتا تھا جو سن سکتا تھا لیکن شاید دونوں خاموشی کو ہی بہتر سمجھتے تھے۔ جوں جوں زندگی کی اس کہانی کا اختتام قریب نظر آ رہا تھا میر کے لیے اشاروں میں بھی بات کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔

ایک قلیل عرصے میں ہی میر کا بدن ہڈیوں کے ڈھانچے میں تبدیل ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود شاہ رخ یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اس کے والد زندہ نہیں رہیں گے۔ جب ڈاکٹر اس کے والد کے منحنی بدن کے طبی معائنے کے لیے اسے نوچتے کھسوٹتے تو اسے بڑا قلق ہوتا۔ ہسپتال کے جس کمرے میں میر کو رکھا گیا تھا وہ بدبو اور سڑاند سے بھرپور تھا۔ اس کمرے میں تین مزید مریض بھی موجود تھے اور ایک بستر کسی غیر متوقع مریض کے لیے خالی رکھا گیا تھا۔ شاہ رخ کو یقین تھا کہ اس کے والد بہت ہی بہادر اور جرات مند انسان ہیں جو اس بیماری کو بالآخر شکست سے دوچار کر دیں گے۔ اپنی موت سے ایک دن قبل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میر واقعی صحت مند ہو رہے ہیں۔ انہیں ہسپتال سے واپس گھر بھیج دیا گیا تھا۔ گھر میں انہوں نے اپنی ڈاڑھی بنائی اور کچھ آئس کریم کھائی۔ کیمیاوی علاج کے باعث ان کے رخسار پر پڑے نیلے نشان مدھم ہونے لگے تھے اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ بہتر محسوس کر رہے تھے۔

حتیٰ کہ جب میر کو دوبارہ بیماری کے حملے کے باعث فوری طور پر صفدر جنگ ہسپتال لے جایا گیا تو اس وقت شاہ رخ خان پرسکون اور مطمئن تھا کیونکہ اب تک وہ ہسپتالوں کے اس معمول سے واقف ہو چکا تھا۔ تمام دن شاہ رخ خان اپنے والد کے پاس ہسپتال نہیں گیا لیکن 19 ستمبر کو صبح دو بجے ایک نرس نے دیگر افراد خانہ کو میر کی موت کی اطلاع دی۔ فاطمہ نے شاہ رخ خان کو اس خبر سے فوری طور پر مطلع نہ کیا۔ اس نے کہا میر ان سے ملاقات کے خواہشمند ہیں۔ اس دفعہ وہ ہسپتال کے ایک دوسرے کمرے میں تھے، ان کا منہ قدرے کھلا ہوا تھا اور ان کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ ان کے بدن کو یخ بستہ کر دیا گیا تھا۔ شاہ رخ نے ان کے بدن میں قدرے حرارت پیدا کرنے کے لیے ان کے تلووں کو بری طرح رگڑا۔ اپنے والد کے کان میں بہتے ہوئے خون کا منظر اسے اپنی تمام زندگی بھی بھول نہیں پایا۔ فاطمہ اور شاہ رخ علی الصبح واپس

گھر لوٹ آئے۔ ڈرائیور کو وہیں چھوڑ دیا گیا اور شاہ رخ نے اپنی فیٹ کا سٹیرنگ سنبھال لیا۔

جب فاطمہ نے اس سے پوچھا کہ اس نے گاڑی چلانا کب سیکھی تو اس کا جواب تھا: ''ابھی چند لمحے پہلے!''

جب میر کے جسد خاکی کو قبر میں اتارا جا رہا تھا تو اس وقت ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ان کے ایک پرانے خاندانی دوست بھوانی مل ماتھر کا کہنا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت خود بھی ایک اچھے اور نفیس انسان کے نقصان پر رو رہی ہے۔ فاطمہ کی دنیا اور دل سب کچھ ویران ہو چکا تھا لیکن اس میں اس قدر استطاعت نہیں تھی کہ وہ میر کے غم میں اب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہے۔ اس کے پاس بہت کم جمع پونجی تھی اور دو بچوں کی پرورش کی ذمہ داری اس کے سر پر تھی۔ اپنی شادی کے وقت فاطمہ خود اپنے لڑکپن میں تھی۔ معصوم اور متلون مزاج۔ وہ اب ذاتی طور پر اس قدر منتشر اور بکھر چکی تھی کہ اسے اپنے گھربار پر توجہ دینا مشکل نظر آ رہا تھا لیکن زندگی کے تجربات نے اسے ایک ایسی مضبوط اور پرعزم خاتون میں تبدیل کر دیا تھا جس نے اپنے خاوند کی بے وقت موت کے باعث اپنے گھرانے کو تباہ ہوتے دیکھنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس وقت فاطمہ پہلے ہی مجسٹریٹ کی حیثیت سے کام کر رہی تھی، اس نے خاندانی کاروبار کے مفادات کی ذمہ داری سنبھال لی اور ''خاطر'' نامی ایک ریستوران اور تیل کی ایک ایجنسی کا انتظام و انصرام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

میر کے باعث شہناز کی زندگی بکھر گئی۔ بچوں کی حیثیت سے شہناز اور شاہ رخ کے مزاج مختلف تھے۔ شاہ رخ میں جذبہ اور ولولہ موجود تھا اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے وہ نہایت پختہ عزم اور ارادے کے ساتھ قدم اٹھاتا تھا۔ شہناز من موجی اور ہر کام اندھا دھند کرنے کی عادی تھی۔ وہ عملی زندگی سے زیادہ خوابوں کی دنیا میں خوش اور مطمئن رہتی تھی۔

شاہ رخ خان کی نسبت لالہ رخ میر کے زیادہ قریب تھی۔ میر نے خاص طور پر اس کا درمیانی نام ''لالہ رخ'' منتخب کیا تھا جس کا مطلب ہے ''پھول کے مانند خوبصورت۔'' میر کو یہ نام اس قدر پسند تھا کہ جب کنہیا لال کی بیٹیاں پیدا ہوئیں تو انہوں نے کنہیا لال کو یہ نام رکھنے کے لیے کہا لیکن کنہیا لال کے خیال کے مطابق یہ نام اس کے دیہاتی ماحول کے لحاظ سے بہت ہی بدیسی اور نامانوس تھا جب میر نے اپنی بیٹی کا نام لالہ رخ رکھا تو انہیں بے حد خوشی ہوئی تھی۔ اپنے نام کے مطابق شہناز ایک دلکش اور پیاری خاتون تھی۔ اس کی غلافی آنکھیں اور گورا رنگ

بہت سوں کو اس کی طرف متوجہ رکھتا تھا۔

میر کی بیماری کے دور میں شہناز لیڈی شری رام کالج کی طالبہ تھی۔ میر نے اصرار کیا تھا کہ وہ کالج کی اقامت گاہ (ہوسٹل) میں رہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اقامت گاہ میں رہنے کا تجربہ ایک اضافی تعلیم ہے۔ کالج کی اقامت گاہ میں رہائش کے باعث شہناز اپنے باپ کی بیماری اور ٹوٹ پھوٹ کے باعث پیدا ہونے والی پریشانی اور اضطراب سے محفوظ رہی تھی۔ جب میر کی وفات ہوئی تو شاہ رخ خان شہناز کو کالج سے لانے کے لیے گیا۔ فاطمہ نے اسے ہدایت کی تھی کہ میر کی وفات کے بارے میں شہناز کو نہ بتائے۔ رکشے کے سفر کے دوران زیادہ وقت وہ شہناز سے نظریں چراتا رہا۔ وہ جب گھر پہنچی تو اسے خبر نہ تھی کہ اس کے والد فوت ہو چکے ہیں۔ اس وقت وہ صفدر جنگ کے ایک نہایت ہی تنگ مکان میں رہائش پذیر تھے۔ جب شاہ رخ خان اور شہناز دوسری منزل پر واقع اپنے چھوٹے سے گھر پہنچے تو شہناز کو گھر میں کچھ کھلبلی اور افراتفری سی محسوس ہوئی۔ اس نے شاہ رخ سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے تو شاہ رخ خان نے میر کی علالت کے بارے میں اسے کچھ بتانے کی کوشش کی۔ جب شہناز گھر میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ اس کے والد کی میت چھوٹے سے رہائشی کمرے کے وسطے میں بے حس و حرکت سفید کفن میں لپٹی پڑی ہے اور اردگرد کھڑی عورتیں ماتم اور بین کر رہی ہیں۔ یہ دیکھتے ہی شہناز ایسے ڈھے گئی جیسے کسی درخت کو کلہاڑے سے کاٹ کر نیچے پھینک دیا گیا ہو۔ اس کے گرنے سے فرش پر پڑے ہوئے پانی کے گلاس ٹوٹ گئے۔ کافی دنوں تک شہناز کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہیں بہا بلکہ وہ ایک ایسے صدمے اور جذباتی انتشار کا شکار ہو گئی جس سے وہ کبھی مکمل طور پر باہر نہ آ سکی۔

اس وقت شاہ رخ کی پندرہویں سالگرہ میں دو ہفتے باقی تھے۔ اس نے پھر کبھی شعر نہیں کہے۔ اب چونکہ ان شعروں کو تحریر کرنے والے میر موجود نہیں تھے اب یہ شوقیہ اور معمولی شعر و شاعری کچھ خاص اہمیت کی حامل نہ تھی۔ شاہ رخ بہت ہی غم زدہ، مایوس، دل گرفتہ اور غیض و غضب کی حالت میں تھا لیکن کسی تاخیر کے بغیر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اس کی آٹھویں جماعت کی استانی سیتھا وینکا ٹشواران اپنی یادیں کریدتے ہوئے بتاتی ہے: ''وہ ایسا طالب علم نہیں تھا کہ سکول سے غیر حاضر ہو اور اس کی والدہ ایسی خاتون نہیں تھی کہ وہ اسے گھر ہی میں رکھتی۔ اس میں آگے بڑھنے کا جذبہ موجود تھا۔''

St. Columba's School نامی سکول جہاں جنوری 1972ء میں شاہ رخ خان چھ سال کی عمر میں کنڈرگارٹن میں داخل ہوا تھا ایک اہم تعلیمی ادارہ ہے جو دہلی کے جنوب میں کئی ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اسے "Indian Province of the Congregation of Christian Brothers" نے 29 اپریل 1941ء کو قائم کیا تھا اور یہاں صرف بتیس طلبہ موجود تھے۔ اس کی وسعت اور کشادگی کے باعث اس کی شہرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ 1955ء تک طلبہ کی تعداد دو ہزار دو سو ہو چکی تھی اور ایک نئی عمارت بھی تعمیر کی گئی تھی۔ آئرش برادرز اپنے سکول میں نظم و ضبط کی سخت پابندی کے باعث مشہور تھے اور 1980ء کی دہائی کے اواخر تک اس سکول میں جسمانی سزا کا استعمال جاری تھا۔ چھوٹے بچوں کو چوتڑوں پر مارا جاتا تھا اور بڑے بچوں کی کمر پر بید برسائے جاتے تھے۔ چند چھڑیاں لگنے سے مراد یہ ہوتی تھی کہ تمام دن سویٹر یا بیگ پر بیٹھ کر زخموں کو سینکا جائے۔ زیادہ بڑے بچوں کی انگلیوں کے جوڑوں اور انگلیوں کی پوروں پر چھڑیاں ماری جاتی تھیں۔ موسم سرما کے ٹھنڈے دنوں میں ٹھٹھری ہوئی انگلیوں پر بید لگنے کے باعث فوری طور پر آبلے نمودار ہو جاتے۔ سکول میں آئرش برادرز نے بید اپنے لبادوں میں چھپائے ہوتے تھے جیسے ہی کوئی طالب علم کسی قاعدے اور قانون کی خلاف ورزی کرتا تو فوری طور پر بید سے سزا دی جاتی جو بہت خوفناک ثابت ہوتی۔

سکول میں ایک قانون یہ بھی تھا کہ ناخن اور بال کٹے ہونے چاہئیں۔ اگر کسی طالب علم کے بال مقررہ حد سے لمبے ہوتے تو اسے فوراً سکول کے نزدیک گول مارکیٹ کے کنارے بیٹھے ہوئے حجام کے پاس بھیج دیا جاتا۔ شاہ رخ کے بال بہت گھنے تھے اور لمبے ہو جانے پر اسے اکثر اس حجام کے پاس جانا پڑتا۔ ابھی صبح کے ساڑھے سات بجے ہوتے اور عام طور پر حجام اسی وقت ہی اٹھتا۔ وہ نیند سے بیدار ہونے کے بعد جمائیاں لے رہا ہوتا اور اس کی آنکھیں مکمل طور پر خوابیدہ ہوتیں لیکن وہ بال کاٹنے سے قبل ہمیشہ ایک ہی سوال کرتا: ''تم کس طرح کے بال بنوانا چاہتے ہو، دھرمیندر کے مانند یا امیتابھ بچن کے مانند۔'' سالوں بعد شاہ رخ خان کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ اس وقت ہی بڑا اداکار بن چکا تھا جب حجام کے مطابق لوگ اس سے شاہ رخ خان کی طرز کے بال بنانے کی فرمائش کرتے تھے۔

سینٹ کولمبا میں بیدوں اور چھڑیوں سے لدے پھدے پادریوں اور سخت قواعد و ضوابط کی موجودگی بھی شاہ رخ کو اپنی عادت سے باز نہ رکھ سکی۔ اسے شوخیوں اور شرارتوں میں بہت

مہارت حاصل تھی۔ اس کی بہترین شرارتیں، عقلمندی، دانش، خوشگوار گستاخی کا مرقع ہوتیں اور عام طور پر وہ اس ضمن میں اپنی اداکاری کی پیدائشی صلاحیتیں کام میں لاتا۔ جب وہ نویں جماعت میں تھا تو اس نے اپنی خاتون استاد کو قائل کرنے کے لیے کہ اس کے والدین اور سکول انتظامیہ نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ''کالیا'' نامی فلم سے امیتابھ بچن کا بولا ہوا ایک مکالمہ استعمال کیا۔ اس کی استاد اس سے قدرے ہمدردی رکھتی تھی۔ اپنی استاد کی نازک طبع کو دیکھتے ہوئے وہ اسے کہتا کہ وہ آئندہ اسے کسی آزمائشی امتحان میں شرکت سے مستثنیٰ قرار دے دے: ''میرے لیے تو اوپر بھگوان ہے اور نیچے آپ ہیں درمیان میں یامراج (موت کا دیوتا) تلوار لیے مجھ پر حملے کر رہا ہے۔'' اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی استاد ہی وہ واحد فرد تھی جو اسے مصیبت سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔ استانی نے اس کا اشارہ سمجھ لیا اور اسے آزمائشی امتحان میں شرکت سے معاف کر دیا۔

گیارہویں جماعت تک شاہ رخ خان مزید دلیر اور شرارتوں میں مزید ماہر ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ جب جماعت میں اکتاہٹ اور بیزاری ناقابل برداشت ہو چکی تھی، اس نے ایک رزمیہ داستان کی نقالی شروع کر دی۔ وہ فرش پر گر گیا اور بے ہوش ہو گیا اور اس کے منہ سے جھاگ نکلنا شروع ہو گئی۔ اس کے دوستوں نے استانی کو قائل کر لیا جو سویڈ کے جوتے پہنے ہوئے تھی کہ شاہ رخ خان کو ہوش دلانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اسے سویڈ کے جوتے سنگھائے جائیں۔ استانی نے فوراً اپنا ایک جوتا اتار کر دے دیا۔ بالآخر اس کے دوست اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے بہانے باہر لے گئے اور ساتھ ہی سویڈ کا جوتا بھی سکول سے باہر چلا گیا۔ شاہ رخ اور اس کے دوست سکول کے باہر آوارہ گردی کرتے رہے اور استانی تمام دن سکول میں ایک جوتا پہن کر پھرتی رہی۔

بعض اوقات جب شاہ رخ خان کی شوخیاں اور شرارتیں حد سے بڑھ جاتیں تو اس کی والدہ فاطمہ کو سکول کی انتظامیہ بلا لیتی تا کہ اس کے آوارہ گرد بیٹے کے متعلق گفتگو کی جا سکے لیکن شاہ رخ خان اپنی شوخیوں اور شرارتوں میں اس قدر زیادہ نہیں بڑھا کہ اسے سکول سے خارج کر دیا جاتا۔ شاہ رخ خان نے اپنے سکول کے زمانے میں ہاکی، فٹ بال اور کرکٹ کھیلی اور بہت سی کھیلوں میں سکول کی قیادت کی۔ اس کے مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر نے ایک دفعہ کہا تھا: ''وہ چوکے لگانے میں ماہر تھا۔'' برادر ایرک ڈی سوزا نے کہا: ''لیکن وہ اس قدر ہوشیار اور ماہر

تھا کہ وہ اونچے اونچے چوکے لگاتا لیکن اس کا گیند کبھی پکڑا نہ جاتا۔"

برادر ڈی سوزا St. Columba's میں کل وقت "راک سٹار" تھا۔ وہ ایک استاد اور پادری کی تعریف پر پورا اترتا تھا اور شاہ رخ کی زندگی پر اس کے معنی خیز اثرات مرتب ہوئے تھے۔ ایرک کے بال لمبے تھے اور وہ گٹار بجاتا تھا۔ وہ سکول میں بے شمار ہم نصابی سرگرمیوں کا نگران تھا۔ وہ سکول کے بعد طلبہ کے ساتھ گھل مل جاتا، ان کے مسائل سنتا اور ان کے ساتھ ہمدردانہ طرز عمل کا مظاہرہ کرتا۔ طلبا اس کے کمرے میں اکٹھے ہو کر موسیقی کا سبق سیکھتے، موسیقی سے لطف اندوز ہوتے اور اس سے حکمت و دانائی کی باتیں سنتے۔ ایرک انہیں تازہ ترین مغربی کامیاب ترین کتابوں اور فلموں سے بھی متعارف کرواتا۔ وہ ہر طالب علم کو اس کے پہلے نام سے یاد رکھتا تھا۔ اس کا زرخیز دماغ نئے، ولولہ انگیز اور تخلیقی خیالات سے مرصع ہوتا تھا۔ ایرک نے سکول میں کمپیوٹر بھی متعارف کروایا اور طلبہ کے لیے بذات خود ایک نصابی کتاب تصنیف کی۔

لیکن یہ پادری سخت سزا میں کمی کا قائل نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ طلبہ تعلیمی لحاظ سے بہترین کامیابی حاصل کریں اور جب طلبہ اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال نہ کرتے تو پھر وہ بید سے ان طلبہ کی پٹائی کرتا۔ اگر کوئی طالب علم سو میں سے پچانوے نمبر حاصل کرتا تو وہ پھر قدرے مطمئن ہوتا کیونکہ سو میں سے نوے نمبر اسے مطمئن کرنے کے لیے کافی نہ ہوتے۔ سکول کے بعض طلبہ اسے "کوا" کی عرفیت سے پکارتے تھے کیونکہ اس کی ناک خمیدہ تھی اور بدن کی جلد کا رنگ سیاہ تھا۔ ہر وقت اس کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ طلبہ خود میں سوچ بچار اور غور و فکر کی عادت پیدا کریں اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی اپنی صلاحیتوں کے ذریعے مہارت پیدا کریں۔ وہ طلبہ کے لیے بیک وقت ایک ڈراؤنا خواب اور مثالی کردار تھا۔

1983ء میں ایرک نے اپنے ڈرامے میں شاہ رخ خان کو مرکزی کردار کے لیے منتخب کیا۔ یہ کردار ایک ساحر کا تھا جو "Wizard Of Oz" سے ماخوذ موسیقی سے بھرپور ڈرامے The Wiz کا ایک حصہ تھا۔ مرکزی کردار کے انتخاب کے لیے شدید مقابلہ تھا لیکن شاہ رخ خان یہ مرکزی کردار حاصل کرنے میں اس لیے کامیاب ہو گیا کیونکہ بقول ایرک "وہ ہر قسم کا کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسے خود پر اس قدر اعتماد ہے کہ اگر ضروری ہو تو "احمقانہ" کردار بھی بخوبی ادا کر سکتا ہے۔" شاہ رخ خان کو خود پر اس قدر اعتماد تھا کہ اس نے اس موسیقی بھرے ڈرامے میں نغمہ سرائی کی کوشش کی لیکن اسے جاری نہ رکھ سکا۔ ایرک کی آواز بلند

اور گونجدار تھی۔ وہ اور ایک طالب علم پالاش سن، جو ایک مشہور گلوکار کی حیثیت سے ابھرا، شاہ رخ خان کے لیے پہلے گلوکار تھے یعنی اصل گانا وہ گاتے تھے اور شاہ رخ خان صرف ہونٹ ہلاتا تھا۔

شاہ رخ خان کے سکول کے ایام کا قابل ذکر واقعہ ایک "گینگ" (گروہ/ٹولہ) کا قیام تھا۔ 9 ستمبر 1984ء کو اٹھارہ سالہ شاہ رخ خان اور اس کے چار قریبی دوستوں نے "سی گینگ C-Gang" تشکیل دیا "سی C" سے مراد "کول Cool" یعنی امن، اطمینان، سکون جو اس گروپ کے قیام کا مقصد، نصب العین اور وجہ تھی۔ تمام لڑکے اس مقصد اور نصب العین کے لیے کام کرتے تھے۔ ویوک خوشالانی ایک دولتمند لڑکا تھا۔ اس کے باپ نے اس گینگ کے لیے امریکہ سے "ٹی شرٹس" منگوائیں۔ ہر ٹی شرٹ پر "C-Gang" کا نشان کندہ تھا اور پشت پر ہر رکن کا نام لکھا ہوا تھا۔ رامن شرما نامی ایک رکن لڑکے کی عم زاد نے، جو گرافک ڈیزائنر تھی، یہ نشان تیار کیا تھا۔ اس نے یہ ننھا سا لیکن واضح C-Gang سفید قمیصوں پر اس طرح مصور کیا تھا کہ سکول میں بھی ان کے خاص مرتبے کی نشاندہی ہو جاتی تھی۔ اس گروہ کے دیگر ارکان میں یکاش ماتھر اور شاہ رخ خان کا بہت ہی گہرا دوست اشوک وسان شامل تھے۔ سکول کے باہر "سی۔ گینگ" کی مقررہ وردی خاکستری رنگ کے نائیک جوتوں، نیلی جینز اور سفید ٹی شرٹ پر مشتمل تھی۔ لڑکوں نے اپنے شناختی کارڈوں کو پلاسٹک کی باریک تہ میں منڈھوا لیا تھا جو انہوں نے کوناٹ پیلس کی ایک دکان سے 25 روپے (پچاس سینٹ) فی کس کے حساب سے تیار کروائے تھے۔ ان پر متعلقہ فرد کی تصویر اور گینگ کے قیام کی تاریخ 9 ستمبر 1984ء نقش تھی۔

سکول کے بااختیار بھائیوں نے اس گینگ کو اس سکول میں بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت دے دی تھی کیونکہ ان کے خیال میں شاید ان کی زیادہ تر سرگرمیاں بے ضرر تھیں۔ اس وقت منشیات، الکوحل اور جنسی تعلقات کا دور دورہ نہیں تھا جو ایک دہائی بعد دہلی کا مقدر ٹھہرے۔ "سی۔ گینگ" کا مزاحمتی رویہ بھی صرف "امن، سلامتی، اطمینان" تک محدود تھا حتیٰ کہ جب لڑکے اپنے وضع کردہ قوانین کی خلاف ورزی کرتے تو ان کے اس عمل پر لاقانونیت کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ ایک رات یہ لڑکے اپنے اپنے گھروں سے یہ کہہ کر چلے گئے کہ وہ یہ رات دوسرے لڑکے کے گھر بسر کریں گے۔ کچھ گھنٹوں تک وہ دہلی کے ہوائی اڈے کے نزدیک جمبو پوائنٹ سے جہاز اترتے دیکھتے رہے پھر پولیس نے انہیں رات کو سڑک پر ہاکی کھیلتے ہوئے دیکھ لیا اور انہیں طلوع آفتاب تک گرفتار رکھا۔ یہ واقعہ ان کی نوعمری کے جذبے

اور ولولے کی آخری حد کی ایک مثال تھا۔

تمام پانچوں لڑکوں کا پس منظر مختلف تھا۔ رامن کا باپ پائلٹ تھا، ویوک کا والد ایک صنعتکار تھا جو تیل اور گیس کے کنوؤں کے لیے آلات تیار کرتا تھا لیکن ان کے درمیان یہ تفریق بہت کم زیر بحث آتی تھی۔ یہ سب لڑکے چنکیا پوری کے ایک کیفے میں چنکیا مووی تھیٹر کے تہہ خانے میں فی کس پچیس پیسے کے حساب سے ویڈیو کھیل کھیلتے۔ اس سیر و تفریح کے لیے وہ اپنے معمولی جیب خرچ میں سے حصہ ڈالتے۔ جب کبھی ان میں استطاعت ہوتی تو وہ قطب ہوٹل میں چائے/کافی پینے کے لیے چلے جاتے کیونکہ وہ فائیو سٹار ہوٹل میں جانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے اور کبھی کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ کس کا باپ زیادہ دولت مند ہے۔ لڑکے ''سی۔ گینگ'' کے مخصوص لباس میں ملبوس مختلف تقریبات میں چلے جاتے اور رقص کے لیے منتظر افراد کے سامنے مستانی چال چل کر اور ''بریک ڈانس'' کے ذریعے انہیں بھی رقص کے لیے مجبور کرتے۔ یہ لڑکے ہالی وڈ کی فلموں میں استعمال ہونے والی زبان ''یو۔ یا ؤزا'' اور ''ہینگ ٹن'' نہایت پسندیدہ انداز میں بولتے اور خوشی و لطف محسوس کرتے۔

اس زمانے میں نئے اور جدید طور طریقوں اور انداز و اطوار کا نہایت ہی محترم اور قابل اعتماد ذریعہ اور ماخذ ہالی وڈ تھا۔ معاشرے میں اعلیٰ سماجی مرتبے کے حصول کے لیے امریکی مصنوعات کا استعمال شدید خواہش کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ اس گروہ میں شامل تمام ارکان اس قدر دولت مند نہیں تھے کہ غیر ممالک جا سکیں۔ شاہ رخ خان بھی اٹھائیس برس کی عمر میں ہی غیر ممالک کا سفر کر سکا لیکن ملک بھر کے نوجوان امریکی فلموں کی بول چال، چال ڈھال اور دیگر طور طریقوں کی نقالی کر کے خوشی محسوس کرتے۔ بہر حال استہزائی صورتحال یہ تھی کہ ان میں سے زیادہ تر فلمیں معیار کے لحاظ سے دوسرے درجے کی تھیں اور تقریباً سب پرانی ہو چکی تھیں۔ امریکہ میں نمائش کے بعد ہالی وڈ کی فلمیں بارہ سے اٹھارہ ماہ بعد ہندوستان میں دکھائی جا سکتیں کیونکہ اس وقت درآمدات کے لیے بہت سخت قوانین نافذ تھے۔ اس صورتحال سے مراد یہ تھی کہ جب امریکی نوجوانوں میں کوئی فیشن پرانا ہو جاتا تو پھر ہندوستانی نوجوان اس فیشن کو اپنانے میں خوشی اور فخر محسوس کرتے۔

لیکن پھر بھی ہالی وڈ کی فلموں کی چکا چوند اور چمک دمک ہندوستانی فلموں سے کہیں زیادہ تھی۔ ہندوستانی فلموں کو دانستہ طور پر کم مقامات پر نمائش کے لیے پیش کیا جاتا تھا۔ ہندوستانی

شہروں میں موجود ذہین اور با صلاحیت نوجوانوں کے لیے ہندوستانی فلمی صنعت افیون کا درجہ رکھتی تھی جہاں ان کی صلاحیتیں نکھرنے کے بجائے کند ہو جاتی تھیں۔ اس گھمبیر اور حقارت آمیز صورت حال کی وجہ سب کو بخوبی معلوم تھی۔

1980ء کی دہائی ہندوستانی فلمی صنعت کے لیے ''سیاہ دور'' تھا جب ہر جگہ ناکامی اور مایوسی کا دور دورہ تھا۔ نئی فنی مہارتوں کی آمد کے باعث تفریحی ماحول اور فضا یکسر تبدیل ہو گئی تھی۔ ہر طرف انتشار اور افراتفری کا عالم تھا حتیٰ کہ کامیاب ترین فلمساز بھی کامیاب فلمیں بنانے میں مشکل محسوس کر رہے تھے۔ 1982ء میں ہندوستان میں رنگین ٹیلیویژن متعارف ہوا۔ اس کے بعد ویڈیو کیسٹ، ریکارڈر یا وی سی آر بھی جلد ہی آن موجود ہوئے۔ زندگی میں پہلی بار ناظرین و سامعین کو بے شمار متبادلات سے مستفید ہونے کا موقع حاصل ہوا۔ اب صرف فلمیں ہی آخری انتخاب نہیں رہ گئی تھیں۔ 85-1984ء کے سال کے دوران رنگین ٹیلی ویژن کی صنعت میں 140 فیصد اضافہ ہوا۔ اب ایک مخصوص طبقے کے لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ فلمیں دیکھنے کے لیے سینما گھروں میں جانا قطعی طور پر غیر ضروری اور ناخوشگوار ہے۔

اس طبقے کے لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال کر سینما گھر لے جانے کے لیے بہت کم کشش موجود تھی۔ ہندوستانی فلمی صنعت ایک ایسا سمندر تھی جہاں فنکاروں کی صلاحیتیں غرق ہو رہی تھیں۔ امیتابھ بچن ابھی ہندوستانی فلموں پر راج کر رہا تھا۔ ملک کے سرکردہ ہفتہ وار اخباری جریدے ''انڈیا ٹوڈے'' نے امیتابھ بچن کو ''فردِ واحد کی صنعت'' قرار دیا تھا لیکن فلمی صنعت کے اس دیو قامت مجسمے نے تخلیقیت کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ امیتابھ کے ہدایتکار جو اس کے ''کامیاب ترین اور عظیم'' اداکار'' کے کردار میں تحریف کرنے سے خوفزدہ تھے اس وقت تک ''اینگری ینگ مین'' کی ترکیب استعمال کرتے رہے جب تک یہ طریقہ فرسودہ اور ناکام ثابت نہیں ہوا۔ ایک دہائی پر مشتمل امیتابھ بچن کے شاندار دور کے بعد موسیقی اور نغمات ثانوی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ مرکزی مناظر کے درمیان وقفے پر کرنے کے لیے نغمات سے کام لیا جانے لگا۔ امیتابھ کی فلموں میں خوبصورت اور حسین کنواری ہیروئنوں کی حیثیت اس قدر کم ہو گئی تھی کہ تشدد اور مار دھاڑ کے مناظر کے دوران ناظرین کو صوتی آرام و سکون پہنچانے کے لیے انہیں پیش کر دیا جاتا تھا۔ فلموں کے ناموں سے ظاہر ہوتا تھا کہ کس طرح عالمی سطح کے ایک اداکار کو گھسے پٹے اور فرسودہ کردار ادا کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا مثلاً دیش پریمی، اندھا قانون،

انقلاب، آخری راستہ اور شہنشاہ۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کیا ناظرین پر مسلط کردہ طمانیت یا پھر ناظرین کی لاتعلقی نے فلمسازوں کو مجبور کیا کہ وہ ناظرین کو اس سے بھی زیادہ تفریح، طمانیت اور سکون پہنچانے کا اہتمام کریں۔ اس وقت سینما گھروں کے ناظرین زیادہ تر ان افراد پر مشتمل ہوتے تھے جنہیں فلمی صنعت کی کاروباری زبان میں ''اگلی نشستوں کے ناظرین'' کہا جاتا تھا۔ ان ناظرین کو خالص مار دھاڑ اور بلند آواز میں جذباتی اداکاری/ مکالمہ بازی پسند تھی۔

ہدایتکاروں کی ایک کثیر تعداد...... جنہوں نے بنیادی طور پر جنوبی ہندوستان کی تامل فلمی صنعت میں کام کیا تھا ''اگلی نشستوں کے ناظرین'' کا خاص خیال رکھتے تھے اور فلم بناتے وقت ان کے مزاج اور خواہش کو مدنظر رکھتے تھے۔ 1982ء کے بعد سے ہندی فلموں میں زرق برق، بھڑکیلے اور چکا چوند مناظر کا سیلاب آ گیا۔ حالانکہ ہندی فلمی صنعت نے کبھی بھی غیر معیاری فلموں پر سمجھوتہ نہیں کیا تھا لیکن پھر بھی یہ فلمیں کامیاب ہونے لگیں۔ مثال کے طور پر ''ہمت والا'' جنوبی ہند میں تیار ہونے والی فلموں کے انداز کے لحاظ سے بہت ہی کامیاب فلم ثابت ہوئی جس میں ایک بہت ہی خوبصورت رومانوی نغمہ شامل کیا گیا تھا۔ اس طرح بعد میں آنے والی فلموں میں بھی رومانی جذباتی مناظر اور خوبصورت ترین علاقے بنیادی عنصر کی حیثیت سے موجود رہے لیکن یہاں بھی مرکزی کرداروں (ہیرو اور ہیروئن) نے محسوس کیا کہ اب ان کا کام صرف یہ ہے کہ ساحل سمندر پر چہل قدمی اور دوڑیں لگائیں، بے ہودہ عشقیہ مناظر فلمبند کروائیں اور مٹی کے سیکڑوں رنگین چمکدار برتنوں (گھڑوں) کے درمیان رقص کریں۔ ان برتنوں کے اس قدر زیادہ اثرات مرتب ہوئے کہ ایک سال بعد تحفہ نامی ایک فلم میں انہی اداکاروں/ اداکاراؤں کو اسی ساحل سمندر پر تانبے کے عظیم الجثہ برتنوں (گھڑوں) کے درمیان رقص کرتے دکھایا گیا۔ 1990ء کی دہائی کی فلموں کے ایک مشہور ہدایتکار، درمیش درشن نے ہندوستانی فلمی صنعت کا مختصر انداز میں یوں جائزہ پیش کیا: ''ممبئی کی فلمی صنعت قومی سے بین الاقوامی ہونے کے بجائے اچانک قومی سے علاقائی حیثیت میں تبدیل ہو گئی۔''

یہ امر امیتابھ بچن کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اعتراف ہے کہ 1980ء میں اس کی فلموں کی ناکامی کے باوجود اس کے پرستاروں کی تعداد میں کمی نہیں آئی۔ ان پرستاروں میں شاہ رخ خان بھی شامل تھا۔ امیتابھ بچن کے لیے شاہ رخ خان کی پسندیدگی بدستور قائم رہی اور وہ امیتابھ کی فلموں کے مکالمے اور مناظر یاد بھی کرتا رہا اور ان کے مطابق اداکاری کرنے اور

مکالمے بولنے کی کوشش کرتا۔ امیتابھ کی فلم ''شہنشاہ'' کا ایک مکالمہ اسے بے حد پسند تھا۔ ''رشتے میں تو ہم تمہارے باپ لگتے ہیں، نام ہے شہنشاہ۔'' یہ کردار ایک آوارہ گرد قسم کا غنڈے کا ہے جس نے اپنے دائیں ہاتھ پر غیر محسوس طور پر آہنی زنجیر دار خول پہنا ہوتا ہے لیکن امیتابھ کے اس انداز کے ساتھ ساتھ اس نے جان ٹریولٹا کے مانند اکڑ کر چلنے کا انداز بھی اپنا لیا۔ اس کی خواب گاہ کی دیواریں کیرائیل لیڈ اور سامنتھا فوکس کی بڑی بڑی تصویروں سے مزین تھیں۔

1985ء میں شاہ رخ خان نے St. Glumba's سے گریجویشن کی اسے ''شمشیر افتخار Sword of Honour'' عطا کی گئی۔ یہ سکول کا سب سے بڑا انعام تھا جو ان طلبہ کو دیا جاتا تھا جو تعلیم کے علاوہ کھیلوں اور ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اس وقت شاہ رخ خان کی عمر انیس برس تھی اور وہ سال کا درخشندہ ستارہ قرار دیا گیا تھا۔

St.Glumba's کے انتہا پسند مسیحی ماحول اور گزشتہ تیرہ سال کی دوستیوں کے باعث شاہ رخ خان پر مغربی رنگ غالب آ چکا تھا۔ بولنے میں اس کا لہجہ نپا تلا، علم کے لحاظ سے عالم فاضل اور مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے مکمل باصلاحیت انسان، جس کا مظاہرہ اس نے ایک دہائی بعد بننے والی فلموں میں کیا لیکن اس کی داستان یہاں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کے شاندار انگریزی لب و لہجے کا خمیر اسی پسماندہ ارض وطن سے اٹھا تھا۔ ہندوستانی فلمی صنعت کے ان ہدایتکاروں میں سے جنہوں نے سب سے پہلے شاہ رخ کو اپنی فلموں میں اداکاری کے لیے منتخب کیا، مانی کاؤل کا نام بھی شامل ہے۔ وہ دستوفسکی کے ناول "The Idiot" پر مبنی فلم بنا رہا تھا۔ اگرچہ مانی کاؤل کا خیال تھا کہ روگوزن کے کردار کے اعتبار سے شاہ رخ کا چہرہ بہت حد تک معصوم اور بچگانہ ہے لیکن پھر بھی اس نے یہ کردار شاہ رخ خان کے لیے منتخب کر لیا کیونکہ اسے یہ محسوس ہو گیا تھا کہ شاہ رخ کا چہرہ ''خوبصورتی اور بد طینتی'' کا انوکھا امتزاج ہے اور وہ یہ دونوں طرح کے کردار بخوبی ادا کر سکتا ہے۔

دہلی کا ماحول اس کی پرورش کے لیے بہت مناسب ثابت ہوا۔ دہلی شہری اور دیہاتی ماحول کا ایک انوکھا اور حسین امتزاج ہے۔ دیہاتی علاقوں کے ساتھ ساتھ جدید اور پرتعیش رہائشی آبادیاں واقع ہیں۔ بعض علاقے ایسے ہیں جہاں محض ایک سڑک دولتمند اور مفلس آبادیوں میں تقسیم کا باعث بنتی ہے۔ گزشتہ صدیوں میں عجیب و غریب انداز سے نمودار ہونے

والے کھنڈرات شہر کے دولت مند رہائشیوں کی یاد دلاتے ہیں۔ دہلی میں موجود آثار قدیمہ کا تعلق 300 قبل مسیح سے ہے۔ اس سے پہلے دہلی سات سلطنتوں کا دارالحکومت رہا ہے اور اس میں بہت سے مختلف شہروں کی تہذیبیں موجود رہی ہیں۔ نئی دہلی ان زیرک پنجابی کاروباری افراد نے تعمیر کی جو تقسیم ہند کے دوران یہاں آئے۔ پرانی دہلی مغل شہنشاہوں کے وقت موجود تھی، نوآبادیاتی دہلی کو برطانوی ماہر تعمیرات سر ایڈون لیوٹنز نے تعمیر کیا تھا اور غیر متمدن دہلی، ہمسایہ ریاستوں ہریانہ اور اتر پردیش کے مانند جہالت اور گنوار پن کا نمونہ تھی۔

"St.Golumba" میں شاہ رخ خان اپنے سکول کا بے حد خوش اخلاق اور محنتی طالب علم تھا۔ اس کی ساتویں جماعت کی استانی نے بتایا کہ شاہ رخ خان اپنے گھر میں بیٹھ کر سکول کا جو کام کیا کرتا تھا وہ اس قدر صاف ستھرا اور شاندار ہوتا تھا کہ اسے بطور مثال دوسرے طلبہ کو دکھایا جاتا تھا۔ ہر روز واپس گھر جاتے ہوئے شاہ رخ خان اپنی استانی کی کتابیں بھی اٹھا لیتا لیکن شاہ رخ خان اپنے سکول کے باہر مروج بے ہودہ تہذیب سے مکمل طور پر آشنا تھا اور اس میں ماہر بھی تھا۔ ہندی گالیاں یا لعنت ملامت اور طعن و تشنیع کے دیگر الفاظ اس کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے، لڑائی جھگڑا بھی اس کے لیے کوئی خلاف معمول بات نہ تھی۔ شاہ رخ خان نے یہ دیکھ رکھا تھا کہ چاقو کیسے گھونپے جاتے ہیں اور خون کیسے ابل ابل کر بہتا ہے۔ اس نے اپنے والد کا سنہری اصول اپنا رکھا تھا: "اگر مخالف طاقتور ہے تو اس کے سر پر پتھر مارو اور بھاگ جاؤ۔"

بارہ سال کی عمر میں وہ ایک دفعہ گرین پارک کے علاقے میں واقع اپھار سینما میں امیتابھ بچن کی فلم "پرورش" دیکھنے آیا۔ اس کے دو دوست اس کے ساتھ تھے۔ ٹکٹ فروخت ہو رہے تھے اور ان تینوں لڑکوں نے سینما کے باہر غیر قانونی طور پر زائد قیمت کے عوض ٹکٹ فروخت کرنے والے شخص کے ساتھ گفت و شنید شروع کی۔ یہ لڑکے اس وقت بہت حیران ہوئے جب اس شخص نے انہیں اصل قیمت پر ٹکٹ فروخت کرنے کی پیشکش کی۔ لڑکے راضی ہو گئے اور شاہ رخ اس شخص کے ساتھ زیر زمین واقع اس جگہ چلا گیا جہاں کاریں اور گاڑیاں کھڑی کی جاتی تھیں تا کہ سودا مکمل کیا جا سکے لیکن اصل قیمت پر ٹکٹ فروخت کرنے کی پیشکش کے اندر ایک بھاری قیمت پوشیدہ تھی۔ اس زیر زمین تاریک جگہ میں اس شخص نے اپنی پتلون کی زپ کھول دی اور شاہ رخ خان کو آمادہ کرنے کی کوشش کی۔

شاہ رخ خان پہلے تو خوف زدہ ہو گیا اور پھر بھاگ نکلا لیکن بعد میں وہ اور اس کے دوست اس واقعے کو یاد کر کے بہت ہنسے۔ یہ حادثہ شاہ رخ خان کے لیے نقصان دہ ثابت نہ ہوا۔ شاہ رخ نے بتایا: "یہ ایک ایسا لمحہ تھا جس نے مجھے خوف زدہ کر دیا یا کم از کم مجھ پر ایک گہرا تاثر چھوڑا۔ یہ سب کچھ بڑے ہونے اور پرورش پانے کا ایک حصہ تھا۔" اس نے خیال ظاہر کیا کہ شاید یہ شخص ابھی بھی سینماؤں کے باہر غیر قانونی طور پر ٹکٹیں فروخت کرتا ہو اور شاہ رخ خان کی فلموں کی ٹکٹیں فروخت کر رہا ہو۔

مختلف اور متضاد قسم کے یہ حالات و واقعات ایک اداکار کی حیثیت سے اس کی کامیابی میں بہت مددگار ثابت ہوئے تھے۔ اگرچہ اس نے دولت مند رومانی ہیرو کے کردار کی اداکاری کے ضمن میں شہرت حاصل کی لیکن اس نے اپنے اندر عام آدمی کی وہ فہم و فراست برقرار رکھی جو اسے اپنے ناظرین اور سامعین سے منسلک رکھتی تھی۔ امیتابھ بچن نے ایک عام آدمی کا کردار ادا کیا جو نظام کے خلاف جدوجہد کرتا ہے لیکن وہ ایک بہت ہی اعلیٰ معیار کا اداکار تھا۔ اس نے عام آدمی کے نقطہ نظر کی بھی حمایت کی لیکن شاہ رخ خان اس سے بہت مختلف انداز میں کامیاب ترین اور عظیم اداکار کی حیثیت سے برقرار رہا۔ اس کے ناظرین اسے ایک مثالی خاوند، بیٹے، بھائی اور دوست کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ وہ کوئی فرشتہ نہیں تھا جو قابل رسائی نہ ہو لیکن وہ اپنے گھرانے کا سب سے زیادہ طلسماتی اور پرکشش فرد تھا۔

❁

پانچواں باب

"تمہیں فلموں میں کام کرنا چاہیے"

"تمہیں فلموں میں کام کرنا چاہیے۔" یہ فقرہ جس شخص نے سب سے پہلے شاہ رخ خان کو کہا اس کا نام بیری جان Barry John تھا۔ 1985ء کے موسم گرما کے ایک دن کا ذکر ہے۔ شاہ رخ خان اور اس کے دوست جنوبی دہلی کے ساکٹ (Saket) نامی علاقے میں منعقد ہونے والی ایک تقریب میں شامل تھے۔ تقریب اپنے جوبن پر تھی ڈسکو روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ عارضی طور پر تیار کی گئی رقص گاہ پسینے سے شرابور کالج کے طلبہ سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ شاہ رخ خان نہایت ہی محنتی اور مستعد رقاص ادھر ادھر ایک درویش کے مانند تھرک اور مٹک رہا تھا، ہر ایک ڈانس کر رہا تھا اور وجد کے عالم میں اپنا سر بھی ہلا رہا تھا۔

جون اور جولائی کے تمام عرصے میں شاہ رخ خان "Annie Get Your Gun" نامی ایک ڈرامے میں کام کرتا رہا تھا جس میں لیڈی شری رام کالج کے طالبعلموں نے شرکت کی تھی۔ کالج اور شہر کے مشہور فلمی ادارے "تھیٹر ایکشن گروپ" کے درمیان ایک معاہدہ طے پا گیا تھا جس کے مطابق طالب علموں نے موسیقی اور نغمات میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا۔ بیری جان اس ادارے کا بانی اور ہدایتکار تھا۔ چونکہ یہ ایک بہت بڑا منصوبہ تھا اس لیے ادارے سے غیر متعلقہ رقاص آزمائشی جانچ کے بعد منتخب کیے جا رہے تھے۔

بیری کو یہ قطعی معلوم نہ تھا کہ شاہ رخ خان کو کیسے شوق پیدا ہوا کہ وہ بھی آزمائشی جانچ کے مرحلے میں حصہ لے۔ یہ کھیل بھی ایک وجہ ہو سکتا تھا اور ایک وجہ لیڈی شری رام کالج کی خوبصورت اور دلکش لڑکیاں بھی ہو سکتی تھیں۔ انتخاب کا زیادہ تر مرحلہ مقررہ وقت کے اندر پایہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ بہرحال شاہ رخ خان پہنچا اور اس نے ایک طائفے کے ساتھ گلوکار رقاص کے طور پر اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا۔ پروگرام ختم ہونے کے بعد شاہ رخ خان "تھیٹر ایکشن گروپ" کے ساتھ منسلک ہو چکا تھا۔ بیری اس کا سب سے پہلا اور واحد اتالیق تھا جس نے

شاہ رخ خان کو اداکاری کے رموز سکھائے۔

بیری کی پیدائش اور پرورش انگلستان میں ہوئی تھی۔ وہ ان آوارہ گرد سیاحوں (ہپی Hippie) کا حصہ تھا جنہوں نے 1960ء کی دہائی میں ہندوستان پر یلغار کی تھی۔ اس وقت "فلاور پاور Flower Power" نامی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ اپنی نسل کے اکثر افراد کے مانند بیری نے اپنے بال لمبے کر لیے تھے، کرتا پہننے لگا تھا اور روی شنکر کو سنتا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ "جنگ مخالف، حکومت مخالف، دولت مخالف اور انتظامیہ مخالف" تھا لیکن بیری اس قدر محنتی اور ایماندار تھا کہ اس کے لیے ایک مستند ہپی بننا بہت ہی مشکل تھا۔ اس کے دیگر ساتھی اگرچہ گھرا اور کوٹو منالی کی جانب پھیل گئے تھے جہاں وہ چرس پیتے اور گیان میں مستغرق رہتے لیکن بیری نے یہ سب کچھ نہیں کیا اور ڈرامے تیار کرنے شروع کر دیے۔ پھر وہ 1968ء میں بنگلور میں ایک منصوبے کے ایک شراکت دار کی حیثیت سے ہندوستان آیا اور یہیں قیام پذیر ہوا۔ 1973ء میں اس نے "تھیٹر ایکشن گروپ" کی بنیاد رکھی۔

ہندوستان میں انگریزی ڈرامے کی پیشکش انتہائی دل گردے کا کام ہے اس کے لیے وافر حوصلہ اور ہمت درکار ہے۔ حتیٰ کہ 1980ء کی دہائی میں بھی جب تفریح کے مواقع محدود تھے پھر بھی ناظرین کی تعداد کم ہی ہوتی تھی، آمدنی کا تو کوئی تصور ہی نہ تھا اور شہری اعلیٰ طبقے پر اس کا اثر بہت ہی کم تھا۔ اس گروپ میں مختلف پس منظر رکھنے والے بیس افراد شامل تھے جنہیں صرف ڈرامے کی محبت ہی اس گروپ سے منسلک رہنے پر مجبور کرتی تھی۔ یہ ادارہ ایک سال میں کم از کم دو ڈرامے پیش کیا کرتا تھا۔ گروپ کے ارکان کو مختلف ذمہ داریاں تفویض کی گئی تھیں لہٰذا اداکار اپنے گروپ کے لیے مالی معاونت حاصل کرنے، اپنے گروپ کی تشہیر، عارضی ڈرامہ گاہ اور لباس مہیا کرنے کے بھی ذمہ دار تھے۔ چونکہ اکثر اداکار دن کو کل وقتی ملازمت کرتے تھے، اس لیے ڈرامے کی تیاری اور مشق روزانہ شام چھ بجے سے رات نو بجے تک "فادر انجیل سکول" میں کی جاتی تھی۔ تیاری اور مشق کے دوران جس اداکار کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی، وہ چائے کی چسکی لگانے باہر چلا جاتا تھا۔ کبھی کبھار مالی معاونت کرنے والا کوئی ادارہ یا فرد سامنے آتا اور ڈرامے کی فی نمائش کے لحاظ سے اداکاروں کو سو یا دو سو روپے (2.25 سے 4.50 ڈالر) کی ادائیگی کر دی جاتی۔

بیری خود پسند نہیں تھا اور نہ ہی وہ تنگ نظر تھا۔ اس لیے اس گروپ کے ذریعے جو ڈرامے

پیش کیے جاتے ان میں شیکسپیئر کے ڈراموں سے اخذ شدہ کہانیوں سے لے کر نیل سائمن کے مزاحیہ کھیل اور بچوں کے ڈرامے شامل ہوتے۔ اس گروپ میں ایک غیر مخصوص ان کہا لیکن مختلف طبقاتی نظام موجود تھا۔ اداکاروں کا ایک گروہ عمر اور تجربے دونوں کے لحاظ سے برتر تھا۔ ان میں سے بہت سے اداکار بعدازاں فلم اور ٹیلی ویژن میں کامیاب ثابت ہوئے۔ دوسرا گروہ ان اداکاروں پر مشتمل تھا جو عمر اور تجربے کے لحاظ سے کم تر تھے جس میں شاہ رخ خان اور اس کے دوست بنی تھامس اور دیویا سیٹھ شامل تھے۔ شاہ رخ خان عمر رسیدہ اور تجربہ کار اداکاروں کے ساتھ میل نہیں کھاتا تھا کیونکہ شاہ رخ اور اس کے دوست درست اور صحیح برطانوی فلمی لہجے میں انگریزی بولتے تھے اور امیتابھ بچن کی اداکاری اور مکالموں کی نقالی کے سبب اس میں فلمی اور ڈرامائی اداکاری کی فہم وفراست موجود تھی۔ شاہ رخ خان کے تہذیبی حوالوں میں شان وشوکت اور ملمع سازی عنقا تھی۔ وہ انتہائی ذہین اور باصلاحیت لیکن دانشور نہیں تھا۔

تھیٹر ایکشن گروپ کے عمر رسیدہ، دولت مند اور تجربہ کار اداکار اس ادارے کے انتظامی سربراہ سنجائے راؤ کے متعین کردہ "عالی شان گھر اور گاڑی" کے طرز زندگی کا نہایت فخر کے ساتھ اظہار کرتے تھے۔ یہ لوگ ماؤریا ہوٹل کی بالائی منزل پر واقع جدید اور پرآسائش چینی ریستوران "بیلی ہائی" میں تقریبات منعقد کرتے۔ کچھ اداکار دن میں کل وقتی اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ دہلی میں مروج طبقاتی تقسیم پر مبنی تہذیب وتمدن کے مطابق رہائشی علاقہ اور معمولات آپ کی شخصیت کا تعین کرتے تھے...... اور ایک پسماندہ علاقے میں شاہ رخ کی رہائش اس کے اعلیٰ سماجی مرتبے کی نفی کی تصدیق کرتی تھی۔ گوتم نگر کی گنجان آبادی میں واقع شاہ رخ خان کا تین منزلہ چھوٹا اور تنگ گھر ایک ایسا نام نہیں تھا جسے نظر انداز کیا جا سکے لیکن ان کم عمر اور ناتجربہ کار فنکاروں میں جذبہ، ولولہ اور جوش تو بہت تھا لیکن ان میں تصنع، ریاکاری اور علمیت کی کمی تھی۔

اس گروپ کے تجربہ کار اداکاروں کے برعکس جن کے لیے تھیٹر محض لطف اندوزی کا سامان تھا اور ان کے ذاتی وکاروباری معمولات اس ادارے سے منسلک نہ تھے، شاہ رخ، بنی اور دیویا اپنی توانائی اور تخیل کو بہت مشکل سے برقرار رکھ پاتے تھے۔ یہ ان کی زندگیوں کا طلسمی دور تھا۔ یہ سکول اور ذمہ دار زندگی کے درمیان ایک ایسا بے فکری کا زمانہ تھا جب ہر چیز ممکن دکھائی دیتی ہے۔ پھر شاہ رخ خان نے معاشیات میں ڈگری حاصل کرنے کے لیے ہنس راج

کالج میں داخلہ لے لیا لیکن اس کی اصل اور حقیقی تعلیم کا آغاز "تھیٹر ایکشن گروپ" کے ساتھ گزری ہوئی شاموں کے ذریعے ہوا۔ ڈرامے کی تیاری اور مشق کے بعد یہ لوگ مول چند پل کے نزدیک سڑک کے ایک طرف بیٹھ کر پراٹھے کھاتے، ویڈیو پر دھندلی فلمیں دیکھتے اور نہایت پرجوش ہو کر اداکاری کے متعلق آپس میں بحث کرتے۔

ان مباحث میں ہندوستانی فلموں کا تذکرہ نہیں ہوتا تھا۔ شاہ رخ خان ہندی فلموں کا بہت رسیا تھا وہ یہ فلمیں تقریباً روزانہ دیکھتا۔ فاطمہ کی بہن نے جو اس وقت لندن میں رہائش پذیر تھی، انہیں ایک وی سی آر بھیجا تھا اور ہر رات شاہ رخ خان اور فاطمہ وی سی آر کے سامنے بیٹھ جاتے اور ڈرامہ شروع ہونے سے پہلے شاہ رخ خان اپنی والدہ کے پاؤں چھوتا۔ شاہ رخ خان کو بھولی بسری فلموں اور اداکاروں کے متعلق بہت کم تفصیلات یاد تھیں۔ وہ بمشکل "پران" کی خوبیوں اور صلاحیتوں کے متعلق گفتگو کر سکتا تھا جو 1960ء کی دہائی میں صف اول کا ولن (Villain) تھا۔ اس نے امیتابھ بچن کے مانند ہیرو بننے کے متعلق سوچا تھا لیکن وہ ہیرو نہیں بننا چاہتا تھا۔ شاہ رخ خان جس کی کامیابی کے چرچے ہر طرف تھے اسے مسابقت کی ہرگز خواہش نہیں تھی۔

وہ چاہتا تھا کہ مختصر فلموں، ٹیلی ویژن اور اشتہاری فلموں میں حصہ لے۔ بنی اور شاہ رخ خان عرصہ دراز پہلے آپس میں مذاق کیا کرتے تھے کہ کسی دن وہ ایک ایسے اشتہاری ادارے کا آغاز کریں گے جس کا نام "کچھ بھی نہیں" ہوگا جو بھی اشتہار وہ بنائیں گے، اس کا آغاز اس طرح کے فقرے سے ہوگا: "کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے پندرہ بچے ہوں؟ نہیں نا؟ اس لیے آپ کو چاہیے کہ آپ ...... استعمال کریں۔" اشتہاری ادارے کے ان دونوں بہترین دماغوں کی ایک تین منزلہ عمارت ہوگی تاکہ ان کے گھر بالائی منزل پر ہوں، ادارے کا دفتر نچلی منزل میں ہو اور درمیانی منزل میں ایک رقص گاہ ہوگی جہاں موسیقی اور نغمات کا مکمل سامان موجود ہوگا اور یہ رقص گاہ جھلملاتی رنگین روشنیوں سے مزین ہوگی۔ اس کے علاوہ یہاں تیراکی کے تالاب کے کنارے ستانے کے لیے میز کرسیاں بھی ہوں گی۔"

صرف فاطمہ ہی واحد ہستی تھی جس نے ہندوستانی فلموں میں کام کرنے کے لیے شاہ رخ کے خواب زندہ رکھے اور انہیں تقویت بخشی۔ وہ خاص طور پر شاہ رخ کی اداکاری کی خواہش کے ضمن میں تعاون اور ہمدردی کا جذبہ رکھتی تھی۔ اس نے شاہ رخ خان سے کاروباری امور

لیے جو چیز مفید اور کار آمد ثابت ہوئی وہ اس کی توانائی تھی۔ شاہ رخ خان ایک نہایت ہی زرق برق اور ٹھاٹ پسند اداکار تھا۔ اس کی اداکاری میں ورزشی کرتبوں کا عنصر بدرجہ اتم موجود تھا، اس کی کارکردگی نہایت ہی متاثر کن اور مبالغہ آرائی کی حد تک بہتر اور شاندار ہوتی تھی۔ اس کی اداکاری بے ساختگی سے مرصع ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ ڈرامے کے ایک طالب علم کی حیثیت سے بھی وہ نہایت اعلیٰ فنکارانہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بچوں کے لیے ڈراموں میں اس کی کارکردگی بہت ہی شاندار اور بہترین تھی۔ Old King Cole اور The Incredible Vanishing جیسے تند و تیز مزاحیہ ڈراموں میں اسے مرکزی کرداروں کے لیے منتخب کیا گیا۔

بچوں کے ڈرامے کے لیے ایک ایسے اداکار کی ضرورت تھی جو مختلف قسم کی اداکاری کرنے میں ماہر ہو۔ مختلف اندازہائے اداکاری میں مختلف جسمانی حرکات کے ذریعے اپنی تاثرات کا اظہار مقصود تھا مثلاً ''دھپ مارنا، پاؤں سے ضرب لگانا اور تھپڑ لگانا۔ ان ڈراموں میں کھلاڑی ایک اداکار کے مانند نمایاں ہوتا تھا (شاہ رخ خان نے تھیٹر ایکشن گروپ کی فٹ بال کی ٹیم تیار کی تھی اور ہفتہ واری تعطیلات کے موقع پر مقابلے ہوتے تھے) شاہ رخ خان ایک ایسا اداکار تھا جو ہر قسم کی اداکاری کر سکتا تھا اور اداکاری کے مختلف انداز اپنانے میں کوئی چیز اس کے مانع نہیں تھی۔ ایک دفعہ The Incredible Vanishing کے ایک منظر میں اسے ایک اور اداکار کی کمر پر دھپ رسید کرنا تھی۔ اس نے نہایت اشتیاق کے ساتھ اداکار کی کمر پر دھپ رسید کی۔ شاہ رخ خان نے یہ عمل ابھی چند مرتبہ ہی انجام دیا تھا کہ اس اداکار نے شاہ رخ خان سے کہا کہ وہ اپنا ہاتھ ہلکا رکھے اور زیادہ زور سے اسے ضرب نہ لگائے' لیکن اگلے چند مناظر میں اس نے اداکار کی کمر پر زیادہ سخت ضربیں لگائیں اور درست تاثر پیدا کرنے کے لیے مزید چند دھپ بھی رسید کر دیے کیوں کہ اس کے باعث بچوں کے ہونٹوں پر قہقہے نمودار ہو گئے تھے۔ اس دور میں اسے یہ بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ ناظرین کس قسم کی اداکاری سے متاثر ہوتے تھے کیوں کہ اصل اہمیت ان تاثرات کی تھی جو ناظرین پر مرتب ہوتے ہیں۔ ایک اداکار کو وہ انداز اپنانا چاہیے جو ناظرین پر گہرے نقوش مرتب کرے۔

شاہ رخ پانچ برس تک ''تھیٹر ایکشن گروپ'' کے ساتھ منسلک رہا۔ اس عرصے کے دوران بقول بیری اس نے کوئی ''سنجیدہ یا متاثر کن کردار'' ادا نہیں کیا۔ اس کی اداکاری تھرکتی چلبلی مزاحیہ اور ہلکی پھلکی ہوتی تھی۔ اس دور میں شاہ رخ خان نے جن مختلف ڈراموں میں

میں مدد کرنے یا گھر کے لیے آمدن مہیا کرنے کے لیے کبھی نہیں کہا۔ شاہ رخ خان کبھی کبھار ریستوران کے لیے چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتا یا پھر حساب کتاب اس کے علاوہ وہ دیگر کاروباری امور کی طرف قطعاً توجہ نہ دیتا۔ چونکہ شاہ رخ خان کے دوستوں کے دقیانوسی اور قدامت پرست والدین اپنے بچوں کی طرف سے اپنی خاتون دوستوں کو گھر لانے پر برا مناتے اور انہیں منع کرتے اس لیے اکثر یہ لڑکے اپنی خاتون دوستوں کو شاہ رخ کے گھر لے آتے۔ فاطمہ ان سے کوئی پوچھ گچھ نہ کرتی بلکہ انہیں ممتا بھری محبت سے نوازتی اور انہیں کھانا بھی دیتی۔ اس نے شاہ رخ کی ذاتی زندگی میں بہت کم مداخلت کی۔ وہ صبح دو بجے گھر آتا اور آتے ہی چائے طلب کرتا اور فاطمہ کوئی سوال پوچھے اور پریشانی محسوس کیے بغیر اس کے لیے چائے تیار کر دیتی۔ اس کا خیال بلکہ اسے یقین تھا کہ اس کا بیٹا جس کا رنگ گندمی ہے، بدن دبلا پتلا ہے، حوصلہ مند اور ولولہ انگیز ہے اور جس کے سر پر گچھے دار بال ہیں، اگلا دلیپ کمار ہوگا۔ فاطمہ شاہ رخ خان کی اولین اور سب سے زیادہ پرستار تھی۔

بیری ایک زیرک اور صابر اتالیق تھا۔ اس کا انداز تحکمانہ نہیں تھا، وہ نہایت مہربانی اور شفقت سے اپنے شاگردوں میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے لیے حوصلہ و ہمت پیدا کرتا۔ بیری عملی طور پر سکھانے کا عادی تھا۔ اس کے شاگرد، کرداروں اور حالات کے مطابق خود ہی اداکاری کرنے کی کوشش کرتے۔ بیری اپنے شاگردوں کو بہت کم بتاتا کہ اداکاری کیسے کی جاتی ہے اس کے بجائے وہ اپنے شاگردوں کے تاثرات اور جسمانی حرکات و سکنات کے متعلق مختلف سوال کرتا تا کہ اس کے شاگرد کردار میں ڈوب کر اداکاری کریں۔ وہ پرانے اداکاروں کی نقالی کی مشق کرتے۔ ڈرامے کی نمائش سے چند روز قبل بیری انہیں اپنے اپنے کردار کے متعلق حتمی تیاری کے لیے انہیں تراکیب سے آگاہ کرتا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس کے شاگرد ہی اپنے کردار کے بارے مختلف تشریحات کرتے تاکہ وہ اپنے کردار کے ساتھ انصاف کر سکیں بیری تو محض انہیں رہنمائی مہیا کرتا تھا۔

شاہ رخ خان کا کہنا تھا کہ اس نے ان عملی مشقوں کے ذریعے ایک بہت ہی اہم سبق سیکھا کہ: ''اداکاری کرنے کا کوئی اچھا یا برا طریقہ نہیں ہے کیونکہ طریقہ وہی درست اور صحیح ہے جو کار آمد اور مفید ثابت ہو۔ آخر کار اداکاری کا معیار یہ ہے کہ کس قدر لوگ اسے پسند کرتے ہیں۔''

ابتدائی طور پر ڈرامے کے لیے اور پھر بعد میں ٹی وی اور فلم کے لیے شاہ رخ خان کے

اداکاری کی ان میں اس کے مستقبل کی جھلکیاں موجود تھیں۔ مثال کے طور پر ایک اطالوی مزاحیہ شاہکار سے اخذ شدہ "بغداد کا غلام" نامی ڈرامے میں شاہ رخ خان نے ایک جارح رومانی ہیرو کا کردار نہایت کامیابی سے ادا کیا لیکن بیری کے کہنے کے مطابق وہ کبھی بھی "ہیملٹ" نہیں کر سکا یعنی اس نے ابھی تک کوئی شاہکار کردار ادا نہیں کیا تھا۔ شاہ رخ خان نے ابھی تک جو کردار ادا کیے تھے اور جو اس کا خاصا بن چکے تھے ان میں اندرونی امنگ و ترنگ موجود نہ تھی بلکہ بیری کے کہنے کے مطابق "اشتہاری" تھے یا یہ کردار ناظرین کی مرضی کے مطابق یا انہیں خوش کرنے کے لیے ادا کیے گئے تھے پھر بیری کی طرف سے شاہ رخ خان کو یہ نصیحت کہ اسے فلموں میں کام کرنا چاہیے درحقیقت اس کے لیے اعزاز اور تعریف کے مترادف تھی۔

زیادہ مشکل، پیچیدہ اور سنجیدہ کردار کے لیے بیری عام طور پر ایک اور اداکار "ریتوراج" سے کام لیتا تھا۔ ریتوراج 1981ء میں اس وقت "تھیٹر ایکشن گروپ" میں شامل ہوا جب اس کی عمر محض سولہ برس تھی اور آہستہ آہستہ وہ اس ادارے کا پسندیدہ اور صف اول کا اداکار بن گیا۔ اس نے بتایا کہ تھیٹر ایکشن گروپ کے ساتھ کام کرتے ہوئے اس نے دس سال کے عرصے میں شاید ایک ڈرامے میں مرکزی کردار ادا نہیں کیا۔ دہلی میں پیش کیے جانے والے ڈراموں کے اعتبار سے ریتوراج، جو ہر قسم کے کردار ادا کرنے میں ماہر تھا، ایک کامیاب ترین اور بہترین اداکار تھا۔ اس نے بتایا: "جب پردہ اٹھا کرتا تو مجھے ناظرین کی سرگوشیاں صاف سنائی دیتیں، ان کی زبانوں پر میرا نام ہوتا تھا اور مجھے یہ سب بہت اچھا محسوس ہوتا تھا۔" شاہ رخ کے مانند ریتوراج بھی 1990ء کی دہائی کے اوائل میں ممبئی منتقل ہو گیا اور ٹیلی ویژن کے ایک کامیاب اداکار کی حیثیت سے سامنے آیا لیکن شاہ رخ خان کے برعکس وہ فلموں میں اپنی جگہ نہ بنا سکا۔ ریتوراج نے مزید کہا: "شاید میں بزدل تھا یا مجھے خود میں موجود بہترین صلاحیتوں پر یقین نہ تھا اور یہی ایک فرق میرے اور شاہ رخ خان کے درمیان تھا۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جسے ہمیشہ سے ہی اپنی بہترین فنکارانہ صلاحیتوں پر اعتماد تھا۔"

1990ء میں بیری نے "Whose Life Is It Anyway" نامی ایک ڈرامے کے لیے ہدایتکاری کی۔ یہ ڈرامہ ایک ایسے مفلوج مجسمہ ساز کی زندگی کے گرد گھومتا تھا جو اپنے مرنے کے حق کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ ڈرامے کا مرکزی کردار، ڈرامے کے تمام دورانیے میں بستر پر ہی پڑا رہتا ہے۔ شاہ رخ خان مجسمہ ساز کا کردار ادا کرنا چاہتا تھا لیکن بیری سمجھتا تھا کہ شاہ

رخ خان یہ کردار نہیں کر سکتا۔ اس کردار کو بہت زیادہ حد تک عملی اور ظاہری دونوں طرح سے "بے حس و حرکت" رہنا تھا۔ ان کے درمیان اس کردار کے لیے اداکار کے انتخاب کے موضوع پر بحث بھی ہوئی لیکن بالآخر ریتوراج نے مجسمہ ساز کا کردار ادا کیا اور شاہ رخ خان نے "وارڈ بوائے" کا کردار ادا کیا جو مایوس کن اور جان لیوا ماحول میں ہنستی مسکراتی، مزاحیہ اور مثبت زندگی بخش توانائی کی علامت تھا۔

چند سالوں بعد شاہ رخ خان نے صحافیوں کو بتایا کہ ایک اداکار کی حیثیت سے وہ پانچ قسم کے تاثرات کے اظہار پر قادر ہے لیکن وہ کامیاب اس لیے ہے کہ اس کے حریف اداکار صرف دو قسم کے تاثرات کا اظہار کر سکتے تھے۔ جب اس نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز کیا، اس کی اداکاری، اس کی پرکشش شخصیت کے طلسم اور اس کی صلاحیتوں پر مبنی مہارت کا نہایت تاثر انگیز مجموعہ ثابت ہوئی۔ سنجے رائے نے شاہ رخ کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "ممکن ہے کہ شاہ رخ خان اپنے دور کا بہترین اداکار نہ ہو لیکن پھر بھی وہ ایک کامیاب ترین اور شاندار اداکار رہا ہے۔" شاہ رخ کی مہارتوں کے متعلق بحث اس زمانے سے ہی شروع ہو چکی تھی جب وہ تھیٹر ایکشن گروپ کے ساتھ وابستہ تھا...... اور اس وقت تک ایک اداکار نہایت بہترین انداز میں "چھت کے اوپر" چلا گیا تھا اور اس کے دوست اسے مذاق کرتے تھے کہ "شاہ رخ خان نے یہ چھت توڑ دی ہے۔" یہ سلسلہ اس کے عالمی سطح کے اداکار بن جانے کے بعد بھی جاری رہا۔ اگر امیتابھ بچن کو "پارے کی تھرکتی شدت" سے تشبیہ دی جاتی تو شاہ رخ خان کو "جبلی شوخی" کا استعارا قرار دیا جاتا۔ اس کے ہر کردار میں ایک توانا اور متحرک عزم موجود ہوتا تھا۔ وہ سب سے پہلا اور واحد اداکار تھا جس میں جبلی طور پر ظریفانہ صلاحیتیں موجود تھیں۔ ایک دفعہ اس نے کہا: "اصل بات اور نچوڑ یہ ہے کہ کیا میں آپ کو ہنسنے پر مجبور کر سکتا ہوں؟ کیا آپ میرے ذریعے اپنے وقت کو ہنستے کھیلتے گزار سکتے ہیں؟" اس طرح شاہ رخ خان نے ایک ایسا عالم اختیار کیا جسے اس نے "عظیم اور کامیاب ترین اداکار" کا نام دیا۔

بہر حال استہزائی طور پر اس کی یہ بہترین خوبی اس کے لیے ابتدائی ناکامیوں کا باعث ثابت ہوئی۔ تھیٹر ایکشن گروپ کے ڈراموں کے علاوہ اسے اس کی پہلی فلم جس میں اس نے اداکاری کی تھی، میں بھی مرکزی کردار کے لیے نظر انداز کر دیا گیا۔ یہ ایک مختصر معمولی اور عجیب سی فلم تھی جو 1988ء میں تیار ہوئی تھی اور اس کی ہدایتکاری کے فرائض پردیپ کرشن اور مصنف و

فلمیں نہایت تکلیف دہ حد تک محتاط اور مایوس کن ماحول کی عکاسی کرتی تھیں۔ ایک قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ ہدایتکار راج کپور نے مرنیال سن کی فلم ''کھنڈر'' (1984) دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ فلم ایک ایسی تنہا عورت کے متعلق تھی جو اپنے تباہ شدہ آبائی مکان میں اپنی اندھی معذور ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ کپور یہ فلم محض نصف گھنٹہ دیکھ سکا اور اس دوران بھی ٹانگیں پھیلا کر جمائیاں لیتا رہا اور اس قدر بلند آواز سے بولا کہ اس کی آواز تمام سینما ہال میں گونج رہی تھی:

''بس اب اور نہیں!''

1980ء کی دہائی کے اواخر اور 1990ء کی دہائی کے اوائل میں ہندوستانی فلمی صنعت قبل از مرگ ہچکیاں لے رہی تھی۔ تقسیم کاروں اور ناظرین کی قلت نے ہندوستانی فلموں کو تہواروں اور ٹی وی تک محدود کر دیا تھا۔ "In Which Annie Gives It Those One" نامی فلم کو ایک بار دوردرشن ٹی وی سٹیشن سے رات گئے دکھایا گیا جسے محض چند ناظرین ہی دیکھ سکے۔

اس فلم میں نوجوان فنکاروں کے لیے بہت سے کردار تھے۔ پردیپ اور ارون دتی عظیم ناکامی کے گرداب میں سے دوبارہ ابھر رہے تھے۔ چھبیس اقساط پر مشتمل جو بہترین اور شاندار سلسلے وار کھیل ''برگد'' کے نام سے تیار کیا جاتا تھا، دو سال کی تحقیق اور تصنیف اور پچاس ایام کی فلمبندی کے بعد ختم کر دیا گیا۔ ارون دتی نے لکھا کہ وہ اور پردیپ ہمیشہ ہی اس نقصان پر ماتم کرتے رہے۔ پردیپ کے لیے اس فلم کا سب سے مشکل پہلو یہ تھا کہ ''برگد'' میں وہ ''چھوٹے اور معمولی اداکار'' شامل تھے جن کی فلمی صنعت میں پہچان تو تھی لیکن وہ ''بڑے اداکاروں'' کی صف میں شامل نہیں تھے۔ اس نے ان کے انداز اداکاری کو ''دراز کھولنا'' کی اصطلاح کے مطابق تیار کیا، دراز کھولنے سے مراد یہ تھی کہ جب بھی وہ کسی قسم کا کردار ادا کرنے کی تیاری کریں تو فوراً اپنے ذہن کی دراز کھول دیں اور اس موجودہ کردار اور منظر جیسا کوئی سابقہ کردار اور منظر یاد کریں اور اس کے مطابق اداکاری کریں۔ نیا کردار ادا کرتے وقت کوئی نئی اور بہترین کارکردگی تخلیق کرنے کے بجائے وہ اپنے کردار اور اداکاری کو اپنی اس کارکردگی تک محدود رکھتے جو انہوں نے کبھی اس سے پہلے انجام دی تھی۔

بہرحال فلم کے لیے نئے اداکاروں کی تلاش کے ضمن میں پردیپ سخت محنت پر مبنی عملی تربیتی مشقیں کروانے کے لیے پرعزم تھا۔ فلم کے انداز کے لحاظ سے ہنگلش Hinglish (انگریزی + ہندی) زبان بہت ضروری تھی اور ان اداکاروں کی تلاش جو یہ زبان بول سکیں

بہت ہی اہم کام تھا۔ اس ضمن میں پردیپ نے تھیٹر ایکشن گروپ سے رابطہ کیا۔ اپریل 1988ء میں شاہ رخ خان، رگھوراج، بنی اور دیویا سمیت چندرہ اداکاروں نے ان عملی تربیتی مشقوں میں حصہ لینا شروع کیا جو چنگیاپوری کے ایک چھوٹے سے مکان میں منعقد ہوتی تھیں۔ ان اداکاروں کو فلمی ماحول سے مانوس کرنے اور کیمرے کے سامنے گھبراہٹ کے بجائے طمانیت کا مظاہرہ کرنے کا عملی سبق دینے کے لیے پردیپ ویڈیو کا استعمال کیا کرتا۔ کرداروں کے مطابق خود کو ڈھالنے کے لیے مرد اداکاروں نے داڑھیاں اگا لیں اور سر کے بال لمبے کر لیے۔ چھ ہفتے پر مبنی سخت عملی تربیتی مشقیں ہفتے میں تین بار منعقد ہوتی تھیں۔ ان اداکاروں نے پردیپ اور ارون دتی کے تخلیق کردہ کرداروں کے مطابق خود کو ڈھالنے کی کوشش کی۔ اب ہر اداکار ایک اہم اور مرکزی کردار حاصل کرنے کا منتظر تھا۔

اس فلم کے دو مرکزی کرداروں ربی اور رادھا کے لیے پہلے ہی اداکار منتخب کیے جا چکے تھے۔ ارجن رینا نامی اداکار نے خبطی مثالیت پسند ربی اور ارون دتی نے رادھا کا کردار ادا کرنا تھا لیکن ان دو کرداروں کے علاوہ بہت سے دیگر مزید قابل توجہ اور قابل ذکر کردار بھی تھے۔ سب سے بہترین مرد کردار رادھا کے دوست کا تھا جسے ارجن بھی کہتے تھے۔

ارجن کے کردار کے لیے رگھوراج کو منتخب کر لیا گیا۔ فلم کے تیسرے مرکزی کردار کے لیے مقابلہ بہت سخت تھا لیکن رگھوراج کو ادراکی طور پر علم ہو چکا تھا کہ یہ کردار اسے ہی ملے گا۔ اس نے بتایا: ''جب میں گیارہ سال کا تھا تو اس وقت سے میں اپنا روزنامچہ (ڈائری) لکھ رہا ہوں۔ جب میں نے اس فلم کی کہانی کا مسودہ پہلی بار پڑھا تو میں فوراً اپنے گھر گیا اور روزنامچے میں لکھا: ''میں اس فلم میں ارجن کا کردار حاصل کروں گا۔'' دیویا کو لیکس (Lakes) کا کردار ملا، یہ کردار ایک ناراض اور رکھ رکھاؤ رکھنے والے نوجوان کا تھا جو امتحان میں کامیاب ہونے کے لیے اپنی خاتون محبت سے جھوٹی محبت جتلاتا ہے لیکن پھر بھی ناکام ہو جاتا ہے۔ بنی نے ''رشیہ'' نامی کردار حاصل کیا۔ رشیہ بھی ایک طالبعلم تھا۔ شاہ رخ خان کو ایک ایسا کردار ملا جو سکرین پر بہت کم دکھایا جانا تھا۔ وہ محض ایک ''تجربہ کار'' خوش باش اور زندہ دل طالب علم تھا جو سکرین پر ٹھیک چار مرتبہ نمودار ہوتا ہے اور صرف دو مناظر میں بولتا ہے۔ دیگر مناظر میں وہ طلبہ کے ایک گروپ میں شامل ہوتا ہے۔

شاہ رخ خان کا معلق اور غیر یقینی پیشہ ور مستقبل کم از کم' کچھ حد تک 'اتفاقیہ کامیابیوں کا

نتیجہ ہے۔ تقریباً تمام ابتدائی ٹی وی سلسلے وار کھیلوں اور فلموں میں یا تو اسے دوسرے یا تیسرے درجے کے کردار ملے یا پھر اسے بنیادی طور پر کسی معمولی کردار کے لیے منتخب کیا گیا جو آہستہ آہستہ مرکزی کردار میں تبدیل ہو گیا۔ ایسی ایک ایسا واحد کردار تھا جو شاہ رخ خان کو کمتر سمجھتے ہوئے اسے نہیں دیا گیا۔ وہ تھیٹر ایکشن گروپ کا ایک تجربہ کار اداکار تھا جسے معمولی بنا دیا گیا۔

آئندہ سالوں میں اس کی سحر انگیز داستان پر مشتمل کامیابی کا باعث یہ تھا کہ اسے اپنی موجودہ ناکامیوں کو اپنے دل پر نہیں لگا لیا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ اچھا اداکار نہیں تھا لیکن اس کے ساتھی اس سے زیادہ اچھے اداکار تھے۔ "In Which Annie Give It Those Ones" نوجوانوں کی کمزوری اور بزدلی کے متعلق تھی۔ پردیپ کا کہنا تھا کہ شاہ رخ خان اس قدر پُراعتماد اور اس کا موقف اس قدر واضح تھا کہ وہ اس قسم کے بے ہودہ اور فضول کردار ادا کرنے کے خلاف تھا۔ درحقیقت وہ ہیرو کا کردار ادا کرنے کے لیے پیدا ہوا تھا جبکہ ہماری فلم میں ہیرو نہیں تھے۔

شاہ رخ خان کا کسی بھی فلم میں پہلا منظر یہ تھا کہ وہ ایک دروازے کے باہر کھڑا ایک نوجوان کو بتا رہا ہے کہ یوگنڈا سے تعلق رکھنے والا اس کا ایک ہم جماعت سوتے وقت کیوں دانت پیستا ہے۔ اس کے بال تیل کے ذریعے تہہ کیے گئے ہیں اور درمیان میں سے الگ ہیں۔ ایک ہاتھ اوپر اٹھا ہوا ہے اور چینی طرز کا کوٹ پہنے وہ قطعی طور پر موت کے لیے تیار معلوم ہوتا ہے۔ شاہ رخ کہتا ہے: "وہ یہ کام اس وقت کرتا ہے جب اسے عیدی امین کا خیال آتا ہے...... عیدی امین نے اس کا باپ قتل کر دیا تھا...... کبھی تو اس کی آواز اتنی بلند ہو جاتی کہ راہداری میں بھی سنی جا سکتی۔" یہ منظر فلمانے سے قبل پردیپ اور ارون دتی کو شاہ رخ نے دو باتیں کہیں: ایک، وہ آسکر ایوارڈ جیتے گا اور دوسری یہ کہ آسکر ایوارڈ ایک مزاحیہ اور شوخ کردار ادا کرنے کے باعث جیتے گا۔

"کنگ خان" کا اعزاز اور خطاب پانے کے بعد بھی شاہ رخ خان نے اپنی پہلی ناکامی کو فراموش نہیں کیا۔ 1997ء میں ارون دتی نے اپنے تہلکہ خیز پہلے ناول "The God of Small Things" کے لیے "Booker Prize" حاصل کیا۔ یہ ایک قومی افتخار و اعزاز تھا۔ شاہ رخ خان کو جو اس وقت بہترین اداکار ہے، ارون دتی کے اعزاز میں منعقد ہونے والی تقریب میں شمولیت کے ذریعے اسے شرف بخشنے کی درخواست کی گئی لیکن شاہ رخ خان نے یہ دعوت مسترد کر دی۔

❀

چھٹا باب

پنچھیل پارک میں بدنامی و رسوائی

ہندوستانیوں کے لیے "میرائن ڈرائیو" Marine Drive ایک ایسی بے مثال شاہراہ ہے جو بلاشبہ ممبئی شہر کے لیے ایک استعارے کی حیثیت رکھتی ہے۔ چھ شاندار بل کھاتی گزرگاہوں پر مشتمل یہ شاہراہ شہر کے کاروباری ضلعے نارمین پوائنٹ سے دو میل دور واقع ہے اور شہر کے بہترین رہائشی علاقے مالابار ہل تک پہنچتی ہے۔ اس کے ایک طرف بحیرہ عرب اور دوسری طرف شاندار عمارتوں کی ایک قطار ہے۔ میرائن ڈرائیو اسی طرح ممبئی کی پہچان ہے جس طرح نیویارک کے لیے "مجسمہ آزادی" اور پیرس کے لیے "ایفل ٹاور" ہے۔ ہلکورے کھاتی ٹھنڈی ہوا سے مرصع وسیع سڑک بل کھاتی ڈرامائی روشنیاں اور راہگیروں، خوانچہ والوں، بچوں اور عاشقوں کا اژدحام اپنے اندر شہر کی مضطرب اور لطیف روح سموئے ہوئے ہے۔

فلموں کی عکس بندی کے باعث اس کی دلکشی اور خوبصورتی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ ماضی سے لے کر اب تک بے شمار ہدایتکار یہاں فلمبندی کر چکے ہیں مثلاً بارش میں رومانی دو گانے، تیز رفتار کاروں کا باہمی تعاقب، تنہائی میں غمگین مناظر، پتھر کی لمبی نشستوں پر سوتے ہوئے بے گھر ہیرو وغیرہ۔ 1990ء کی دہائی میں بھرپور تخیل، بہادری اور پھر دل کا دورہ ہندوستانی فلموں کا خاصا ہوتا تھا اور یہ سب مناظر میرائن ڈرائیو پر فلمائے جاتے تھے اور اس کے علاوہ یہاں ایک حقیقی زندگی بھی موجود تھی۔

میرائن ڈرائیو کے ایک چھوٹے پل کی دیوار کے ساتھ شاہ رخ خان کھڑا تھا۔ اس نے ممبئی سنٹرل ریلوے سٹیشن پر رات بسر کی تھی لیکن وہ صحیح طور پر سو نہ سکا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے، بدن پسینے سے شرابور اور آنکھوں میں دھندلاہٹ تھی۔ اسے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ شاہ رخ نے حال ہی میں اپنا پینٹکس (Pentax) کیمرا چار ہزار روپے (نوے ڈالر) میں فروخت کیا تھا لیکن وہ اور اس کے دوستوں بینی، تھامس اور اشیش جلد سے یہ رقم جلدی اڑا دی

تھی۔ گزشتہ چند دن مایوسی اور افسردگی کے عالم میں گزرے تھے۔ ابھی ابھی سورج طلوع ہوا تھا۔ شاہ رخ خان نے چمکتے آسمان کی طرف دیکھا اور ایک پرعزم آواز و لہجے میں اعلان کیا:
"ایک دن میں اس شہر پر حکمرانی کروں گا!"

شاہ رخ خان اپنی خاتون دوست گاوری شیبا کی تلاش میں ممبئی آیا تھا۔ وہ اس شہر سے بالکل ناواقف تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا قیام کہاں ہے لیکن اسے یہ ضرور معلوم تھا کہ اسے تیراکی سے عشق ہے اور وہ ساحل سمندر کے قریب ہی کہیں موجود ہو سکتی ہے۔ اسے یہ علم تھا اس کے مل جانے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں اور پھر ہمیشہ کے مانند مشکلات اور رکاوٹیں اس کے سامنے ایستادہ ہو گئیں۔

ہندوستان کے شہری علاقوں میں رومانی معاملات اکثر مذہبی رکاوٹوں اور ممانعتوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات کا راستہ مخالفت اور کانٹوں بھرا راستہ ہے۔ ہندوستان ایک بہت ہی مختلف ملک ہے۔ مسلمان اقلیت اور ہندو اکثریت کے درمیان تعلقات کبھی بھی خوشگوار نہیں رہے اور ان میں ایک دوسرے کے خلاف عداوت کا لاوا پکتا ہی رہتا ہے۔ ان دونوں اقوام کی خونیں تاریخ ان کے لیے ایک بدنما دھبے کے علاوہ انہیں الگ کرنے کا باعث بھی ہے۔ گلی کوچوں اور سڑکوں پر یہ فرق اور تقسیم حقیقی اور قابل محسوس ہے۔ ایک شخص کے نام کا آخری حصہ اس کے مذہب کو ظاہر کرتا ہے حتیٰ کہ تعلیم یافتہ، دولت مند اور لامذہب گھرانے، مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان شادی کے نام سے بدک جاتے ہیں۔ گاوری کا تعلق ہندو مذہب سے تھا۔

شاہ رخ خان نے اسے سب سے پہلے ایک تقریب میں دیکھا تھا۔ یہ تقریبات امریکی نوعمر لڑکے لڑکیوں کی تقریبات کا ہندوستانی نمونہ تھیں۔ یہ تقریبات عام طور پر شام چھ بجے شروع ہوتیں اور رات نو بجے تک جاری رہتیں ـــ میزبان شبینہ ماحول کا تاثر پیدا کرنے کے لیے پردے کھینچ دیتا۔ لڑکے ایک طرف کھڑے ہو جاتے اور لڑکیاں دوسری طرف کھڑی ہو جاتیں۔ جب ایک مقبول نغمہ شروع ہوتا تو پھر لڑکوں سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ پہل کریں اور لڑکیوں سے رقص کرنے کی درخواست کریں۔ اس شبینہ تقریب کا سب سے سنسنی خیز حصہ رخسار سے رخسار ملائے کم رفتار رقص ہوتا تھا۔

پھر اب "سی گینگ" کے ارکان بھی رومانی تعلقات کے ضمن میں پہل کرنے لگے تھے

لہٰذا ایک لڑکی کے ساتھ ٹینس کے مقابلے کے بعد وہ یک سرسری انداز میں گیند لڑکی کی طرف پھینک دیتا اور کہتا "بے بی گیند اب تمہاری طرف ہے۔ اب تمہاری مرضی ہے اسے مسترد کر دو یا مجھ سے محبت کا کھیل کھیلو!" شاہ رخ خان کے کچھ دوستوں کی خاتون دوست بھی تھیں لیکن شاہ رخ خان جسے لاکھوں خواتین کا رومانی تصور و تخیل بننا تھا اس معاملے میں کورا تھا۔ لڑکیوں سے بات کرتے وقت اس کی زبان گنگ ہو جاتی تھی اور شبینہ تقریب میں وہ لڑکیوں کے ساتھ رقص کرنے سے کتراتا تھا۔ اس نے گاوری کو ہلکے قرمزی رنگ کی جینز پہنے دیکھا تھا۔ اس کی عمر صرف چودہ برس تھی۔ وہ اس سے چار سال بڑا تھا لیکن وہ اس (شاہ رخ) سے زیادہ فیشن ایبل تھی۔ اس کے لہریے دار بھورے بال اس کی گردن کے پیچھے لہراتے۔ اس کی سیدھی ناک بہت خوبصورت تھی۔ اگرچہ گاوری کی بڑی بڑی آنکھیں اور سفید رنگ نہیں تھا جو ہندوستانی عورت کی خوبصورتی کا معیار تصور کیا جاتا ہے لیکن وہ بہت دلکش تھی اور دلفریب اتنی کہ جب وہ لڑکوں سے باتیں کرتی تو وہ اس کے سحر میں کھو جاتے۔ 25 اکتوبر 1984ء کو جب ان دونوں کی تیسری ملاقات ہوئی تو شاہ رخ خان نے اس کا فون نمبر لے لیا۔

ان کی پہلی ملاقات محض پانچ منٹ جاری رہی تھی۔ گاوری کی رہائش پنچشیل پارک (Panscheel Park) میں تھی جہاں بالائی متوسط طبقے کے شاندار بنگلے اور مکانات ایک ہی قطار میں واقع تھے، یہ دہلی کا جنوبی علاقہ تھا۔ یہاں کا سب سے مشہور اور مرکزی مقام برطانوی طرز کا پنچشیل کلب (Panscheel Club) تھا۔ یہ کلب اپنے ان ارکان سے بھرا رہتا تھا جو اپنی سہ پہریں تاش کھیلتے ہوئے صرف کرتے جبکہ ان کے بچے تیراکی کرتے اور بیڈمنٹن کھیلتے۔ تاہم رومانی تعلق یا معاشقے کے لیے یہ کوئی مناسب جگہ نہ تھی لیکن ایک نوجوان قلاش جوڑے کے لیے معاشقے کا کھیل کھیلنے کے لیے کوئی دوسری بہتر جگہ بھی نہ تھی۔

ملاقات کی تاریخ طے ہو گئی۔ شاہ رخ کے ساتھ "سی گینگ" کا ایک اور رکن راکس تھا۔ یہ لڑکے شاہ رخ کے چچا کے بھتیجے سے سکوٹر کے ذریعے کلب پہنچے۔ شاہ رخ اور گاوری تیراکی کے تالاب کے کنارے بیٹھے مضطربانہ انداز میں شراب پیتے رہے۔ راکس نے یہ وقت کلب میں کہیں بھی گزار لیا۔ پھر یہ ملاقات ختم ہو گئی لیکن اب سکوٹر نے چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ راکس اور شاہ رخ اس خدشے میں مبتلا کہ کہیں گاوری سکوٹر کے ساتھ دھینگا مشتی کرتے ہوئے انہیں دیکھ نہ لے، نہایت پیچھے سے سکوٹر کھینچتے ہوئے باہر نکل گئے۔ اس قسم کی ملاقاتوں اور دوستوں

کے ذریعے خط و کتابت کے باعث بہر حال ان کے درمیان ایک تعلق قائم ہو گیا۔ ان کا یہ رومان اور معاشقہ ہندوستانی روایات کے مطابق بالکل معصوم اور بے ضرر تھا۔ گاوری کا باپ رمیش ایک فوجی افسر تھا جو فوج سے سبکدوش ہو چکا تھا۔ گاوری ایک مشترک گھرانے میں رہ رہی تھی۔ اس کا ماموں تجندر تیواڑی اور بیوی بچے بھی اسی گھر میں رہائش پذیر تھے۔ ان دونوں گھرانوں کا کاروبار بھی مشترکہ تھا جس کے تحت سلے سلائے کپڑے غیر ممالک برآمد کیے جاتے تھے اور یہ کاروبار نہایت ہی کامیاب تھا۔ رشتہ داروں، عم زادوں اور نوکروں کی موجودگی میں مختلف حیلوں بہانوں ہی کے ذریعے یہ معاشقہ جاری رکھا جا سکتا تھا۔

شاہ رخ خان اور گاوری نے ان سب کو دھوکہ دینے کے لیے ایک نہایت ہی قابل اعتماد طریقہ وضع کیا۔ شاہ رخ خان گاوری کو براہ راست فون نہیں کر سکتا تھا کیونکہ مسلسل فون کرنے کے باعث سب کی توجہ ادھر مبذول ہو جاتی۔ اس لیے شاہ رخ خان نے یہ فرض دوسری لڑکیوں کو سونپ دیا۔ یہ لڑکیاں کہتیں کہ ''شاہین'' فون کر رہی ہے اور گاوری پہچان لیتی کہ یہ شاہ رخ کا فون ہے۔ گاوری کو لڑکوں سے ملاقات کی اجازت نہ تھی لیکن وہ شاہ رخ خان سے ان تقریبات میں ملاقات کر لیتی جہاں وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ آیا کرتی تھیں۔ شاہ رخ خان نے اس کے لیے ''تاریخ'' کے اسباق تیار کیے اور اسے گاڑی / کار چلانا سکھائی۔ وہ دونوں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کی وسیع عمارت میں گھومتے رہتے چند لمحات کے لیے ہم آغوش ہوتے اور پھر اپنے اپنے گھر واپس چلے جاتے۔

یہ دونوں ابھی نوجوان اور ناپختہ کار تھے اور یہ تعلق نازک ہونے کے علاوہ احتیاط کا متقاضی بھی تھا۔ شاہ رخ خان ایک تنگ نظر دوست تھا۔ اسے گاوری کی طرف سے سفید قمیصیں پہننے (یہ قمیصیں بہت باریک ہو سکتی تھیں) یا اپنے بال کھلے چھوڑنے پر اعتراض تھا۔ تیراکی کے لباس سے اسے نفرت تھی۔ اگر وہ کسی دوسرے لڑکے سے بات کر لیتی تو شاہ رخ خان کو غصہ آ جاتا۔ شاہ رخ خان چونکہ ایک پسماندہ علاقے کے ایک چھوٹے سے تنگ مکان میں رہتا تھا، اس لیے (بقول اس کے) اس کا ذہن بھی گھٹیا اور تنگ نظر ہو گیا تھا۔ ایک مرحلے پہ گاوری نے فیصلہ کیا کہ اب مزید برداشت کی تاب نہیں لہٰذا اگلے چھ یا سات ماہ کے دوران گاوری اس سے ملنے سے کتراتی رہی اور فون کے ذریعے بھی اس نے بات کرنے سے احتراز کیا۔ پھر شاہ رخ خان کو بتائے بغیر چھٹیاں گزارنے ممبئی چلی گئی۔

شاہ رخ خان گاوری کی طرف سے مسلسل خاموشی کے باعث بہت پریشان اور مضطرب تھا۔ اس نے گاوری کی سہیلیوں سے رابطہ کیا مگر گاوری کی ہدایت پر انہوں نے شاہ رخ خان کو کچھ نہیں بتایا۔ پھر شاہ رخ خان کو یاد آیا کہ وہ اپنے آپ کو کس طرح زوردار انداز میں کہا کرتا تھا کہ وقت کس طرح تعلقات میں تبدیلی برپا کر دیتا ہے۔ (شاہ رخ خان کو یہ سب کچھ اس وقت بھی یاد رہتا جب اس شاندار عشقیہ داستان کا اختتام خوشگوار شادی پر ہوتا) لیکن شاہ رخ خان اس قدر آسانی کے ساتھ ہار ماننے والا نہیں تھا۔ وہ اس کے گھر گیا۔ لڑکی کی آواز میں اس کے گھر فون کیا اور گاوری سے بات کرنے کی اجازت چاہی۔ اسے یہ بتایا گیا کہ وہ ممبئی میں ہے۔ ایک ہندوستانی فلم کے ہیرو کے عین مطابق جو منطق اور استدلال کا قائل نہیں ہوتا، اس نے گاوری کی تلاش جاری رکھی۔

پھر شاہ رخ خان اپنے دو دوستوں کے ساتھ ممبئی آن پہنچا، اس کے پاس دس ہزار روپے اور ایک موہوم سی امید تھی کہ چونکہ گاوری تیراکی کی دلدادہ ہے لہٰذا وہ اسے کسی بھی ساحل پر تلاش کرے گا۔ اس مہم کے پہلے چند ایام ''کوفے پیریڈ'' نامی پرتعیش اور جدید علاقے میں واقع ایک دوست کے خالی پرآسائش و تعیش گھر میں آرام اور عیش کرتے ہوئے گزر گئے لیکن پھر اس دوست کے والدین چھٹیوں سے واپس آ گئے اور پھر ان تینوں دوستوں نے خود کو سڑکوں پر مٹرگشت کرتے ہوئے پایا۔ رقم جلد ہی ختم ہو گئی اور شاہ رخ خان کو اپنا کیمرا فروخت کرنا پڑا۔ اب لڑکوں کو ریلوے سٹیشن پر موجود چوبی نشستوں پر سونا پڑ رہا تھا، وہ ہوٹلوں کے غسل خانوں میں نہا لیتے اور سڑک کے کنارے واقع کھوکھا ہوٹلوں سے دال روٹی کھا لیتے اور ممبئی میں اس لڑکی کی تلاش میں گھومتے پھرتے رہتے جو تیراکی کی دلدادہ تھی۔

آٹھویں روز مایوس اور دل گرفتہ لڑکوں نے اس تلاش کو بے سود قرار دیا۔ خاص طور پر اشیش بہت پریشان تھا کیونکہ دیگر دونوں لڑکے اپنے پاس موجود قلیل رقم کھانے کے بجائے سگریٹ خریدنے پر خرچ کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے پاس بچے کھچے چند روپوں کے عوض دہلی واپسی کے ٹکٹ خرید لیے لیکن شاہ رخ خان نے شمالی ممبئی کے ساحل پر آخری دفعہ گاوری کی تلاش میں جائے بغیر واپس ممبئی لوٹنے سے انکار کر دیا۔ ممبئی جانے والی ریل گاڑی پکڑنے سے چند گھنٹے پہلے ہی شاہ رخ خان نے گاوری کو دور افتادہ گورائے ساحل پر تلاش کر ہی لیا۔

لیکن شاہ رخ خان کی یہ بے تاب اور چاہت بھری مہم جوئی گاوری کو قائل نہ کر سکی کہ شاہ

سیاست دانوں کے لیے ہے۔ جب دہلی واپس آنے کے بعد گوری نے اسے بتایا کہ اسے سوچنے کا موقع چاہیے اور اس دوران انہیں اپنے تعلقات منقطع کر لینے چاہئیں۔ شاہ رخ خان نے کہا کہ اس قسم کی بے یقینیاں کمزوریاں جھاڑتی ہیں۔ بہرحال گوری کے اس رویے کے باعث اس کا دل ٹوٹ گیا اور شاہ رخ خان نے ترک تعلق کر لیا اور اپنی تمام تر توجہ ڈرامے اور فلم کی طرف مبذول کر لی۔ تقریباً چار ماہ بعد گوری نے ایک خط شاہ رخ خان کو بھجوایا جس میں اسے لکھا تھا کہ وہ شاہ رخ کے بغیر بہت اداس ہے۔ وہ شاہ رخ سے ملاقات کے لیے بھی آئی اور اسے بتایا کہ اس نے بہت سے لڑکوں سے دوستی کرنے کی کوشش کی لیکن اب وہ اس سلسلے میں مزید ملوث ہونا نہیں چاہتی اور وہ اسے پسند کرتی ہے۔ شاہ رخ کا کہنا تھا ”پھر ہم نے اپنے دل و دماغ سے یہ پختہ ارادہ کر لیا کہ ہم شادی کریں گے۔“

جب شاہ رخ خان نے ”میرین ڈرائیو“ پر طلوع آفتاب کے وقت اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ ایک دن ممبئی پر حکمرانی کرے گا تو بنی نے بلند آواز میں قہقہہ لگاتے اور یہ کہتے ہوئے اس شیخی کو ہوا میں اڑا دیا کہ چپ ہو جاؤ، بے وقوفی کی بات مت کرو تو شاہ رخ خان کے اولوالعزم اور ولولہ انگیز چہرے پر شکوک کی پرچھائیاں صاف دیکھی جا سکتی تھیں لیکن شاہ رخ خان کا یہ عزم محض شیخ چلی کی تخیلاتی باتیں نہ تھیں کیونکہ شاہ رخ خان اس شہر پر حکمرانی کرنے کے راستے پر پہلے ہی گامزن ہو چکا تھا۔

اس دور میں صرف ٹی وی ہی ایک ایسا ذریعہ اور وسیلہ تھا جس کے ذریعے کامیابی کی راہیں مزید کھل سکتی تھیں۔ جس طرح 1950ء کی دہائی ہندوستانی فلموں کے عروج کا زمانہ تھا، اسی طرح اب 1980ء کی دہائی ٹی وی کے عروج کا دور تھا۔ ٹی وی پر تخلیقی اور تجارتی معرکے انجام دیے جا رہے تھے لیکن ناظرین ابھی متبادلات کی کمی کا شکار تھے کیونکہ کیبل ٹیلی ویژن ہندوستان میں 1991ء میں متعارف ہوا لیکن اس وقت ملک میں موجود واحد نشریاتی ادارے دوردرشن جو حکومت کے زیر انتظام تھا نے اپنی تشکیل نو کی۔ 1982ء کے اواخر تک ہندوستانی ناظرین کم از کم رنگین پروگرام ضرور دیکھ سکتے تھے۔ جولائی 1983ء میں متعلقہ وزارت نے مالی تعاون کے حصول کے ضمن میں پابندیاں نرم کر دیں اور پروگرام سازی کے لیے نجی پروڈیوسروں کو دعوت دی۔

اس وقت ٹیلی ویژن کافی حد تک سیاسی موقف کی تشہیر کے لیے استعمال ہوتا تھا..... عام

طور پر مختلف تقریبات کے افتتاح کے موقع پر وزراء کی طرف سے فیتہ کاٹنے، تقریریں کرنے اور متاثرہ علاقوں کا دورہ کرنے کی خبریں شامل ہوتی تھیں ..... پھر انتہائی بیزار کن تعلیمی پروگرام بھی نشر ہوتے اور یہ سب پروگرام [illegible] ”بلیک اینڈ وائٹ“ ٹی وی کا حصہ تھے۔ دوردرشن کے تمام پروگراموں کی بنیاد ”تفریح“ نہیں بلکہ ”سماجی تبدیلی“ تھی جس کے باعث کم از کم ایک تنقید نگار تو یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ: ”اصل مقصد اور پیغام یہ ہے کہ ناظرین کے لیے تفریح کے بجائے بیزار کن اور فضول پروگرام پیش کیے جائیں۔“ پھر اچانک رنگین ٹی وی کا آغاز ہو گیا اور ساتھ ہی ناظرین کے لیے تفریحی پروگرام بھی نشر ہونے لگے حالانکہ ان تفریحی پروگراموں میں بھی کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق موجود ہوتا تھا۔ ”یہ جو ہے زندگی“ جیسے مزاحیہ اور گھریلو پس منظر میں جذباتی کھیلوں مثلاً 156 اقساط پر مشتمل ”ہم لوگ“ نامی ڈرامے نے شائقین کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ ”انڈیا ٹوڈے“ نامی اخباری جریدے نے بتایا کہ 1985ء میں دو ملین ٹیلی ویژن فروخت ہوئے یعنی ہر روز ایک منٹ کے اندر اندر چار ہندوستانی گھرانوں نے ٹی وی خریدے۔

دوردرشن جس کی 1975ء میں خالص آمدن 7.7 ملین روپے (1,70,000 ڈالر) تھی۔ 1988-89ء میں گزشتہ کسی بھی دور کی نسبت تجارتی اشتہار بازی کے ذریعے دوردرشن نے 1.61 بلین روپے (36 ملین ڈالر) کی آمدن حاصل کی۔ اس نشریاتی ادارے پر بدعنوانی اور اقربا پروری کے الزام مسلسل عائد ہوتے رہے۔ مثلاً پروگراموں کی دہلی کے دوردرشن دفتر سے منظوری، بدنام زمانہ منڈی ہاؤس، افسر شاہی کے لیے ”کک بیک Kick Pack“ کی سہولت وغیرہ۔ لیکن اس زمانے میں چند ایسے پروگرام تخلیق ہوئے جو ہندوستانی ٹی وی کی پہچان بن گئے: تقسیم کے موضوع پر گووند نہلانی کا تاثر انگیز کھیل تمس (اندھیرا) 1986ء، ہدایت کار رمیش سپی کی طرف سے پیش کیا جانے والا گھریلو پس منظر میں شاندار جذباتی کھیل بنیاد 1986-87ء اور نکڑ (Street Corner) 1986ء۔ 1987-88ء میں اندازاً 60 ملین افراد ہر اتوار کی صبح مذہبی رزمیہ داستان ”رامائن“ دیکھتے رہے۔ اخبارات کی اطلاعات کے مطابق ٹیلی ویژن منجمد ہو گئے تھے اور اس وقت ناظرین ہیجان میں مبتلا ہو جاتے جب رام دیوتا کو راون کے خلاف لڑتے دیکھتے۔

شاہ رخ خان کو ٹی وی پر کامیابی اس وقت حاصل ہوئی جب اس کے ایک سلسلے وار کھیل

"فوجی" کا آغاز ہوا۔ اس کھیل کی کہانی اور ہدایتکاری ایک عظیم اور زندہ دل شخص کرنل راج کپور کے تخلیقی ذہن کا کارنامہ تھی۔ راج کپور جو زندہ دل اور خوش باش انسان تھا اور مزاح و ظرافت اس کے طبعی میلان میں شامل تھی۔ وہ بالی وڈ کی قسمت میں لکھ دیا گیا تھا اور بالی وڈ اس کی راہ تک رہا تھا۔ جب 1931ء میں اس کی ماں اسے جنم دے رہی تھی تو اس کا باپ پہلی ہندی فلم عالم آراء کی افتتاحی نمائش کے موقع پر موجود تھا۔ اپنے کالج کے دور میں اس کی نہایت مشہور کپور بھائیوں ــــــ راج، شمی اور ششی کے ساتھ دوستی تھی ــــــ اور اسے بھی اداکاری کا شوق تھا۔ فوج میں چھبیس سال خدمات انجام دینے کے بعد راج کپور نے 1975ء میں قبل از وقت رضا کارانہ سبکدوشی حاصل کر لی اور فلمی دنیا میں قدم رکھا۔ راج نے بہت سی فلموں میں "کریکٹر ایکٹر" (باپ، چچا، ماموں وغیرہ کے کردار) ادا کیے لیکن اسے ایک استہزائی صورت حال سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ اسے کامیابی اس وقت نصیب ہوئی جب وہ اپنی ترک شدہ زندگی کی طرف واپس لوٹ آیا۔

"فوجی" ایک ایسا کھیل تھا جس کے ذریعے راج نے فوج کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔ اس کھیل کی تیرہ قسطیں تھیں اور نو آموز فوجیوں کو تربیت حاصل کرنے کے بعد "کمانڈار" بنتے دکھایا گیا تھا۔ راج یہ دکھانا چاہتا تھا کہ کس طرح نو آموز فوجی افسر بنتے ہیں لیکن وہ اس میں فلمی چمک دمک شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ فوجی زندگی کی حقیقی تصویر دکھائی جائے۔

شاہ رخ خان راج کے داماد کمال دیوان کے ذریعے راج سے متعارف ہوا جو جائیداد کی خرید و فروخت کے کاروبار سے منسلک تھا، وہ اس وقت فاطمہ کو چند گھر دکھا رہا تھا جب اس نے یہ سنا کہ فاطمہ کا بیٹا اداکار ہے تو اس نے شاہ رخ خان کو راج سے ملنے کا مشورہ دیا۔ اس وقت شاہ رخ خان پہلے ہی ایک سلسلے وار کھیل "دل دریا" میں کام کر رہا تھا جسے مشہور فلمی ہدایتکار لیکھ ٹنڈن بنا رہا تھا۔ لیکھ اور کرنل آپس میں گہرے دوست تھے۔ شاہ رخ خان نے "فوجی" کی پہلی چار قسطوں کی فلمبندی "دل دریا" کے کھانے کے وقفوں کے دوران کرائی۔

"فوجی" کے لیے آزمائشی امتحان طویل سفر پیدل یعنی صبح ساڑھے چھ بجے تک جاری رہتا تھا۔ راج چاہتا تھا کہ اسے یہ یقین ہو جائے کہ جو لڑکے اس نے منتخب کیے ہیں مستعد، وقت کے پابند اور نظم و ضبط کا خیال رکھتے ہیں۔ کچھ لڑکے تو اپنا سفر ادھورا چھوڑ کر چلے گئے لیکن شاہ رخ

خان نے راج کے تمام احکامات اور ہدایات کی پیروی کی اور پھر راج نے کمک بازی کا ایک غیر متوقع مقابلہ کروا لیا۔ راج نے شاہ رخ خان کو ہر طرح مستعد اور درست پایا لیکن ابتدائی طور پر اسے ایک چھوٹا کردار دیا گیا۔ راج کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا بوبی اس کھیل کا ایک مرکزی کردار ابھیمنارائے ادا کرے۔ بوبی پہلے ہی اس کھیل کا عکس کار (کیمرا مین) مقرر کیا جا چکا تھا۔ اداکاری اس کے لیے درست طور پر ایک خوفناک خواب ثابت ہوتی لہٰذا راج نے شاہ رخ خان سے چھوٹا کردار واپس لے کر اسے ابھیمنا کا مرکزی کردار دے دیا۔ اداکاروں کو دہلی میں واقع "راجپوتانہ رائفلز رجمنل سنٹر" میں ایک ہفتے کی تربیت فراہم کی گئی۔ جب فلمبندی کا آغاز ہوا تو راج نے ایک حجام ساتھ رکھا تا کہ "فوجی" کے اداکار ہندوستانی فلموں کے مانند جعلی اور لمبے بالوں والے نہ دکھائی دیں۔

اس کھیل کی پہلی قسط 19 جنوری 1989ء کو دکھائی گئی۔ پہلی قسط کے آغاز کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی نشر کیا گیا کہ اس سلسلے وار کھیل کے تمام واقعات اور کردار سچے ہیں لیکن حفاظت کے پیش نظر نام، جائے مقامات اور کچھ جگہوں کے نام تبدیل کر دیئے گئے ہیں۔ یہ کھیل تکنیکی اعتبار سے اس قدر مضبوط نہ تھا لیکن کہانی میں جذباتی قوت و طاقت موجود تھی۔ عشق و محبت کے مناظر، گھریلو پس منظر میں جذباتی کھیل کے عین مطابق تھے جن میں حب الوطنی اور جوش و جذبے کا پیوند بھی نہایت مہارت سے لگایا گیا تھا۔ یہ سلسلے وار کھیل فوراً ہی مقبول ہو گیا۔ کیمرے کو شاہ رخ خان کی صورت مانوس ہونے لگی اگرچہ اس کی شخصیت "کیمرے کی پسند" نہ تھی اور نہ ہی وہ دلکش تھا مگر اس کی صلاحیتوں کی چمک ناظرین کے دل موہ لیتی تھی۔ اتفاقیہ واقعات کا تسلسل بھی اس کے حق میں مفید ثابت ہوا۔ "فوجی" کے ایک اور مرکزی کردار نے اپنے انٹرویو میں کہا کہ یہ سلسلے وار کھیل اس کی اداکاری کے بغیر محض ایک معمولی درجے کا کھیل تھا۔ بعد ازاں اس نے دعویٰ کیا کہ اس کے بیان کو غلط معنی پہنائے گئے ہیں لیکن راج پریشان ہو گیا تھا۔ ایک اور اداکار نے اپنا کام فلمبند کروانے سے انکار کر دیا کیونکہ اس کا ایک ملازم کے ساتھ جھگڑا ہو گیا تھا جو اس کے لیے ٹھنڈی چائے لایا تھا۔ پانچویں قسط میں راج اس کھیل کی کہانی میں شاہ رخ خان کو مرکزی حیثیت دے رہا تھا۔ اس نے ایک ایسے کردار کی حیثیت اختیار کر لی جو عشق و محبت کے مناظر فلمانے میں مہارت رکھنے کے علاوہ مار دھاڑ کے مناظر کے لیے بھی نہایت موزوں تھا۔

ایک نوعمر لڑکے کی حیثیت سے شاہ رخ خان نے ایک فوجی افسر بننے کے خواب اپنی آنکھوں میں سجا رکھے تھے حتیٰ کہ ساتویں جماعت میں پڑھتے ہوئے وہ اپنی خاتون استاد کے خاوند کے پاس گیا تھا جو ایک سبکدوش بریگیڈیئر تھا اور نہایت سنجیدگی کے ساتھ فوجی سکول میں داخلے کے امکانات بارے اس سے گفتگو کی تھی۔ شاہ رخ خان کا خیال تھا کہ فوجی افسر بن جانا ایک نہایت ہی قابل فخر بات ہے۔ یہ بات نہایت درست اور حقیقت کے بالکل قریب ہے کہ فوج کے متعلق اس سلسلے وار کھیل نے اسے شہرت کے ابتدائی ذائقے سے آشنا کیا۔ جب وہ کبھی سڑک یا بازار میں نکلتا تو لوگ اس کی طرف اشتیاق بھری نظروں سے دیکھتے اور اس کا نام لینے کے بجائے اسے ابھیمنایا فوجی کہہ کر پکارتے۔ اس کے بڑھتے ہوئے پرستاروں کے حلقے میں پنچھیل پارک کا "شیبا خاندان" بھی شامل تھا۔

گاوری کے والد رمیش کے لیے "فوجی" ایک خوبصورت اور حسین جنت کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ کھیل اسے تیس سال پہلے اکیڈیمی میں گزرتے ہوئے زمانے میں واپس لے گیا تھا۔ ایک قسط میں دکھایا گیا کہ شاہ رخ اپنے ماتحتوں کو "فوجی ورزش" کے لیے احکامات جاری کر رہا ہے۔ اس نے یہ منظر نہایت صراحت اور حقیقی انداز میں عکس بند کروایا۔ رمیش شاہ رخ خان کی اداکارانہ مہارت اور ایک مشکل فوجی معمول کو نہایت مہارت کے ساتھ انجام دینے کی صلاحیت سے بہت متاثر ہوا حالانکہ بہت ہی تجربہ کار فوجی بھی یہ مشکل فوجی معمول بخوبی انجام دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ رمیش کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ اداکار اس کی بیٹی کے ساتھ رومانی تعلق کے حوالے سے ملاقاتیں بھی کر چکا ہے۔ ایک دفعہ جب اس گھرانے کے تمام افراد ایک ریستوران میں رات کا کھانا کھانے گئے تو انہوں نے شاہ رخ خان کو بھی وہیں بیٹھے دیکھا۔ وہ یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے اور بہت متجسس بھی ہوئے کہ شاہ رخ خان ایک ایسی قمیص پہنے ہوئے جس طرح کی قمیصیں ان کے ادارے نے حال ہی میں ایک فرانسیسی خریدار کے لیے تیار کی تھیں۔ یہ کپڑے مقامی طور پر دستیاب نہیں تھے۔ سویتا نے کہا "دیکھو! ایک فوجی لڑکا ہمارے ادارے کی تیار کردہ قمیص پہنے ہوئے ہے۔" جہندر استعجاب میں مبتلا تھا کہ شاید کسی نے یہ قمیص کارخانے سے چوری کی تھی۔ گاوری بھی وہاں موجود تھی لیکن اس نے بظاہر اس شخص (شاہ رخ خان) اور قمیص کو نظرانداز کر رکھا تھا جو اس نے اس شخص کو تحفے میں دی تھی۔

اور پھر بالآخر ہندو لڑکی اور مسلمان لڑکے کے درمیان رومانی تعلقات پر مبنی اپنے اندر

بدنامی اور رسوائی سمیٹے ہوئے یہ افواہ گاوری کے گھرانے کے کانوں میں جا پہنچی۔ اس کے پریشان اور مضطرب والدین اس افواہ کا حل سوچنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ وہ کٹر مذہبی نہیں تھے اور مخصوص مذہبی رسوم اور پوجا (عبادت) پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ در حقیقت رمیش اور سویتا نے بھی آپس میں رومانی تعلق قائم کرنے کے بعد شادی کی تھی اور اس نسل کے لحاظ سے یہ ایک انوکھی بات تھی جب اکثر شادیاں والدین کی مرضی اور پسند کے مطابق انجام پاتی تھیں۔ یہ لوگ آزاد خیال اور مہربان و شفیق والدین تھے۔ گاوری بچپن ہی سے فرمانبردار اور قناعت پسند تھی۔ جب وہ بچی تھی تو گاوری نے کسی چیز کے حصول کے لیے بہت کم شور اور واویلا مچایا تھا اور سویتا اس خدشے میں مبتلا رہتی تھی کہ کیا اس کی بیٹی کی ذہنی حالت درست ہے؟ یہ امر نہایت ناقابل یقین معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس انداز میں خاندانی و مذہبی روایات کی خلاف ورزی کرے گی۔ رمیش کہنے لگا: "میرا خیال ہے کہ میری تربیت میں کچھ کمی رہ گئی ہے۔"

ایک دن رمیش کو خبر ہوئی کہ گاوری، پنچھیل کلب میں ایک لڑکے کے ساتھ موجود ہے۔ وہ فوراً وہاں پہنچا لیکن گاوری کی عم زاد پری آنکا نے رمیش کو آتے ہوئے دیکھ لیا اور گاوری کو خبردار کر دیا۔ گاوری وہاں سے فرار ہو گئی جب کہ شاہ رخ خان نے اپنا چہرہ بیڈمنٹن کے ریکٹ کے پیچھے چھپا لیا۔ اسکے بعد گاوری اور شاہ رخ خان نے فیصلہ کیا کہ اب وقت آن پہنچا ہے کہ گاوری کے گھرانے کو ایک ایک کر کے سچائی سے آگاہ کر دیا جائے۔ اس فیصلے کے مطابق شاہ رخ خان نے گاوری کی ممانی نیرو کو بہلانے پھسلانے کا کام شروع کر دیا جو اس گھرانے میں سب سے کم جارح تصور کی جاتی تھی۔ نیرو گاوری کی دوسری ماں جیسی تھی، اس نے گاوری کی پرورش میں بھی مدد کی تھی۔ شاہ رخ خان اور گاوری نے نیرو سے ایک ریستوران میں ملاقات کی اور اسے مختلف ترغیبات کے ذریعے رجھانے کی کوشش کی اور اس ضمن میں شاہ رخ خان نے نیرو کو اپنے مختلف انعامات اور سندیں دکھائیں۔ اس نے ازراہ مذاق اپنا مذہب بھی تبدیل کرنے کی پیشکش کی۔ شاہ رخ خان نے نیرو سے کہا: "میں ہندو ہو جاؤں گا اور اپنا نام تبدیل کر کے جیتندر کمار ٹلی رکھ لوں گا لیکن میں کس طرح بچ پاؤں گا؟" اس بے مزہ مذاق کے باوجود نیرو، شاہ رخ خان کو اس قدر پسند کرنے لگی تھی کہ اس نے اپنے خاوند جہندر کو شاہ رخ خان سے ملاقات پر آمادہ کر لیا۔ جہندر بھی اپنی بیوی کا ہمنوا ہو گیا۔ اس نے شاہ رخ خان کو دعوت دی کہ وہ ان کے گھر ایک تقریب کے موقع پر آئے اور گاوری کے والدین سے ملاقات کرے۔

تقریب کے موقع پر بہت سے مہمانوں نے شاہ رخ خان کو ''فوجی لڑکے'' کی حیثیت سے پہچان لیا۔ کسی نہ کسی بہانے رمیش کی شاہ رخ خان سے ملاقات کرائی گئی۔ اس نے شاہ رخ خان سے نام پوچھا۔ حواس باختہ ہو کر شاہ رخ خان نے یکدم کہا: ''جناب آپ نے میرا سلسلہ وار کھیل دیکھا ہوگا۔ اس کھیل میں مجھے ابھیمنا کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ رمیش نے کہا: ''کھیل کو بھول جاؤ اور اپنا اصلی نام بتاؤ؟'' اور پھر شاہ رخ خان نے جواب دیا: ''جناب! میرا نام شاہ رخ خان ہے۔'' رمیش نے محسوس کر لیا کہ کہیں نہ کہیں غلطی ضرور ہوگئی ہے۔ اس نے شاہ رخ خان سے کہا: ''یہاں کچھ معزز لوگ موجود ہیں اور میں یہاں کسی بھی قسم کا کوئی تماشا نہیں چاہتا، بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے رخصت ہو جاؤ!'' رخصت ہونے سے قبل شاہ رخ خان باورچی خانے گیا اور سویتا کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اسے پکوڑے کھلائے۔ وہ حیران تھی کہ ''فوجی'' نامی سلسلے وار کھیل کا نفیس اور دلکش اداکار کیوں قبل از وقت جا رہا ہے۔

رمیش کے لیے شاہ رخ خان کے مذہب سے کہیں زیادہ اس کی اداکاری کا پیشہ ایک گھمبیر مسئلہ تھا۔ رمیش ہندوستان کے صدر ذاکر حسین کے ساتھ بطور سیکرٹری خدمات انجام دے چکا تھا اور اسے فلمی اداکاروں سے بھی ملاقاتوں کا موقع ملتا رہتا تھا۔ تمام اداکاروں کے متعلق اس کی رائے مخالفانہ تھی۔ 1980ء کی دہائی میں متوسط طبقے کے ہندوستانی نوجوان ہندی فلموں میں کام کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ معزز گھرانے کے نوجوان ہی ڈاکٹر اور انجینئر بنتے یا سرکاری ملازمتیں اختیار کرتے۔ ہندوستانی فلمی صنعت جس میں اخلاقی قدریں نام کو نہ تھیں اور انتہا پسندی بھی انتہا پر تھی، ایک بہت ہی مشکوک معاشرہ تھا۔ یہ اخلاق سے گرے ہوئے دولت مند لوگ ہی تھے جو جنسی طور پر بھی جنونی تھے اور خوبصورت و حسین بھی بہت تھے جنہوں نے زیادہ تر بری فلمیں تیار کی تھیں۔

سویتا نے کہا: ''جب مجھے معلوم ہوا کہ گاوری کا دوست کون ہے تو تقریباً مجھے حملۂ دل ہونے ہی کو تھا۔ ٹیلی ویژن کے ایک اداکار کی حیثیت سے مجھے وہ پسند تھا لیکن متوقع داماد کی حیثیت سے مجھے اس سے نفرت تھی۔'' پھر سویتا نے اپنی بیٹی اور شاہ رخ خان کے درمیان قطع تعلقی کرانے کے ضمن میں ایک مشہور نجومی سے مدد چاہی مگر اسے بتا دیا گیا کہ یہ سب کچھ ناممکن ہے۔ اسی دوران گاوری کا بڑا بھائی وکرانت اپنی بہن کی عزت و حرمت کی حفاظت کے لیے بہت مشتاق تھا خصوصاً ایک ایسے مسلمان لڑکے کے ہاتھوں وہ اپنی بہن کی عزت و حرمت پامال

ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا جس کا باپ فوت ہو چکا تھا اور اس کے کسی پیشے میں آگے بڑھنے کے امکانات بھی محدود تھے۔ وکرانت ایک غنڈے کی حیثیت سے مشہور تھا اور اس نے بندوق کے زور پر اسے دھمکایا ڈرایا بھی تھا لیکن یہ سب کچھ اس کی بہن کے عاشق کو خوفزدہ نہ کر سکا۔ تجندر جس کے دل میں شاہ رخ خان کی انتہائی قدر و منزلت تھی نے رمیش اور سویتا کو ان دونوں کو شادی کے بندھن میں باندھنے کا مشورہ دیا۔ اس نے گاوری کے والدین سے کہا کہ وہ مذہب کی خاطر اس کام سے پیچھے نہ ہٹیں اور لوگوں کی اس بات پر عمل کریں ''بندہ دیکھو کیسا ہے'' یعنی ''کسی شخص کے کردار پر غور کرنا چاہیے کہ اس کا کردار کیا ہے۔'' شیبا ہاؤس کی فضا میں کشیدگی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

ایک مرحلے پر مایوسی کے عالم میں گاوری نے شاہ رخ خان سے کہا کہ وہ جھوٹ بول دے۔ گاوری کے ایک بینک کے کھاتے میں اٹھائیس ہزار روپے (445 ڈالر) موجود تھے۔ اس نے شاہ رخ خان سے کہا کہ وہ اس کے والدین کو بتا دے کہ اس کے پاس بیس لاکھ روپے (45000 ڈالر) موجود ہیں۔ شاہ رخ خان نے تجندر سے کہا: ''میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتا۔'' تجندر نے پوچھا: ''کیوں؟'' شاہ رخ خان نے کہا: ''تم صرف یہ کہہ دو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' تجندر نے کہا: ''اگر تم انہیں یہ بتا دیتے ہو کہ تمہارے پاس اٹھائیس ہزار روپے ہیں اور تم ان کی بیٹی ممبئی لے جا رہے ہو تو وہ بے ہوش ہو جائیں گے۔'' شاہ رخ خان نے جواب دیا: ''نہیں بالکل نہیں'' شاہ رخ نے کمال یقین سے کہا ''کیونکہ جانے سے قبل میں انہیں یقین دلا دوں گا کہ میں ایک کامیاب اداکار بننے والا ہوں۔ تم دیکھ رہے ہو امیتابھ بچن اب سبکدوش ہو چکا ہے۔ دلیپ صاحب بہت بوڑھے ہیں اور پھر ان کے بعد مجھے صرف ایک ہی شخص نظر آتا ہے اور وہ ہے شاہ رخ خان!'' شاہ رخ خان کو ہمیشہ سے ہی یقین کامل تھا کہ وہ ایک دن اس شہر پر حکمرانی کرے گا۔

❁

ساتواں باب

ٹیلی ویژن کے ماہ وسال

1990ء کی ایک صبح شاہ رخ خان ممبئی کے ہوائی مستقر پر اترا تو فضا میں رطوبت بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ ''اسکرا'' Iskra جیسے انوکھے نام کے حامل ایک ٹی وی ادارے نے اسے اس شہر میں مدعو کیا تھا۔ شاہ رخ خان پہلے ہی سے معمولی رہائش اور طویل اوقات کار کا عادی تھا لیکن سفری سہولیات کے ضمن میں وہ معمولی انتظامات کا قائل نہ تھا اور اس نے ہمیشہ ایک بہترین ذریعہ سفر کا انتخاب کیا تھا۔ وہ ریل گاڑی میں سفر نہیں کرتا تھا بہر حال اس نے ٹی وی کے پروڈیوسر کو اس حد تک رعایت دے دی کہ وہ ہوائی جہاز کا سستا ترین ٹکٹ قبول کرنے پر رضامند ہو گیا یا پھر اپنی جیب سے ہوائی جہاز کا ٹکٹ خریدا۔ شاہ رخ خان کے لیے ''ایئر انڈیا'' کی اس پرواز کے لیے ''اسکرا'' نے ٹکٹ خریدا جس نے صبح ساڑھے چار بجے دہلی سے روانہ ہونا تھا اور ممبئی میں مختصر وقت کے لیے رکنے کے بعد غیر ملک کے لیے روانہ ہو جانا تھا۔

شاہ رخ خان کو اس کے افراد خانہ اور تھیٹر ایکشن گروپ کے دوستوں نے نہایت گرم جوشی سے رخصت کیا اور یہ الوداعی تقریب نہایت شان وشوکت سے منائی گئی۔ یہ ایک بہت ہی اہم اور عظیم کامیابی تھی، دیومالائی ''ممبئی'' میں اداکاری کے ایک موقع کا حصول، مستقبل کی عظیم کامیابی کا پیش خیمہ تھا۔ اب شاہ رخ خان ایک ایسے راستے کا راہی تھا جہاں شہرت اور دولت اس کے ساتھ ساتھ سفر کرتی تھیں۔ اب اسے کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا لیکن دو گھنٹے بعد جب وہ ممبئی کے ہوائی مستقر پر اترا تو ٹی وی ادارے کا کوئی اہلکار وہاں موجود نہ تھا۔ جس اہلکار کو شاہ رخ خان کو لانے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی وہ سوتا ہی رہ گیا تھا۔

شاہ رخ خان نہایت بے چینی سے ٹی وی ادارے کے کسی اہلکار کا منتظر تھا، اس دوران وہ ہوائی مستقر پر موجود اژدحام کا جائزہ لیتا رہا۔ عازمین حج کو مشرق وسطیٰ لے جانے والی

پرواز روانگی کی منتظر تھی اور ہوائی مستقر برقعہ پوش مسلمان خواتین سے اٹا پڑا تھا لیکن ''اسکرا'' کے متعلقہ کسی شخص کا وہاں نام ونشان تک نہ تھا۔ شاہ رخ خان پریشان ہو گیا۔ کیا یہ دعوت محض دھوکا تھی یا اسے بے وقوف بنایا گیا تھا۔ ممبئی ایک اجنبی، ہیبت ناک شہر تھا شاہ رخ خان اس سے قبل یہاں کئی دفعہ آ چکا تھا لیکن ممبئی سے دہلی واپس جانے کی شرمندگی صریحاً ناکامی تھی اور اسی قدر حوصلہ شکن بھی تھی۔

شاہ رخ خان نے خود کو ایک ٹیلی فون بوتھ میں بند کر لیا اور سکے تلاش کرنے کے لیے اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ وہ اپنی والدہ کو فون کر کے یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ اس کی یہ بڑی کامیابی محض ایک بھونڈا انداق ہے۔ اب آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے تھے۔ ٹیلی فون بوتھ کے پاس سے گزرتی ہوئی ایک خاتون نے اسے دیکھ لیا کہ ایک لڑکا ٹیلی فون بوتھ میں پاگل ہو رہا ہے اور چلا بھی رہا ہے۔ سیاہ لباسوں میں ملبوس چڑیلوں جیسی صورتیں ٹیلی فون بوتھ کے شیشے کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں اور وہ ہاتھ اٹھا کر دعائیہ انداز میں کہہ رہی تھیں: ''بیٹے فکر مت کرو حج کے موقع پر ہم تمہارے لیے دعا کریں گے۔ تم ایک مشہور اداکار بنو گے۔''

پھر وہاں اچانک ''اسکرا'' اور اس کے ذیلی ادارے ''روگوپیگ'' Rogopag کے کچھ لوگ نمودار ہوئے۔ یہ دونوں ادارے باہمی تعاون کے ذریعے کام کرتے تھے اور ان کے تین ڈائریکٹر تھے۔ کندن شاہ اور دو بھائی سعید اور عزیز مرزا۔ کندن اور سعید دونوں پونا میں واقع "Film and Television Institute of India" سے گریجویٹ تھے۔ ان کی ہر تخلیق میں ''بائیں بازو'' کی چھاپ نمایاں تھی۔ ''اسکرا'' جس کا مطلب ''شعلہ'' ہے ایک ایسے اخبار کا نام تھا جس کا آغاز لینن نے کیا تھا۔ روگوپیگ 1922ء میں بننے والی ایک فلم کا نام تھا جس میں چار مختصر فلمیں شامل تھیں۔ جن کی ہدایتکاری جدید نظریات کے حامل ہدایتکاروں نے کی تھی اور ان میں Paolo Padolini, Jean- Luc Godard اور Roberto Rossellini شامل تھے۔ کندن، عزیز اور سعید نے Godard اور Fellinie کی راہ پر چلتے ہوئے دنیا کو تو نہیں مگر کم از کم ہندوستان کی فلمی صنعت اور ٹیلی ویژن میں انقلاب لانے کا خواب دیکھا تھا۔

کندن شاہ کی پہلی فلم ''جانے بھی دو یارو'' ہندوستانی شہروں میں مروج بدعنوانی کے بارے میں ایک نہایت ہی کثیف اور تکلیف دہ مزاحیہ طنز تھی۔ 1983ء میں تیار ہونے والی یہ فلم ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی تھی اور اس فلم نے خود کو ایک ممتاز اور اصلی آواز کے طور پر منوالیا

جب تھیٹر ایکشن گروپ کے ساتھیوں کو یہ معلوم ہوا ہے کہ شاہ رخ خان ''اسکرا'' میں شامل ہو رہا ہے تو انہوں نے شاہ رخ خان سے ایک درخواست کی کہ وہ کندن کے پاؤں چوم لے۔ سعید مرزا نے بھی بے لاگ، دوٹوک اور حقیقی فلمیں تیار کرنے کے ضمن میں شہرت حاصل کر لی تھی۔ ''اسکرا'' کی طرف سے پیش کیے جانے والا ٹی وی پروگرام ''نکڑ'' کو تنقیدی لحاظ سے بھی سراہا گیا اور مجموعی طور پر بھی اسے مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس وقت کندن، سعید اور عزیز کو ان کی عزت وتکریم کے پیش نظر ''برہما وشنو مہیش'' یا ہندوستانی ٹی وی کی ''مقدس مثلث'' کہا جاتا تھا۔

اس مثلث نے سلسلے وار کھیل ''فوجی'' میں شاہ رخ خان میں موجود اداکارانہ صلاحیتوں کو بھانپ لیا۔ وہ ابھی نو آمیز تھا لیکن دوسرے اداکاروں سے ممتاز اور الگ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی اداکاری میں ایک جذبہ اور ولولہ موجود تھا۔ جب شاہ رخ کی عزیز سے ملاقات ہوئی تو اس نے بالآخر اپنے ایک دوست کو بلایا جس نے اپنی گاڑی میں شاہ رخ خان کو ہوائی مستقر سے ''اسکرا'' کے دفتر پہنچا دیا...... پھر وہاں ان کے درمیان فوری طور پر رابطہ قائم ہو گیا۔ شاہ رخ خان نے عزیز کو اس کے بیٹے کے متعلق یاد دلایا۔ شاہ رخ خان کو ان دو سلسلے وار کھیلوں میں اداکاری کے لیے منتخب کر لیا گیا جو یہ ادارہ تیار کر رہا تھا۔ شاہ رخ خان کو یہاں روزگار بھی ملا اور ساتھ ہی ایک گھریلو ماحول بھی میسر ہوا۔

اب شاہ رخ خان دہلی اور ممبئی کے درمیان لڑھک رہا تھا۔ عزیز اور اس کی بیوی نرملا نے شاہ رخ خان کی ذمہ داری سنبھال لی۔ نرملا (جس کا جون 2003ء میں انتقال ہو گیا تھا) خاص طور پر اس نوجوان لڑکے کے بارے بہت فکر مند تھی جو اس اجنبی شہر میں اپنے لیے پناہ گاہ ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ بعض اوقات شاہ رخ خان ''اسکرا'' کے خالی دفتر میں صوفے پر بھی سو جاتا۔ اکثر اوقات ہارون اور شاہ رخ خان ادارے کے خاندانی خالی گھر میں بھی قیام پذیر ہوتے۔ شاہ رخ خان سے پانچ سال چھوٹا ہارون اس کا گہرا دوست اور راز دار بن گیا۔ شاہ رخ دن بھر فلمبندی اور ملاقاتوں جبکہ ہارون کالج میں مصروف رہتا۔ شام کو یہ دونوں نہایت شوق سے والی بال کھیلتے پھر رات کو عزیز اور نرملا کے ساتھ کھانا کھاتے اور پھر اپنے گھر چلے جاتے۔ راستے میں پوجا دیوی ٹیلی فون ایکسچینج رکتے جہاں سے شاہ رخ خان طویل فاصلے کے دو فون کرتا ایک گاؤری کو اور ایک فاطمہ کو جو نہایت تیزی سے بیمار ہوتی جا رہی تھی۔ شاہ رخ خان نے ''اسکرا'' کے لیے تین سلسلے وار کھیلوں ''امید''، ''وگلے کی دنیا'' اور ''سرکس'' میں اداکاری کی۔ آخری

سلسلے وار کھیل ''سرکس'' ان کے اپنے خاندانی اداکار پون ملہوترا کو مرکزی کردار دینے کے لیے شروع کیا گیا لیکن اسے ایک فلم باغ بہادر (چیتا رقاص) میں مرکزی کردار کی پیشکش ہوئی اور وہ اس سلسلے وار کھیل کے لیے وقت نہ نکال سکا۔ اس لیے شاہ رخ خان کو ''سرکس'' میں شامل کر لیا گیا۔ 1990ء میں نشر ہونے والا یہ کھیل اس وقت شاہ رخ خان کا آخری ٹی وی کھیل ثابت ہوا۔ کندن، سعید اور مرزا نے ہندوستانی سرکس کی زندگی کے متعلق بیس اقساط پر مشتمل اس کھیل کی ہدایتکاری کی۔ شاہ رخ خان نے ''شیکھر ان'' سرکس کے مالک کے بیٹے کا کردار ادا کیا جو غیر ملک سے تعلیم حاصل کر کے واپس لوٹتا ہے اور اپنے باپ کو اس زوال پذیر کاروبار کو فروخت کرنے کے لیے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ مختلف دلائل پیش کرتا ہے مثلاً یہ کہ سینما، ویڈیو گیمز اور ٹیلیویژن جیسے جدید تفریحی ذرائع کے مقابلے میں سرکس بمشکل ہی شائقین کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے لیکن جب وہ خود سرکس میں کچھ وقت صرف کرتا ہے تو پھر وہ آہستہ آہستہ اس ولولہ انگیز دنیا کی سحر انگیزی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

اس ڈرامے کی فلمبندی ان مقامات پر ہوئی جہاں حقیقی طور پر سرکس موجود تھے۔ اس ڈرامے کے فنکاروں اور عملے نے ''اپالو سرکس'' کے ساتھ ساتھ سفر کیا۔ تین ماہ کے عرصے کے دوران انہوں نے گوا اور مہاراشٹر میں چھوٹے شہروں اور دیہات کا دورہ کیا۔ سرکس اپنے وضع کردہ قواعد وضوابط پر مشتمل ایک انوکھی دنیا کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ چکا چوند دنیا کی ایک اور قسم تھی کسی حد تک پسماندہ اور مختصر لیکن جوش وجذبے اور داد سے بھرپور۔ لڑکیوں اور لڑکوں کو الگ الگ ٹھہرایا جاتا تھا اور انہیں رومانی تعلقات قائم کرنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ قدرتی طور پر یہ صورت ہمیشہ ہی موجود رہی۔ ایک منظر جس میں ایک لڑکی دوسری لڑکی کے لیے توازن مہیا کرتی اور ایک لڑکا جو اس کے پاؤں پر پیار رکھتا، ڈاک کی ترسیل پر مبنی خدمات وسہولیات کے طور پر کام کرتا۔ لڑکا اور لڑکی پیسے میں کرنسی نوٹوں کا تبادلہ کرتے اور پھر اپنے اپنے مقامات پر چلے جاتے۔ ان نوجوان لڑکے لڑکیوں کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی کہ وہ ورزشی جھولے کے فنکار بن جائیں۔ اس کوشش اور خواہش میں بہت سے نوجوان لڑکے لڑکیاں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے یا معذور ہو گئے لیکن کسی نے بھی یہ خواہش اور کوشش ترک نہ کی کیونکہ انہیں یہ بخوبی علم تھا کہ سرکس کی اصل زندگی تو یہی ہے...... سرکس کے ان فنکاروں کی ساتھ ہفتوں رہنے کے بعد بالآخر شاہ رخ خان نے یہ اہم سبق سیکھا ''ہو گیا تو کرتب، گر گیا تو حادثہ'' سرکس کے فنکار

اکثر یہی کہتے تھے: "اگر آپ رسی پر چلنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ ایک کرتب ہے اور اگر گر گئے تو یہ ایک حادثہ ہے۔"

اشوتوش نامی ایک فنکار ورزشی جھولوں کا ایک فنکار تھا۔ شاہ رخ خان کے برعکس اس کی فنکارانہ زندگی بیزار کن "کریکٹر کرداروں" تک محدود ہو گئی تھی۔ لہٰذا بالآخر اس نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا راستہ بدل لیا، ہدایتکار بن گیا اور اس کی فلم "لگان" آسکر ایوارڈ کی نامزدگی کے لیے منتخب ہوئی۔ 2004ء میں اس نے اپنی مشہور فلم "سوادس" (ہمارا ملک) کے لیے ہدایتکاری کی جس میں شاہ رخ خان کا کردار مرکزی تھا...... لیکن "سرکس" میں اشوتوش ان بہت سے فنکاروں میں سے ایک فنکار تھا جو رات کے آٹھ بجے سے صبح تک مختلف انداز میں بے لباس ہو جاتے۔ یہ لوگ دن کا زیادہ حصہ عکس بندی میں مصروف رہتے اور پھر سورج طلوع ہونے تک چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر تاش کھیلتے رہتے۔ انہیں بیدار کرنے پر راجو بلیچندانی شاہ رخ کے لیے ہمدردی کا مظاہرہ کرتا اور اسے سب سے آخر میں بیدار کرتا۔ شاہ رخ خان اکثر اسی وقت لوٹا اور بالٹی ہاتھ میں لیے پہلے تو ڈاڑھی بناتا اور پھر غسل کرتا۔

شاہ رخ خان نے ٹی وی کے لیے بھی دھیما لب ولہجہ اختیار نہیں کیا جس طرح سٹیج پر وہ تھرکتا، ناچتا اور ٹھاٹ دار اداکاری کرتا اس نے ٹی وی پر بھی اپنا یہی انداز برقرار رکھا۔ اشوتوش کا کہنا تھا: "وہ اس وقت ولولہ انگیز تھا کہ اگر اسے کوئی جذباتی کردار دیا جاتا تو وہ اس جذباتی کردار کو بیس گنا زیادہ شدت کے ساتھ ادا کرتا۔ اس کا رویہ بہت ہی حیرت انگیز تھا: اداکاری کرنے کا یہی میرا طریقہ ہے اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ ہے؟"

شاہ رخ خان کی زبان سے گولی کی رفتار سے نکلتے ہوئے مکالمے اور مرکزی کردار ادا کرنے کے ضمن میں بسرعت اور تیز رفتار اداکاری نے اس کے غیر متوقع پرستاروں کو بھی اس کی طرف متوجہ کر دیا۔ ایرآرٹی کے ہدایتکار مانی کاؤل کو شاہ رخ خان میں کچھ "المیاتی احساس نظر آیا۔ "مجھے اس کی آواز بہت پسند آئی...... ایک ان کہی فریاد التجا!!" ماضی کی فلمیں عام طور پر کم مشہور یا شوقیہ اداکاروں پر مشتمل ہوتی تھیں اور ابھی تک شاہ رخ خان مکمل اور بھرپور شہرت حاصل نہیں کر سکا تھا لیکن مانی نے اپنے قواعد وضوابط میں ترمیم کی اور شاہ رخ خان کو اپنی ایک فلم میں ایک کردار کی پیشکش کی جس کی کہانی دستووسکی کے ناول "The Idiot" سے ماخوذ تھی۔ کندن اور سعید کے مانند مانی بھی فلم انسٹیٹیوٹ کا گریجویٹ اور فلمی دنیا کی ایک مشہور

شخصیت تھی۔ بہر حال فلموں کے شائقین کے مطابق اس کی فلمیں فلسفے اور دینیات کے مسائل پر مشتمل ہوتی تھیں۔ اس کی بہترین فلمیں ہر لحاظ سے نہایت ہی خوبصورت تھیں لیکن انہیں سمجھنا بہت ہی مشکل ہوتا تھا۔

شاہ رخ خان جبلی طور پر فلموں کی طرف راغب نہیں تھا۔ اس میں جوش، جذبہ اور ولولہ تو موجود تھا لیکن اس کی خواہشات وتمناؤں کا ارتکاز ہندی فلموں کا ہیرو بننا نہیں تھا۔ وہ اوپرا ونفرے کے مانند ایک مشہور ٹی وی شخصیت بننا چاہتا تھا جو کسی "ٹاک شو" کی میزبانی کے فرائض سرانجام دے۔ ہارون کے الفاظ میں "اس کا مقصد ٹی وی کا بے تاج بادشاہ بننا تھا۔" اسے بخوبی علم تھا کہ یہ ایسا میدان ہے جہاں بلاشرکت غیرے حکومت کی جا سکتی تھی۔ ہندوستانی فلموں کے لیے گاؤری کی نفرت نے بھی فلموں میں کام کرنے کے اس کے جذبے کو کم کیا۔ ان دونوں کے تعلقات میں اس کا مسلمان ہونا بھی ایک رکاوٹ تھی۔ ہندوستانی فلموں کے ایک مسلمان ہیرو کی حیثیت سے اس کے ڈگمگاتے رومانی تعلقات مزید ابتری کا شکار ہو جاتے لیکن مانی کاؤل نے "ہندی فلمیں" نہیں بنائیں۔ اس کی فلمی دنیا "ہندی فلموں" سے کہیں الگ اور ماوراتھی۔ اس کے علاوہ فلم، ٹیلی ویژن کے لیے چار مختصر سلسلے وار ڈراموں کے لیے بنائی جاتی تھی۔ عزیز نے شاہ رخ خان کو مشورہ دیا کہ اسے تجربہ حاصل کرنے کے لیے ہدایتکار کے ساتھ کام کرنا چاہیے۔ "The Idiot" وہ پہلا ناول تھا جو شاہ رخ کے والد میر نے اسے دیا تھا...... میر نے یہ کتاب دہلی کے روسی ثقافتی مرکز سے چار روپے میں خریدی تھی۔ کچھ جذباتی وجوہات اور شدید تجسس کے باعث شاہ رخ خان "The Idiot" میں کام کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

مانی اپنے اداکاروں کو خود اداکاری کر کے کم ہی دکھاتا۔ اس کے بجائے وہ اپنے اداکاروں کو کرداروں کے لب ولہجے اور چال ڈھال سے آگاہ کرتا تاکہ وہ خود ہی سمجھ جائیں کہ انہوں نے یہ کردار کس طرح ادا کرنا ہے۔ مانی کی ہدایتکاری بھی اس کی فلموں کے مانند شاندار طور پر پراسرار اور پیچیدہ ہوتی تھی۔ ایک مرحلے پر اس نے شاہ رخ خان کو ہدایت دیتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے بالوں کو اس طرح چھوئے کہ یہ بال نہیں بلکہ یہاں بالوں کی موجودگی کا امکان ہے۔ ایک اور موقع پر مانی شاہ رخ خان کو ساحل سمندر پر لے گیا کہ اسے تیسری یا چوتھی لہر کے مانند نہیں بلکہ ساتویں لہر کے مانند ہونا چاہیے۔ یہ گیان ودھیان کی ایک مشق تھی جو اداکار کے ارتکاز کو بہتر بنانے کے لیے تھی۔ "The Idiot" 1991ء میں "دوردرشن" پر نشر ہوئی۔ مانی نے

اس کھیل کی بطور فلم تدوین بھی کی لیکن "In Which Annie Gives It Those Ones" کی طرح اسے کبھی کسی نمائش کے لیے پیش نہیں کیا گیا۔

تقریباً اسی دور میں ایک اور شاہکار ناول پر ہندی فلم بنائی جا رہی تھی۔ کیپٹن مہتا جس نے مانی، سعید اور کندن کے بعد فلم انسٹیٹیوٹ سے گریجویشن کی ''مادام باوری'' کو ''مایا میم صاحب'' کے نام سے تیار کر رہا تھا۔ وہ ''فوجی'' اور ''سرکس'' کی چند اقساط دیکھ چکا تھا۔ اس نے فوراً عزیز کو بلایا اور اس سے پوچھا: ''یہ بچہ کون ہے؟'' پھر شاہ رخ خان کو مایا کے ایک عاشق کے طور پر منتخب کر لیا گیا۔ یہ فلم بہت ہی سنجیدہ اور دقیق تھی لیکن مروج ہندی فلموں کے بہت قریب تھی۔ ایک مرحلے پر شاہ رخ خان روایتی ہندوستانی فلم کے مانند برفیلے پہاڑوں کے درمیان ہیروئن کے ساتھ اچھل کود کر رہا تھا۔ بالآخر ہندوستانی روایتی فلموں کا روایتی ''فارمولا'' واپس آ گیا تھا۔

اس زمانے میں ہندوستانی فلمیں تخلیقیت کے مختلف مراحل طے کر رہی تھیں۔ امیتابھ بچن کا ''اینگری ینگ مین Angry Young Man'' کا ٹوٹکا اسے کامیاب کیے دے رہا تھا لیکن ابھی تک ایک نیا ''ہیرو'' پردۂ سیمیں پر نمودار نہیں ہوا تھا۔ بہرحال تشدد اور مار دھاڑ کا زور اب کم ہو رہا تھا جو امیتابھ بچن کی فلموں کی کامیابی کا ضامن تھا۔ 1988ء اور 1989ء میں رومان پر مبنی دو رسیلی اور میٹھی فلموں نے میلہ لوٹ لیا۔ دونوں ''قسمت سے قسمت تک'' اور ''میں نے پیار کیا'' میں اداکار نئے تھے خوبصورت اور سحرانگیز موسیقی تھی اور کم سے کم خون ریزی دکھائی گئی تھی۔ فلموں کے شائقین جو دو دہائیوں سے تشدد اور خون ریزی دیکھ دیکھ کر بے حس ہو چکے تھے ان رومانی فلموں نے ان میں ترنگ کی لہر دوڑا دی۔ مختلف رسوم و رواج اور انتظامی بدعنوانیوں کے خلاف کچھ کہنے کے بجائے اس فلم میں محبوب اور محبوبہ شرماتے لجاتے ایک دوسرے کے بازوؤں کو برائے نام چھوتے، گانے گاتے نظر آئے۔ ان فلموں کے ذریعے شاہ رخ خان کے ساتھ ساتھ دو مزید اداکاروں کی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز ہوا جنھوں نے 1990ء کی دہائی میں ہندوستانی فلمی صنعت پر راج کرنا تھا عامر خان اور سلمان خان۔

پھر اچانک ہندوستانی فلمی صنعت میں نئے رجحانات اور میلانات ابھر آئے۔ ان کامیاب فلموں کی نقالی کے ذریعے پیش کار اپنی نئی فلموں کے لیے کامیابی کی امید کی خاطر

مرکزی کرداروں کے لیے نئے اداکار منتخب کر رہے تھے لیکن ''حفظ ماتقدم'' کے طور پر مشہور اداکاروں کو بھی کام دیا جا رہا تھا۔ شاہ رخ خان پہلے ہی ٹیلی ویژن پر کافی زیادہ شہرت حاصل کر چکا تھا۔ شاہ رخ خان کے بچپن کی دوست امریتا سنگھ کے الفاظ کے مطابق: ''یہ ایک ایسا لمحہ تھا جب آپ نے واقعی یہ سنا کہ رتھ ممبئی میں داخل ہو رہی ہے اور شاہ رخ اس پر سوار ہے۔'' امریتا سنگھ 1981ء میں ممبئی منتقل ہو گئی اور ایک کامیاب ہیروئن بن گئی۔ شاہ رخ خان رومان پر مبنی فلموں میں کام نہیں کرنا چاہتا تھا جن میں ثانوی کردار محض بھرتی کے لیے ڈالے جاتے ہیں۔ اس نے بہت سی ایسی فلموں میں کام کرنے سے انکار کر دیا اور سکہ بند فلمسازوں کو بھی یہ کہہ کر پریشان کر دیا کہ اسے ''کہانی'' پر مشتمل فلمیں چاہئیں۔ ایک دفعہ فیروز خان کے دفتر سے اسے بلاوا آیا۔ یہ اداکار وہدایتکار ہندوستانی فلمی صنعت کا ''مارل بورو مین Marlboro Man'' کہلاتا تھا۔ غیر ملکی لباس پہنتا اپنے منہ میں سگریٹ ادھر ادھر گھمائے رکھتا اور نہایت ہی دقیق امریکی لہجے میں بات کرتا۔ جب شاہ رخ خان نے کہا کہ وہ کہانی کا مسودہ دیکھنا چاہتا ہے تو اس کا نائب بھڑک اٹھا اور کہنے لگا: ''تم چاہتے ہو کہ فیروز خان صاحب تمہیں کہانی سنائیں؟'' جس پر شاہ رخ خان نے فوراً جواب دیا: ''کیا میں کسی راہگیر سے کہوں کہ وہ مجھے کہانی سنائے؟'' فلمی دنیا میں کامیاب ہونے کے بعد شاہ رخ خان کی اس شیخی اور گستاخی کو اس کی فہم و فراست پر محمول کیا گیا لیکن ایک نوآموز کی حیثیت سے یہ ایک نہایت شدید گستاخانہ رویہ تھا۔ فیروز خان نے اسے دوبارہ کبھی نہیں بلایا۔

1980ء کی دہائی کے اواخر میں کہانی پر مبنی فلمی مسودے عنقا تھے۔ ہندوستانی فلمی صنعت ایک بے ترتیب پرلے درجے کی احمقانہ ایک معمولی صنعت کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اداکار بیک وقت زیادہ سے زیادہ مثلاً پانچ سے سات فلموں کے معاہدے کر لیتے اور ایک دن میں ادھر ادھر لڑھکتے ہوئے کم از کم تین مناظر فلم بند کرواتے۔ فلم بندی کے موقع پر متعلقہ عملہ اداکاروں کا گھنٹوں انتظار کرتا رہتا اور یہ صورت حال ایک معمول کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اس ضمن میں ایک غیر مصدقہ روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک معروف مصنف ان دو تین فلموں کے مناظر اکٹھے کر کے ایک نئی کہانی تخلیق کر دیتا جن کی بیک وقت فلمبندی جاری ہوتی۔ بعض اوقات دونوں فلموں کا عملہ غلط مناظر فلما لیتا اور اپنی غلطی کا احساس بعد میں ہوتا۔

1990ء، نومبر کے اواخر میں ہارون اور شاہ رخ خان مضافاتی علاقے میں واقع باندرا انٹرنیشنل نامی ہوٹل میں صبح دو بجے کافی پینے کے دوران آپس میں تبادلہ خیالات کر رہے تھے۔ دونوں کا مزاج تلخ ہو رہا تھا۔ ہارون کا اس وقت ایک ہندو لڑکی کے ساتھ معاشقہ چل رہا تھا اور اس ضمن میں ان کے درمیان ملاقاتیں بھی جاری تھیں۔ یہ دونوں گھنٹوں اکٹھے بیٹھے اپنے رومانی تعلقات کے بارے پریشان ہوتے رہتے اور اس سنگدل و بے رحم دنیا کے متعلق شکوہ وشکایت کرتے جس نے ان دونوں نفیس مسلمان لڑکوں کو گوناگوں مسائل سے دوچار کر دیا تھا جو ہندو لڑکیوں سے پیار کرتے تھے۔ ہارون کہہ رہا تھا: ”ہم دونوں وہ اچھے انسان ہیں جنہیں ان کی محبوباؤں کی محبت سے محروم کر دیا گیا ہے۔“ اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے اور کافی پینے کے بعد جب وہ وہاں سے رخصت ہونے لگے تو ایک شخص نے انہیں روک لیا اور پوچھنے لگا: ”کیا تم شاہ رخ خان ہو؟“ یہ انور خان تھا جو بعد ازاں شاہ رخ خان کا کاروباری سیکرٹری بنا۔ انور خان نے شاہ رخ کا تعارف ایک اداکار و فلمساز ویوک وسوان سے کرایا۔ ویوک وقت سے پہلے ہی گنجا ہو چکا تھا اور مسلسل باتیں کر رہا تھا، اس کی شخصیت نہایت ہی انوکھی اور عجیب و غریب تھی، جنوبی ممبئی کا ایک نوجوان جس کا اوڑھنا بچھونا ہی فلم تھا۔

ممبئی کا شہر درحقیقت دو شہروں پر مشتمل ہے جن میں ہر ایک کا اپنا الگ مزاج، خصوصیت اور تہذیب ہے۔ سوبو یعنی جنوبی ممبئی، آبائی دولت مند افراد، وکٹوریائی عہد کی تعمیراتی انداز کی عمارتوں اور جدید عالمی معیار کے ریستوران پر مشتمل ہے۔ سرکاری دفاتر، مانٹرالیا، ممبئی سٹاک ایکسچینج اور شہر کا جدید اور شاندار اروباری ضلع زیمان پوائنٹ شہر کے جنوبی حصے میں واقع ہیں۔ شہر کا شمالی حصہ یا مضافاتی علاقہ نئے دولت مند افراد اور نئی تعمیرات کا شاہکار ہے اور ناگزیر حد تک فلمی ہے۔ فلمی اور ٹی وی صنعتوں کے اکثر دفاتر، باندرا میں محبوب سٹوڈیوز اور دور افتادہ شمالی حصے میں وسیع و عریض فلم سٹی سٹوڈیو کے درمیان واقع ہیں۔

اداکاروں کا لباس ان کے مرتبے کی شناخت ہے۔ نوآموز فنکار دور افتادہ مضافاتی علاقے میں قیام کرتے ہیں لیکن کامیابی کے بعد وہ جنوبی حصے کی طرف رخ کرتے ہیں اور مالاد اور کندیلوی سے ورسووا منتقل ہو جاتے ہیں۔ ہندوستانی فلمی صنعت کے اعلیٰ طبقے کے افراد جو ہو اور باندرا میں رہائش پذیر ہیں یہاں کامیاب ترین اداکاروں کے گھر نہایت ہی شاندار اور

دیکھنے کے قابل ہیں۔ لوگ عام طور پر ان گھروں کو مشہور اداکاروں کے نام سے پہچانتے ہیں۔ اس سے پہلے مضافاتی علاقے کے لوگوں کے پاس تفریح کے حوالے سے چند ہی متبادلات تھے اور ایک لمبا سفر طے کر انہیں جنوبی علاقے میں آنا پڑتا تھا تاکہ اچھی اور شاندار فلموں فائیو سٹار ہوٹلوں اور بہترین و مہنگی خریداری سے محظوظ ہو سکیں لیکن 1990ء کی دہائی کے دوران یہ علاقہ ترقی، کامیابی اور جدیدیت کا ایک استعارہ بن گیا۔ شاندار چمکتی دمکتی کثیر المنزلہ عمارتیں، پر تعیش ہوٹل اور جدید رہائشی مکانات نے دقیانوسی اور پسماندہ علاقے کو جدید اور ترقی یافتہ علاقے میں تبدیل کر دیا۔ اب دو طرفہ آمد و رفت شروع ہو چکی ہے لیکن سوبو کے رہائشی ابھی بھی شمالی علاقے کی طرف رخ کرنے کو ملک چھوڑنے کے مترادف سمجھتے ہیں۔

ویوک کی پرورش ”کیفے پریڈ Caffe Parade“ نامی پر تعیش اور جدید علاقے میں ہوئی تھی جو جنوبی ممبئی کے انتہائی جنوبی حصے میں واقع ہے۔ اس نے جدید اور پر آسائش سکول اور کالج میں تعلیم حاصل کی اور ہندوستانی فلموں کو گھٹیا اور کمتر سمجھا جاتا تھا لیکن ویوک نے کرکٹ کی تربیت اور اضافی تعلیمی سرگرمیوں کو خیر باد کہا اور ہندی فلمیں دیکھنا شروع کر دیں۔ شاہ رخ کے مانند اس نے اپنی فلمی زندگی کا آغاز ٹیلی ویژن کے ڈراموں میں اداکاری کے ذریعے کیا۔ اس دور میں ویوک جی پی سپی G.P.Sippy کے لیے ایک فلم تیار کر رہا تھا جو ہندوستان میں سب سے زیادہ عرصہ دکھائی جانے والی فلم ”شعلے“ کے باعث مشہور ہو چکا تھا۔ ویوک اور شاہ رخ خان نے ہاتھ ملائے اور ایک دوسرے کو اپنے اپنے ٹیلی فون نمبر دیے۔

چند ہفتے بعد 17 دسمبر کو ویوک دوبارہ باندرا پہنچا۔ جو فلم وہ تیار کر رہا تھا اس کی فلمبندی متصلہ سڑک پر ہو رہی تھی۔ روینا ٹنڈن اور سلمان خان پر شائقین کا ہجوم امڈ اپڑ رہا تھا جو سخت گرمی کے باعث نڈھال ہو رہے تھے۔ ویوک کے نائب نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ایک ایئر کنڈیشنڈ ریستوران میں چند گھنٹے گزارے۔ ویوک وہاں تنہا نہیں بیٹھنا چاہتا تھا اور اسے پھر یاد آیا کہ شاہ رخ خان نے اسے کہا تھا کہ وہ یہاں سے قریب ہی کہیں رہتا ہے۔ یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ اسی دن ”ٹائمز آف انڈیا“ نے "Sunday Review" کے طور پر "The Idiot" کے بارے ایک مضمون شائع کیا۔ شاہ رخ خان پر خاص توجہ مرکوز کی گئی تھی۔ مضمون میں کہا گیا تھا: ”شاہ رخ خان، ایک زندہ کمال جسے صرف ”مزاح اور ظرافت“ تک محدود کر دیا گیا جس کے متعلق فلم

کے مجلے کا کہنا تھا: "کمال کا اداکار"۔ کاؤل جس کے ساتھ کام کرنا بہت مشکل ہے وہ شاہ رخ خان کی ایسے تعریف کرتا ہے: "اس کے ساتھ لازمی طور پر فلم بنانا چاہیے کیا کمال کا اداکار ہے اسے خود ہی علم ہے کہ کیسے اداکاری کرنی ہے، اسے بتانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔"

ویوک یہ مضمون پڑھ کر بہت متاثر ہوا اور اس کے دل میں شاہ رخ خان سے ملنے کا شوق بھی پیدا ہوا۔ اس نے شاہ رخ خان کو فون کیا لیکن کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ لہٰذا ویوک نے شاہ رخ خان کا گھر تلاش کیا اور دروازے پر دستک دی۔ اگرچہ سہ پہر کافی گزر چکی تھی لیکن شاہ رخ ابھی بھی سویا ہوا تھا اور اس نے بیدار ہونے میں کئی منٹ صرف کر دیے۔ جب شاہ رخ خان نے دروازہ کھولا تو ویوک نے نہایت ڈرامائی انداز میں اعلان کیا:

"میں تمہیں ایک بڑا اور عظیم اداکار بناؤں گا۔"

❁

آٹھواں باب

موت کے بعد زندگی

موت نے ایک کامیاب ترین اور عظیم اداکار تخلیق کیا۔

15 اپریل 1991ء کو فاطمہ کی موت واقع ہوئی جس طرح ایک دہائی قبل میر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کا شکار ہوئے عین اسی طرح فاطمہ بھی بے شمار علاج کروانے کے باوجود موت سے نہ بچ سکی۔ فاطمہ کے پاؤں پر ایک بے ضرر پھوڑا نمودار ہوا۔ وہ ذیابیطس کی مریضہ تھی اس لیے اس زخم نے خشک ہونے کا نام ہی نہ لیا۔ اس کی صحت اچانک اور نہایت تیزی سے گرنا شروع ہو گئی۔ چند ہی ہفتوں کے اندر اندر وہ جوتے پہننے سے بھی قاصر ہو گئی کیونکہ پھوڑے کے باعث پاؤں میں اس قدر زیادہ تکلیف تھی کہ اس نے ہوائی چپل کا استعمال شروع کر دیا۔ چند ہی ماہ کے اندر فاطمہ باترا ہسپتال داخل ہو گئی کیوں کہ اس کے کئی اعضائے رئیسہ نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔

فاطمہ ایک متحرک اور حوصلہ مند خاتون تھی جس نے تن تنہا اپنے دو بچوں کی پرورش کی تھی۔ اس نے ایک ناقابل تسخیر چھوٹے سے ٹینک کے مانند زندگی کے میدان میں تن تنہا حوصلہ اور ولولہ ہارے بغیر اور اپنی حس مزاح ترک کیے بغیر اپنی بقا کی جنگ لڑی۔ ہسپتال میں اپنے ابتدائی ایام کے دوران شریانوں میں ٹیکہ لگانے کے لیے سوئی ٹھہرانے کی مددگار چھوٹی سی ڈبیا نما نلکی کو وہ ازراہ مذاق "چھوٹی سی پیالی" کہا کرتی تھی۔ ایک دفعہ جب عزیز مرزا اس کی عیادت کے لیے آیا تو فاطمہ نے پہلے اپنے بالوں میں کنگھا کیا اور سر پر اچھی طرح دوپٹہ اوڑھنے کے بعد اسے اپنے پاس آنے کی اجازت دی لیکن بیماری نے اس کا بدن تباہ کر دیا تھا، اس کی روح چیخ چکی تھی۔ فاطمہ جو پہلے ہی اپنے بیٹے کے طلسم کی قائل ہو چکی تھی حالانکہ کسی دوسرے شخص نے شاہ رخ کے متعلق اظہار نہیں کیا اپنے بیٹے کی عظیم کامیابی دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہ سکی۔ ایک دن شاہ رخ خان اپنی ماں کو "سرکس" کی ایک قسط دکھانے کے لیے ہسپتال ہی میں اس کے

کچھ مختلف انداز سے یاد تھی۔ اس نے کہا، یہ اس نے نہیں بلکہ شاہ رخ خان نے کہا تھا کہ وہ ہندوستانی فلموں کی تاریخ کا سب سے بڑا اداکار بنے گا لیکن ویوک شاہ رخ کا دوست، فلسفی اور اتالیق بن گیا۔ ویوک نے اپنی یادیں کریدتے ہوئے بتایا: ''ہم سگریٹ اکٹھے پھونکتے، کافی کے پیالے اکٹھے پیتے، آلو کے قتلے بھی اکٹھے کھاتے اور رات کا جگراتا بھی اکٹھے کاٹتے۔'' دوسری ملاقات کے بعد شاہ رخ خان ویوک کے گھر میں منتقل ہو گیا جو ''کوفے پریڈ'' میں واقع تھا۔ وہ اپنی راتیں سینما گھر کی اگلی نشستوں پر بیٹھ کر فلموں دیکھتے ہوئے گزار دیتے۔

ہندوستانی فلمی صنعت کے اکثر اداکاروں کے لیے ایک بڑا اور عظیم اداکار بننے کی خواہش ان کے لیے ایک ڈراؤنے خواب سے کم نہیں ہے۔ یہ مبالغہ آرائی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ فلمی صنعت کے رازداں بتاتے ہیں کہ ہر دو سو سے تین سو افراد ممبئی میں اداکاری کے میدان میں قسمت آزمائی کے لیے آتے ہیں اور وہ اسی حسرت میں اپنی زندگی کے کئی ماہ و سال صرف بلکہ ضائع کر دیتے ہیں۔ فلمی صنعت کے لوگ انہیں پیار سے ''قسمت آزما'' کہتے ہیں۔ فلمی صنعت ان نوجوان مرد و خواتین کی کہانیوں اور قصوں سے بھری پڑی ہے جنہوں نے بڑا اداکار/اداکارہ بننے کی خواہش میں اپنی زندگیاں برباد کر لی ہیں اور اب انہیں کسی فلم کے ایک منظر میں تقریب کے موقع پر ایک کونے میں ایک خوش ذائقہ مشروب ہاتھ میں پکڑے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں صرف ایک استثنائی صورتحال ممتاز کی کامیابی کی داستان ہے جس نے ایک مشہور پہلوان اداکار کے مقابلے میں ایک درمیانے درجے کی اداکارہ کے طور پر ہیروئن کا کردار ادا کیا اور صف اول کی اداکارہ بن گئی اور اس نے ایک لکھ پتی سے شادی کرنے کے بعد اداکاری ترک کر دی۔ یہ ایک ایسی مثال ہے جس سے متاثر ہو کر ہزاروں نوجوان مرد و زن اپنے گھروں سے باہر نکلتے ہیں اور اپنے خوابوں کے شہر کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔

ایک عظیم اور بڑا اداکار بننے کا یہ رجحان اور خود ساختہ نظام 1940ء کی دہائی میں پیدا ہوا۔ ابتدائی سالوں میں اس نظام کے تحت غیر فلمی افراد بھی قسمت آزما سکتے تھے۔ دھرمندر اور راجیش کھنہ جیسے اداکار ''باصلاحیت اور جوہر قابل'' کے تحت تلاش کے نتیجے میں منظر عام پر آئے (1958ء اور 1964ء میں) لیکن دہائیوں تک ہندوستانی فلمی صنعت ایک ایسا ناقابل تسخیر اور ناقابل گزر قلعہ بنی رہی جس پر چند خاندانوں کی ہی مزید نسلیں حکومت کرتی رہیں۔ نجی فلمی ادارے، خاندانی کاروبار کے طور پر چلائے جا رہے ہیں جن میں ایک فرد ہدایتکار، دوسرا فلمساز

اور تیسرا اداکار ہوتا ہے۔ کامیاب اداکار اور تکنیک کار بھی اپنے افراد خانہ کو اپنے ساتھ کام کرنے کا موقع دے کر ان کی کامیابی کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ ہندی فلموں میں باپ اور بیٹے کا کردار ادا کرنے والے اداکار بعض اوقات سگے باپ بیٹا ہوتے ہیں۔ ہندوستانی فلمی صنعت میں اقربا پروری ایک غیر اخلاقی کاروباری حربہ نہیں بلکہ پیدائشی حق تصور کیا جاتا ہے۔

ایک بڑے اور عظیم اداکار کی حیثیت اگر اس کی صلاحیت، مہارت اور دلکش شخصیت کے ذریعے تعین ہوتی ہے تو وہیں اس کا خاندانی نام اور پس منظر بھی اسے بڑے اور عظیم اداکاروں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ ہر سال بیٹیوں اور بیٹوں کے پرستاروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ان کی فلموں کی تشہیر اور اپنے والدین کے ساتھ صلاحیت اور مہارت کے موازنے پر اخبارات میں بے شمار مضامین اور تبصرے شائع کیے جاتے ہیں۔ دقیانوسی سوچ تو یہ کہتی ہے کہ کسی مکمل طور پر گمنام فرد کی نسبت اس نوآموز کو ترجیح دی جائے جسے ''بڑا اور کامیاب اداکار'' کا ٹھپہ ورثے میں ملا ہو۔ کامیاب اور بڑے اداکاروں کے بچے اپنے والدین کی عظمت رفتہ سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کی ناکامیاں بآسانی فراموش کر دی جاتی ہیں لیکن ہر چند سال بعد جنگجو ابھیمنا کے مانند جس نے ''مہابھارت'' میں ایک خوفناک جنگ لڑی ایک غیر فلمی شخص ان مراعات یافتہ ''عظیم ادکاروں'' کے بتوں کو پاش پاش کر دیتا ہے۔

امیتابھ بچن کا والد ہریونش رائے ایک مشہور شاعر اور دانشور تھا۔ اداکار بننے سے پہلے امیتابھ کولکتہ میں قائم ایک غیر ملکی ادارے میں ملازم تھا۔ جیکی شیروف کی پرورش جنوبی ممبئی کے رہائشی علاقوں میں ہوئی لیکن یہ کامیابی اس قدر کم ہے جس طرح ایک ہندی فلم رومان کے بغیر بہت کم کامیاب ہوتی ہے۔ اکثر بڑے اداکار فلمی صنعت میں دوسری نسل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کرینہ کپور جیسے کچھ فن کار چوتھی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ کرینہ کپور کا دادا پرتھوی راج کپور بھی پشاور کے مشہور قصہ خوانی بازار کا رہائشی تھا جہاں شاہ رخ خان کے والد میر پیدا ہوئے تھے۔ کرینہ کا باپ، ماں، بہن، چچا اور ماموں اور قریبی عم زاد سب اداکار رہے ہیں اور فلمی اداکاری ان کے خون میں شامل ہے۔

جب امیتابھ نے فلموں سے عارضی طور پر سبکدوشی کا اعلان کیا تو ایک سال بعد شاہ رخ خان فلمی صنعت سے منسلک ہوا۔ ایک اداکار کی حیثیت سے شاندار کامیابی اور سیاست میں بدنامی و رسوائی کے باعث ناکامی سے دل برداشتہ ہو کر اس نے پانچ سال تک اداکاری نہ

کرنے کا فیصلہ کیا۔اس کی آخری فلم "خدا گواہ" تھی جو 1992ء میں تیار ہوئی اور اس کی فلمی دنیا میں واپسی "موت کا فرشتہ" کے ساتھ 1997ء میں ہوئی پھر امیتابھ نے ہندوستانی فلمی صنعت میں "بڑے اداکار" کے تصور کو ایک نیا مفہوم عطا کیا۔اس سے پہلے راجیش کھنہ نے بھی اسی قسم کی سحرانگیزی تخلیق کی لیکن راجیش کا دور بہت مختصر تھا جو اچانک زوال پذیر ہو گیا۔ایک طاقتور نشے کے مانند امیتابھ نے تقریباً دو دہائیوں تک قوم کو اپنی سحرانگیزی میں گرفتار رکھا۔اس نے "بڑے اداکار" کے لیے مہارت وصلاحیت کا انتہائی بلند معیار مقرر کر دیا جس وقت امیتابھ نے فلمی اداکاری ترک کی تو اس وقت بے شمار باصلاحیت کامیاب "ہیرو" موجود تھے لیکن جس طرح اس نے ناظرین کو متاثر کیا کسی اور اداکار کے لیے ممکن نہ تھا۔

جن اداکاروں کے ساتھ امیتابھ کی مسابقت جاری ہیں ان میں سنی دیول، انیل کپور اور جیکی شیروف نمایاں تھے۔انیل فلمساز سریندر کپور کا بیٹا تھا جو ایک زمانے میں "مغل اعظم" میں نائب کی حیثیت سے کام کر چکا تھا اور شاہ رخ کے والد میر کا دوست بھی تھا۔سنی کا باپ دھرمندر ایک حیران کن دلکش شخص تھا جو پنجاب کے ایک گاؤں سے ممبئی وارد ہوا تھا اور ایک بڑا اداکار بن گیا تھا۔جیکی شیروف ایک ایسا اداکار تھا جو "ولن" سے ترقی کر کے نہایت معجزانہ انداز میں "ہیرو" کے درجے پر فائز ہو گیا تھا۔محبت و عشق میں گرفتار نوجوان لڑکوں کے کردار، زیادہ تر کالج میں پروان چڑھنے والے رومانی تعلقات کے اعتبار سے، مخالف والدین اور ناموافق حالات کے باعث بچھڑنے سے قبل طربیہ نغمے گانے والوں (کسی دوسرے گلوکار کے گائے ہوئے نغمے پر لب کشائی) سلمان خان اور عامر خان کے درمیان تقسیم ہو گئے تھے۔نئے تروتازہ چہروں والے یہ لڑکے (ایک مشہور مصنف کا بیٹا اور دوسرا ایک فلمساز کا بیٹا) نئی نسل کے دلوں کی دھڑکن بن چکے تھے۔

اس امر میں قطعی کوئی سچائی نہیں کہ شاہ رخ ایسے اداکاروں میں سے تھا جو اداکار بننے کی جدوجہد کرتے ہیں اور اپنی قسمت آزماتے ہیں اور نہ ہی اس کا بدن ورزشی مرکز میں تیار ہوا تھا نہ ہی اس کی آنکھوں میں گھمبیرتا تھی اور نہ ہی وہ چاپلوس تھا۔وہ جانتا تھا کہ دوسروں کا احترام کیسے کیا جاتا ہے لیکن وہ غلامانہ سرشت کا مالک نہیں تھا حتیٰ کہ فلمی صنعت کے بڑے ناموں کے سامنے بھی اس کا یہی رویہ بدستور قائم تھا۔شاہ رخ خان اپنی صلاحیت ومہارت کے بارے جارح اور اپنی کامیابی کے بارے میں غیر معمولی پر اعتماد تھا۔اس کے انداز واطوار قطعی طور پر

تکلف سے خالی تھے۔اس کا لباس شکن آلود ہوتا، اس کے بال "ہوم میڈ" جیل GEL سے لبریز ہوتے، اس کا بدن دبلا پتلا تھا اور چونکہ وہ رات دو بجے سے قبل کبھی کبھار ہی سوتا تھا لہٰذا بے خوابی کے باعث اس کے آنکھوں کے نیچے مستقل طور پر سیاہ حلقے پڑے رہتے۔راجیو مہرا جس نے شاہ رخ خان کو اپنی فلم چمتکار (معجزہ) کے لیے ہدایات دیں نے بتایا: "اس نے کبھی شکوہ و شکایت کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی کبھی افسوس کا اظہار کیا، وہ قطعی طور پر ایسا لڑکا نہیں تھا جو اپنے آپ کو بیچنے کے لیے آتا ہے۔" فلمساز جی پی سپی جس نے فلمی صنعت میں اپنی چالیس سالہ زندگی کے دوران بے شمار کامیاب اداکاروں کو دیکھا تھا اور درجنوں اداکاروں کو کامیابی کی راہ بھی دکھائی تھی، شاہ رخ خان کے ساتھ محض دو منٹ پر مشتمل ملاقات کے بعد کہا۔"اس کے بال خونی ریچھ جیسے ہیں۔" سپی نے بغیر کسی تکلف کے ویوک کی وہ تجویز رد کر دی جس میں کہا گیا تھا کہ عزیز کی ہدایتکاری کے تحت ایک کم خرچ فلم بنائی جائے جس میں شاہ رخ خان کو مرکزی کردار دیا جائے۔

شاہ رخ خان ایک ہندوستانی فلم کے اداکاروں کے مانند نہیں تھا۔سلمان اور عامر کے برعکس اس کا رنگ بھی گورا نہیں تھا اور نہ ہی اس کی شخصیت دلکش تھی لیکن ویوک کا خیال تھا کہ شاہ رخ ایک بڑا اداکار بن سکتا تھا اور اس نے اپنے دوست کو بڑا اداکار بنانے کے لیے شدید اور ان تھک تشہیر اور جدوجہد کی۔وہ شاہ رخ کو ہر جگہ لے کر گیا، وہ اسے فلمسازوں کے دفاتر سے لے کر مختلف فلمی تقریبات میں لے کر گیا اور وہاں اس کا تعارف "ہندوستانی فلموں کا آئندہ کامیاب ترین اور عظیم اداکار" کی حیثیت سے کرایا۔اس وقت تک ٹی وی کے کسی اداکار نے کامیابی حاصل کرتے ہوئے فلم تک رسائی حاصل نہیں کی تھی لیکن شاہ رخ خان کے ٹی وی سلسلے وار کھیل اس کے لیے "تعارف اور کوائف نامہ" ثابت ہوئے اور اسے نہایت تیزی سے پیشکشیں وصول ہونے لگیں۔

راج کنور نامی ایک نئے ہدایتکار نے شاہ رخ خان کو "دیوانہ" کی پیشکش کی۔اس سے پہلے راج بہت سے دیگر اداکاروں کو آزما چکا تھا لیکن اس کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ یہ کردار مرکزی لیکن ثانوی تھا۔ایک رومانی مزاحیہ اور بھوت پریت کے امتزاج پر مبنی "چمتکار" نامی فلم کی لیے راجیو نے شاہ رخ خان سے ملاقات کی۔1970ء کی دہائی کی ایک نہایت ہی خوبصورت اور حسین اداکارہ ہیما مالنی اپنی ہدایتکاری میں تیار کی جانے والی پہلی فلم "دل آشنا"

متوسط طبقے کی ایک لڑکی اپنے پیار و محبت کے ذریعے اسے واپس سیدھے راستے پر لے آتی ہے۔

یش کا اصرار تھا کہ ویوک کو مرکزی کرداروں کے لیے سکہ بند اداکاروں کی خدمات حاصل کرنی چاہئیں لیکن جب شاہ رخ خان نے ایک نئے اداکار کی حیثیت سے چار مشہور اور مستند فلمی اداروں کے ساتھ اداکاری کے معاہدات پر دستخط کر دیے تو یش نے بھی جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا لیکن فلم کے اخراجات ایک مخصوص حد تک (صرف چھ ملین روپے) رکھنے کا فیصلہ ہوا۔ ویوک نے نہایت تیزی سے انتظامات مکمل کیے اور خوشگوار اداکارہ جوہی چاولہ کو شاہ رخ خان کی ہیروئن کے طور پر چن لیا گیا۔ جوہی چاولہ عرصہ تک زیر نمائش رہنے والی فلم ''قیامت سے قیامت تک'' میں عامر کے مقابلے میں ہیروئن تھی اور ویوک نے جوہی چاولہ کو بتا دیا تھا کہ وہ شاہ رخ خان کے متعلق سمجھے کہ وہ ''مستقبل کا عامر خاں'' ہے۔ جوہی نے شاہ رخ خان کے متعلق سنا ہوا تھا لیکن اس نے ''فوجی'' نہیں دیکھا تھا۔ ان دونوں کی ملاقات فلمبندی کے موقع پر ہوئی۔ جوہی چاولہ نے جب شاہ رخ خان کے دبلے پتلے بدن اور پراگندہ بال دیکھے تو اسی رات وہ ویوک کے سامنے چیخ پڑی: ''اونہہ یہ ہے مستقبل کا عامر خان!!؟'' شاہ رخ خان نے جن فلموں میں اداکاری کرنے کے لیے معاہدات پر دستخط کیے تھے ان میں شاہ رخ کے مرکزی کردار نہیں بلکہ دوسرے یا تیسرے درجے کے کردار تھے۔ 26 جون 1991ء کو شاہ رخ خان نے اپنی پہلی فلم ''دل آشنا ہے'' کے لیے ویروسا کے کانونٹ ولا میں عکس بندی کروائی۔

فلموں میں کام کرنے اور ممبئی منتقل ہونے کے فیصلے کے ذریعے شاہ رخ خان کے گاؤری کے ساتھ تعلقات میں مزید اضافہ ہو گیا۔ گاؤری کے والدین ابھی بھی شاہ رخ خان کی قطعی مخالفت پر کمربستہ تھے لیکن گاؤری سمجھ چکی تھی کہ ان کا جذبہ اور محبت ہی ان کے درمیان علیحدگی یا ہندوستانی فلموں میں کسی بدنامی اور رسوائی سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اس کا کہنا تھا: ''اگر میں اس موقع پر شاہ رخ خان کے ساتھ شادی نہ کرتی تو پھر میں اس سے کبھی بھی شادی نہ کر سکتی۔'' حالانکہ گاؤری کی عمر صرف اکیس برس تھی اور حال ہی میں کالج سے فارغ ہوئی تھی تو پھر گاؤری نے وفاداری کی جست لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ شاہ رخ خان نے اسے قائل کر لیا۔ ابھی انہیں مزید ایک سال تک ایک دوسرے کو آزمانا چاہیے۔ شاہ رخ خان نے کہا: ''ایک سال کا ہنی مون۔'' اگر اسے ہندوستانی فلمیں پسند نہیں ہیں تو پھر وہ فلموں میں کام نہیں کرے گا۔ جب

ہے'' کے لیے شاہ رخ خان کی اداکاری سے مستفید ہونا چاہتی تھی۔ ایک درجہ اول کا فلمساز راکیش روشن ایک نوجوان لڑکے کو دو ہیروؤں پر مشتمل اپنی فلم ''کنگ انکل'' میں اداکاری کے لیے حاصل کرنا چاہتا تھا۔

شاہ رخ خان ایک ایسے کامیاب ترین اور عظیم اداکار کی حیثیت اختیار کرنے والا تھا جس کا مستقبل ابھی ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ وہ ہندی فلموں میں کام کرنے کے لیے زیادہ تر ابھی تک پس و پیش میں اس لیے مبتلا تھا کہ گاؤری کو یہ ہندوستانی فلمیں انتہائی ناپسند تھیں۔ (امریتا سنگھ کو یاد ہے کہ شاہ رخ خان کے پاس گاؤری کی ایک سادہ تصویر تھی جسے وہ شرماتے ہوئے ہر ایک کو دکھاتا تھا..... امریتا، ایک بہت زیادہ حقیقت پسند اداکار، نے شاہ رخ خان کی اس محبت کو ''بچگانہ پیار'' کہہ کر مسترد کر دیا تھا اور اسے مشورہ دیا تھا کہ اگر گاؤری کو شاہ رخ خان کی ہندوستانی فلموں میں اداکاری پسند نہیں ہے تو اسے گاؤری کو بھول جانا چاہیے) شاہ رخ خان نے فلمسازوں سے ملاقاتیں کیں اور ان کی پیشکشوں کا جائزہ لیا لیکن ویوک کی مسلسل ہدایتوں اور نصیحتوں کے باوجود اس نے کسی بھی فلم میں کام کرنے کی حامی نہ بھری۔ بہر حال شاہ رخ خان کے لیے فاطمہ کی موت ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا اب اس کے لیے شاید ہندوستانی فلموں میں اداکاری ہی آخری انتخاب رہ گیا تھا کیونکہ والدہ کی وفات کے باعث اس پر مسلط ہونے والے غم کا مقابلہ صرف مصروف رہ کر ہی کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا ممبئی واپس لوٹنے کے چند دنوں کے اندر اس نے چار فلموں میں کام کرنے کے معاہدوں پر دستخط کر دیے۔ ایک سال کے مختصر عرصے میں شاہ رخ خان نے وہ کچھ حاصل کر لیا جو دوسرے لوگ اپنی زندگی بھر کی جدوجہد کے بعد بھی حاصل نہیں کر پاتے۔

اب تو جی پی یش نے بھی اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لی تھی۔ ویوک اور عزیز دونوں مل کر ایک فلم 'راجو بن گیا جنٹلمین'' بنانا چاہتے تھے۔ فلم کا یہ نام ایک ایسے گیت سے اخذ کیا گیا تھا جو عزیز کی والدہ اپنے بچوں کو نہلاتے وقت گنگناتی تھی ''اک پیسے کی گھڑی چرائی، دو پیسے کی چین، راجو بن گیا جنٹلمین۔'' راج کپور نے 1955ء میں ''شری 420'' نامی ایک شاہکار فلم تخلیق کی تھی، اس فلم سے متاثر ہو کر ''راجو بن گیا جنٹلمین'' کی کہانی تخلیق کی گئی جس کے مطابق ایک قصبے کا نوجوان روزگار کے لیے ممبئی وارد ہوتا ہے لیکن ایک بڑے شہر کی چمک دمک سے متاثر ہو کر سیدھے راستے سے بھٹک جاتا ہے، طاقت اور دولت اسے غلط کاموں پر لگا دیتے ہیں لیکن

رمیش اور سویتا نے محسوس کر لیا کہ ان کی بیٹی اپنے فیصلے کی پکی ہے کہ وہ اپنا ارادہ نہیں بدلے گی تو وہ بھی راضی ہو گئے۔

جب گاؤری اور شاہ رخ خان کے درمیان پہلی مرتبہ رومانی تعلقات قائم ہوئے تو عین سات سال بعد 25 اکتوبر 1991ء کو وہ شادی کے بندھن میں منسلک ہو گئے۔ پہلے عدالت کے ذریعے ان کی شادی ہوئی اور پھر بعد میں روایتی ہندو طریقے کے مطابق شادی انجام پائی جس میں شاہ رخ خان ہاتھی پر سوار ہو کر مقام شادی تک پہنچا۔ اس شادی میں فلمی دنیا سے منسلک صرف تین افراد دیوک، راجیو اور عزیز شریک ہوئے لیکن یہ شادی ہندوستانی فلمی دنیا میں ایک انوکھے امتیاز کی حامل تھی۔ شاہ رخ خان نے ''راجو بن گیا جنٹلمین'' کے شعبہ لباس سے عاریتاً لیا ہوا جوڑا پہن رکھا تھا۔ اپنے باپ کے برعکس شاہ رخ خان بہت ہی زندہ دل اور خوش باش دولہا ثابت ہوا۔ اس نے اپنی شادی کے موقع پر سب سے زیادہ دیر تک اور مشکل رقص کیا۔ صرف وہی شخص تھا جو اپنی ساس کے پاس نصف گھنٹے تک اس کا ہاتھ تھامے بیٹھا رہا۔ شادی کے موقع پر سویتا بہت زیادہ پریشان اور مضطرب ہو گئی تھی وہ اپنی بیٹی کی شادی سے لطف اندوز نہیں ہو سکی تھی کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ بنیاد پرست ہندو یا مسلم تنظیمیں شادی کی تقریبات کو درہم برہم کرنے کی کوشش کریں گی۔ وہ ان کے مستقبل کے متعلق بھی متفکر تھی۔ شاہ رخ خان کو اپنی ساس کے خدشات اور تفکرات کا اندازہ تھا اور وہ اپنی ساس کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ وہ اس کی بیٹی کی دیکھ بھال اور نگہداشت کرنے کا اہل ہے اور وہ اپنا یہ فرض بخوبی ادا کرے گا۔

نیا شادی شدہ جوڑا اگلی صبح ممبئی کے لیے روانہ ہوا۔ راجیو بھی اسی پرواز میں تھا اور وہ بھی گاؤری کے لیے بہت متفکر تھا۔ وہ کہنے لگا: ''تم اس کے اضطراب کا اندازہ کر سکتے تھے اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ آ رہی ہے یا جا رہی ہے۔'' اس جوڑے کے لیے دیوک کی طرف سے شادی کا تحفہ ''سن اینڈ سینڈ ہوٹل'' میں تین راتوں کا قیام تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ فوراً ہی اس خدشے میں مبتلا ہو جائیں کہ وہ کہاں رہائش پذیر ہوں گے۔ بالآخر وہ باندرا میں واقع عزیز کے خالی گھر منتقل ہو گئے جہاں ان کا پانچ ماہ تک قیام رہا اور وہ کھانے میں زیادہ تر انڈے استعمال کرتے رہے۔ ان کے فرنیچر میں دو گدے، ایک فریج، ایک ٹیلی ویژن اور ایک کوکنگ رینج شامل تھا۔ گاؤری نے اپنے ذاتی گھر میں منتقل ہونے تک فرنیچر خریدنے سے انکار کر دیا تھا۔

اگرچہ شاہ رخ خان نے ''راجو بن گیا جنٹلمین'' کے لیے فلمبندی پہلے شروع کی تھی لیکن

نمائش کے لیے پیش کی جانے والی اس کی پہلی فلم ''دیوانہ'' تھی جو 25 جون 1992ء کو سینماؤں کی زینت بنی۔ اس فلم کی کہانی ایک ایسی نوجوان لڑکی کے گرد گھومتی ہے جس کا دولت مند خاوند، حاسد اور مخالف رشتہ داروں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے اور پھر روایتی ہندی فلموں کے ''فارمولا'' کے مطابق اس کی ساس اسے دوسری شادی پر مجبور کرتی ہے۔ شاہ رخ خان ایک ایسے تلخ و تند اور غضبناک شخص کا کردار ادا کرتا ہے جو اس کی زندگی میں داخل ہوتا ہے لیکن عین اس وقت جب یہ جوڑا خوشگوار زندگی کا آغاز کرتا ہے پہلا خاوند واپس لوٹ آتا ہے۔

جس وقت اس فلم کی نمائش کا آغاز ہوا، ہدایتکار راج کنور وشنو دیوی کے مندر میں حاضری کے بعد پنجاب پہنچ چکا تھا۔ یہ ایک ایسی مذہبی یاترا تھی جسے اکثر فلمساز نمائش سے پہلے انجام دیتے تھے۔ انہیں توقع ہوتی تھی کہ یہ دیوی ان کی فلم کو کامیاب کرنے میں مدد دے گی۔ ''دیوانہ'' کے تقسیم کنندہ نے راج سے کہا کہ سینماؤں میں فلم کی نمائش کے لیے فلم لانے کے لیے اس کے ساتھ آئے۔ پہلے ''شو'' کا آغاز قبل از دوپہر 2 بجے ہونا تھا جب وہ نو بجے سینما پہنچے تو وہاں ویرانی کا سا سماں تھا۔ یہ راج کی پہلی فلم تھی جس میں اس نے ہدایتکاری کے فرائض سر انجام دیے تھے لیکن یہاں تو ایک خاموش سناٹا اس کے استقبال کے لیے موجود تھا جس کے باعث اسے افسردگی اور مایوسی کے گہرے سمندر میں غوطہ زنی کرنا پڑی۔ وہ تقسیم کنندہ پر ناراض ہو رہا تھا کہ اس نے فلم کی نمائش کے لیے اس قسم کے غلط وقت کا انتخاب کیا ہے لیکن تقسیم کار نے اسے یقین دلایا کہ بالآخر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ نصف گھنٹے بعد وہ جائزہ لینے کے لیے دوبارہ آئے۔ سینما ہال شائقین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور کالج کے طلبہ کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ''دیوانہ'' شاندار کامیابی سے ہمکنار ہو چکی تھی۔

ہندی فلموں کی طوالت عام طور پر تین گھنٹے اور بعض اوقات زیادہ بھی ہوتی ہے اور درمیان میں وقفہ تو لازمی ہے۔ ''دیوانہ'' میں شاہ رخ کے کردار کا آغاز ''نصف فلم کے بعد ہوتا ہے، ساس اپنی بیوہ بہو کو ان الفاظ کے ذریعے تسلی و تشفی دے رہی ہوتی ہے: ''وقت ہی تیرے زخم پر مرہم رکھے گا۔'' اب کیمرے کا رخ شاہ رخ کی جانب ہو جاتا ہے وہ منظر کے پہلے چند لمحات میں ''میرین ڈرائیو'' پر موٹر بائیک چلاتا نظر آتا ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں وہ چند سال قبل غصے میں کھڑا اعلان کر رہا تھا کہ وہ ممبئی پر حکمرانی کرے گا۔ وہ بھورے رنگ کی چمڑے کی جیکٹ، جینز اور سفید ''ٹی شرٹ'' میں ملبوس ہے۔ اس کے بال اڑ کر اس کی آنکھوں میں پڑ

رہے ہیں۔ وہ موٹر بائیک پر خطرناک کرتب دکھا رہا ہے اور ساتھ ہی گانا گا رہا ہے: ''کوئی نہ کوئی چاہیے مجھے پیار کرنے والا۔'' شاہ رخ خان میں ہمت و دلیری تو موجود تھی لیکن خاص طور پر وہ لڑنے بھڑنے والا شخص نہ تھا۔ ''سی۔ گینگ'' میں شامل اس کے ایک دوست ویوک کے مطابق شاہ رخ خان میں اس قدر تبدیلی واقع ہوئی تھی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دہلی سے سیدھا عکس بندی کروانے کے لیے پہنچا اور اپنا کام شروع کر دیا۔

مانی کول نے ایک دفعہ موسیقی کے اپنے استاد عظیم کلاسیکی گلوکار استاد ضیا محی الدین ڈوگر سے پوچھا: ''ایک اور تان سین کب پیدا ہوگا؟'' انہوں نے جواب دیا تھا: ''جب اس کے سننے والے سامعین پیدا ہوں گے۔'' شاید یہ کلیہ ہندوستانی فلمی صنعت پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ ایک بڑا اور کامیاب اداکار اس وقت پیدا ہوا کیونکہ ناظرین اس کو دیکھنے کے لیے تیار تھے۔ جب شاہ رخ خان پردۂ سیمیں پر ظاہر ہوا تو ناظرین کا ردعمل ایسا تھا کہ جیسے پردہ سیمیں سے برقی لہریں خارج ہوئی ہیں۔ انہوں نے سیٹیاں بجا بجا کر اور چیخیں مار مار کر شاہ رخ کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ یہ شور راج کے کان پھاڑ رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے دل کی دھڑکن بند ہو جائے گی۔ یہ ایسا ہی تھا کہ جیسے امیتابھ بچن کے بعد کسی ''بڑے اداکار'' کی ضرورت ہو اور ناظرین نے یہ پہلے ہی فیصلہ کر لیا ہو کہ ان کا اگلا ''بت'' شاہ رخ خان ہوگا۔

بے شمار افراد پر مشتمل ''شیبا خاندان''...... گاؤری کی دادی، والدین، ممانی، ماموں، بھتیجا اور بھتیجی اپنی خاندانی گاڑی میں بھر کر دہلی کے ''سپنا'' سینما گھر پہنچے تاکہ اپنے داماد کی پہلی ہندی فلم دیکھ سکیں۔ برسوں پہلے وہ ایک ہندی فلم دیکھنے سینما گھر گئے تھے پھر کیبل اور ویڈیو کے باعث سینما گھر میں ان کی آمد غیر ضروری ہو گئی تھی۔ تجندر کا بیٹا رستم جس کی عمر نو برس تھی، خاص طور پر بہت خوش اور مشتاق تھا کیوں کہ وہ اس سے پیشتر کبھی سینما گھر فلم دیکھنے نہیں گیا تھا۔ تجندر ہندوستانی فلمی صنعت کے گوشے گوشے سے واقف تھا لیکن رمیش کو اس بارے میں بہت تھوڑا علم تھا۔ وہ حیران تھا کہ اسے یہ کیسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فلم کامیاب رہی یا ناکام؟ لیکن ناظرین کی طرف سے جوش و خروش پر مبنی ردعمل نے اس سوال کا جواب فراہم کر دیا۔ فلم دیکھنے کے بعد تجندر نے شاہ رخ خان سے ملاقات کی اور اسے کہا:

''تم سُپر سٹار ہو!!''

❀

نواں باب

غیر معمولی باصلاحیت اور ذہین نوجوان

گلاب کی پتیوں کی بھینی بھینی خوشبو حضرت خواجہ معین معین الدین چشتیؒ کے مزار اور خانقاہ کو ہر وقت معطر کیے رکھتی ہے۔ شمالی ہندوستان کے شہر اجمیر شریف میں واقع بارھویں صدی کے صوفی بزرگ (ولی اللہ) کا مزار لاکھوں افراد کے لیے باعث کشش ہے اور بلا تخصیص ہر طبقے کے لوگ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار کی طرف چلے آتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان عقیدت منداس مزار اور خانقاہ کی زیارت اور مزار کی پتھر کی جالیوں کے ساتھ دھاگے باندھنے کے لیے جوق در جوق آتے ہیں۔ ہر دھاگہ ان ولی اللہ کو ہر عقیدت مند کی منت (خواہش) کے متعلق یاد دلاتا ہے۔ لوگوں کا ایمان ہے کہ جو لوگ خالص نیت کے ساتھ منت مانتے ہیں وہ خالی ہاتھ واپس نہیں لوٹتے۔ سولھویں صدی کے مغل شہنشاہ اکبر نے اپنے جانشین اور وارث کے لیے دعا کرنے کے لیے مزار تک ننگے پاؤں سفر کیا پھر جلد ہی اس کا بیٹا جہانگیر پیدا ہو گیا۔

1990ء میں شاہ رخ، شہناز اور فاطمہ نے مزار حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زیارت اور وہاں دعا مانگنے کے لیے اجمیر شریف کا سفر اختیار کیا۔ فاطمہ کی صحت پہلے ہی گرتی جا رہی تھی اور شاہ رخ خان نے اپنی ماں کے علاج معالجے کا انتظام سنبھالا ہوا تھا۔ زیارت اور دعا کے ایک حصے کے طور پر عقیدت منداپنے سروں پر بھاری کڑھی ہوئی چادریں لاتے ہیں۔ زیارت اور دعا سے فارغ ہونے کے بعد شاہ رخ خان نے محسوس کیا کہ اس کا بٹوا گم ہو چکا ہے اس بٹوے میں پانچ ہزار روپے تھے اور یہی رقم اس موقع پر اس گھرانے کے پاس موجود تھی۔ شاہ رخ خان بہت زیادہ پریشان ہو گیا اور مایوسی کے عالم میں اپنی رقم ادھر ادھر تلاش کرنے لگا۔ قریب کھڑے ایک فقیر نے تیقن سے کہا: ''اگر تمہارے پانچ ہزار روپے گم ہو گئے ہیں تو فکر مت کرو، ان کے بجائے پانچ لاکھ روپے تمہارے پاس آ جائیں گے'' اور ایسا ہی ہوا۔ ایک ہی

سال کے بعد شاہ رخ خان ٹیلی ویژن کا ایک ایسا مقبول اداکار بن گیا جو فی قسط آٹھ ہزار روپے آمدن حاصل کر رہا تھا۔ کم از کم ایک جریدے کی اطلاع تو یہ تھی کہ شاہ رخ خان پہلے ہی ایک فلم کا معاوضہ دو ملین روپے طلب کر رہا تھا۔

''دیوانہ'' ایک ایسی فلم تھی جس میں بلند آواز اور گھریلو جذباتی زندگی کا عنصر شامل تھا۔ فلم کی کہانی اور اتار چڑھاؤ کے مطابق شاہ رخ خان نے بلند لب ولہجہ قائم رکھا۔ ہندی فلموں کے لیے شاہ رخ خان نے سٹیج اور ٹی وی کی نسبت آواز ولہجہ قدرے بلند رکھا۔ ایک منظر جس میں شاہ رخ خان اپنے دوستوں کو بتاتا ہے کہ وہ ہیروئن کا عادی ہو چکا ہے اور انتہائی ڈرامائی طور پر اپنا سر دیوار کے ساتھ دے مارتا ہے، مجنونانہ انداز میں ہنستا ہے، غیض وغضب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اٹک اٹک کر بولتا ہے۔ اس کی غیر معمولی کارکردگی نے اسے ایک ایسے اداکار کا درجہ دے دیا جس میں ایک بڑا اور عظیم اداکار بننے کی صلاحیتیں اور مہارتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ شاہ رخ خان کی اعلیٰ فنکارانہ حیثیت کے باعث تنقید نگار بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تھے۔ بااثر "Times of India" سے منسلک فلمی تنقید کار نگہت کاظمی نے یوں تبصرہ کیا: ''اس سے پہلے کہ راج کنور کی ''دیوانہ'' کو ناکام قرار دیں جو موسم گرما کے وسط میں ایک خوفناک خواب ثابت ہوئی، شاہ رخ خان اپنی آمد سے سب کو متاثر کرتا ہے، دلکش نوجوان ''فوجی'' جو ڈولتی ہوئی کہانی کو سہارا دیتا ہے جو اچانک عروج کی بلندیوں کو چھونے لگتی ہے...... یہ ایک روایتی کردار ہے لیکن شاہ رخ خان اپنی صلاحیت اور مہارت کے ذریعے محبت کرنے والے ایک نوجوان کے روایتی کردار میں ایک نئی تازگی اور ولولہ پیدا کر دیتا ہے۔ ناراض، مضطرب، مہربان، پختہ کار اور معصوم باغیانہ رویہ اس فلم کو ایک نئی ولولہ انگیز اور متحرک صلاحیت ومہارت کے نمونے سے مزین ومرصع کرتا ہے۔''

اس فلم میں اداکاری کے ذریعے شاہ رخ خان نے اپنا پہلا "Filmy Fare Award" حاصل کیا۔ آسکر جیسے ایک ہی شاندار اور عظیم انعام کے بجائے ہندوستانی فلم صنعت میں فنکاروں کو ایک سال میں کئی انعامات دیے جاتے ہیں جو شہرت اور شان وشوکت کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ "Film Fare Awards" جو Film Fare نامی ایک فلمی رسالے نے شروع کیے تھے، ہندی فلموں کے اعتبار سے سب سے پرانے اور معتبر تصور کیے جاتے ہیں۔ آسکر ایوارڈز کے برعکس ان میں سے کوئی بھی انعام فلم کی کاروباری نوعیت یا اداکار کی پیشہ وارانہ

حیثیت پر اثر انداز نہیں ہوتا لیکن Film Fare Award بہت ہی مقبول اور معتبر تصور کیے جاتے ہیں۔

Film Fare Awards کا حصول شاہ رخ خان کے لیے ایک معمول اور عادت کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اس نے تقریباً ہر سال یہ انعام جیتا جس میں بہترین اداکار سے لے کر بہترین ولن کے کردار شامل تھے۔ ان سالوں میں جب اس کی کارکردگی کے باعث اسے کوئی انعام نہیں ملا تو اس عرصے میں اسے نئے تخلیق شدہ "Power Award" اور "Film Fare Swiss Consulate Trophy Special Award" میں جیت کا حقدار قرار دیا گیا لیکن موخر الذکر میں سے کوئی بھی انعام شاہ رخ خان کو پہلی دفعہ فلم میں بہترین اداکاری کے لیے ملنے والے انعام کے برابر نہ تھا۔ تقسیم انعامات کی تقریب کے موقع پر شاہ رخ خان صف اول کے فلمساز سبھاش گئی کے ساتھ بیٹھا تھا جب دلیپ کمار سٹیج پر گیا تو سبھاش نے شاہ رخ خان سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا اسے لازمی طور پر دلیپ کمار بننا چاہیے۔ سبھاش کے کہنے سے مراد وہ حسرت تھی جو اس کے دل میں ایک طویل عرصے سے پل رہی تھی اور اسے ایک معیاری خود اعتماد جواب کی توقع تھی کہ جیسے: ''اوہ کاش میں دلیپ کمار کے نصف کے برابر بھی ہو سکتا۔'' لیکن شاہ رخ نے کہا: ''تھوڑا انتظار کرو...... بہت جلد میں دلیپ کمار بن جاؤں گا۔'' شاہ رخ خان دوستوں کو دکھانے کے لیے سیاہ مجسمہ لے گیا تھا کیونکہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ انہوں نے یہ مجسمہ پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔

شاہ رخ خان سے شادی کے ذریعے جو تہذیبی صدمہ گاوری کو پہنچا تھا۔ انتہائی شہرت اور دولت کی ریل پیل بھی اس کا مداوا نہ بن سکی۔ ممبئی ایک نامانوس اور اجنبی شہر تھا جہاں ہمیشہ ابتری اور افراتفری کا عالم رہتا تھا۔ ہندوستانی فلمی صنعت میں سازشوں اور مخالفتوں کا دور دورہ تھا جہاں انوکھی دقیانوسی روایات مروج تھیں۔ یہاں ہر شخص اپنی کامیابی کی سطح کے لحاظ سے ملوکیت کا دعویدار تھا اور جب وہ فلمی صنعت سے منسلک ہوئے تو وہ کچھ لوگوں سے ''برتر'' تھے اور کچھ لوگوں سے ''کمتر'' تھے۔ تمام ''برتر اور تجربے کار'' افراد کے لیے ان کے نام کے لحاظ سے عزت وتکریم لازمی تھی۔ گاوری کے کہنے کے مطابق یہ ابتدائی دو سال ''اذیت ناک'' تھے۔ اس نے بتایا: ''مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میرے ارد گرد کیا ہو رہا تھا یہ تمام کچھ پاگل پن اور ہیبت ناک تھا۔'' ہر دو ماہ بعد گاوری دہلی چلی جاتی اور فارغ وقت کسی کام میں مصروف ہو کر صرف

کرنے کی کوشش کرتی۔ کچھ ماہ اس نے سلے سلائے کپڑے برآمد کرنے والے ایک ادارے میں بھی کام کیا لیکن جب شاہ رخ خان کو گوا کے تین ماہ پر مشتمل بیرونی دورے پر جانا پڑا تو گاؤری نے ملازمت چھوڑ دی اور شاہ رخ کے ساتھ چلی گئی۔

شاہ رخ خان نے شادی شدہ زندگی کے حوالے سے ہندوستانی فلمی صنعت میں مروج روایات کو اپنانے سے انکار کر دیا۔ روایتی طور پر بیویاں اپنے خاوندوں کے گھروں میں ہی رہتی ہیں۔ وہ پرتعیش اور خاموشی کی زندگیاں بسر کرتی ہیں۔ انہیں بہت لاڈ پیار سے رکھا جاتا ہے حتیٰ کہ صف اول کی ہیروئنیں بھی شادی کے بعد اداکاری ترک کر دیتیں اور خاموشی سے گھریلو زندگی بسر کرنے لگتیں اور ان کا یہ فعل ان کی ازدواجی زندگی میں ممتاز کے تقاضوں کے عین مطابق ہوتا۔ یہ اصول بڑے اداکاروں کی بیویوں پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ تجارتی اور کاروباری امور کے ماہرین کے خیال کے مطابق شادی شدہ زندگی ایک اداکار کی پیشہ وارانہ زندگی پر اثرانداز ہوتی۔ ایک رومانی ہیرو کی نسوانی پرستار اس کے قریب تک نہ بھٹک سکتیں کیونکہ فلمسازوں کے خیال کے مطابق اس ہیرو میں رومان کی رمق باقی نہ رہ گئی ہوتی۔ اسی لیے عامر خان جس نے شاہ رخ سے چار سال پہلے فلموں میں اداکاری شروع کی اپنی شادی خفیہ رکھی۔ پھر اس کی بیوی رینا نے اپنی فلم ''قیامت سے قیامت تک'' میں شاندار کامیابی حاصل کی لیکن پھر بھی عامر خان نے اس کے ساتھ اپنی شادی کی خبر کو عام نہیں کیا جب عامر خان نے فلمی دنیا میں کامیابی حاصل کر لی اور اسے ایک ''بڑے اداکار'' کا درجہ حاصل ہو گیا تو پھر اس نے اپنی شادی کی خبر عام کی۔

اس کے برعکس شاہ رخ خان نے انتہائی دھوم دھام سے گاؤری کے ساتھ شادی کی۔ ایک افواہ یہ بھی تھی کہ فلمساز ایف۔ سی مہرانے شاہ رخ خان کو فلم ''چمتکار'' کی نمائش ہونے تک شادی ملتوی کرنے کے لیے کہا تھا۔ ہدایتکار راجیو مہرانے اپنے اس بیان کی تردید کی لیکن کہا یہ جاتا ہے کہ شاہ رخ خان نے ایسا کرنے کے بجائے فلم میں کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ شاہ رخ خان گاؤری کے ساتھ اپنی شادی کا اعلان کرنے میں بہت ہی پرجوش اور بے تکلف تھا۔ 1992ء میں 'stardust' نامی جریدے کے ساتھ ایک انٹرویو میں اس نے کہا: ''سب سے پہلے میری بیوی ہے اور میں یہ بات زور دے کہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر مجھے اپنے بیوی اور فلم میں سے کسی ایک کو چھوڑنے کے لیے کہا جائے...... تو میں فلم چھوڑ دوں گا...... میرے کہنے سے مراد یہ

ہے کہ میں اپنی بیوی کے لیے پاگل ہو جاتا۔ صرف وہی ہے جو مجھے پسند ہے...... مجھے اس سے محبت ہے، میں اس کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہوں۔'' ایک سال بعد اسی جریدے نے ''تئیس سالہ جنسی طور پر انتہائی دلکش'' گاؤری کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: ''ایک مختصر سی قمیض میں ملبوس، دلکش، پراعتماد، مطمئن اور اپنے خاوند کی آغوش میں آسودگی سی سمٹی ہوئی۔'' اسی رسالے کے سرورق کے لیے جوڑے تصویریں بنائیں حتیٰ کہ گاؤری نے انٹرویو بھی دیا۔ جون 1994ء میں ایک اور رسالے "Aura of Stars" کو انٹرویو دیتے ہوئے گاؤری نے کہا: ''اس تعلق کے باعث مجھے مکمل طمانیت اور خوشی حاصل ہوئی ہے، شاہ رخ خان کے ساتھ شادی کر کے نہ تو مجھے کوئی پچھتاوا ہے اور نہ ہی کسی قسم کا افسوس ہے اور میں اس کے بغیر اپنی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

1990ء کی دہائی میں ہندوستانی فلمی صنعت تبدیلی کے دور میں سے گزر رہی تھی۔ قدیم روایات واقدار دم توڑ رہی تھیں لیکن نئی روایات واقدار ابھی منظر عام پر نہیں آئی تھیں۔ فلمی دنیا ابھی تک روایتی انداز میں گرفتار تھی اور ہر طرف افراتفری و ابتری کا عالم برپا تھا، خاندانی ملوکیت نے اسے اپنے پنجہ استبداد میں جکڑا ہوا تھا۔ اس وقت ہندوستانی فلمیں شمالی ہندوستان میں مروج پنجابی قدامت پسند ملوکیت کا چربہ نظر آ رہی تھیں۔ ہر طرف ہلڑبازی اور فساد کا عالم تھا اور فلموں کا معیار انتہائی گھٹیا اور بھونڈا تھا۔ اکثر فنکار اور تکنیک کار غیر تعلیم یافتہ تھے۔ ایک بے ہودہ اور غیر اخلاقی فلمساز کا حلیہ سفاری سوٹ میں ملبوس ایک خوشامدی شخص کا سا تھا جو منہ میں رکھے پان کو چبا رہا ہے اور اس کے ہاتھ میں نقدی سے بھرا چمڑے کا صندوق موجود ہے۔ چالیس سال سے زائد عمر کے افراد کی ایک کثیر تعداد دنیا میں موجود کروڑوں ہندوستانیوں کو افسانوی دنیاؤں کی سیر کرا رہی تھی۔ اداکار خاص طور پر اداکارائیں بچگانہ چہروں کی حامل تھیں لیکن تکنیکی طور پر نوجوان ہیروئنیں دستیاب تھیں۔ سفید بال، عقل ودانش کے مترادف تھے لہٰذا اپنی ذاتی فلموں کی ہدایتکاری کا موقع حاصل کرنے کے لیے ہدایتکاروں کے نائب سالوں پہلے اپنے معاوضے ادا کر دیتے تھے۔ تیس سال سے کم عمر کے ہدایتکاروں کی قطعی کوئی شنوائی نہیں تھی اسی طرح فلمیں بھی انجماد کا شکار ہو گئی تھیں اور ان میں تخلیقیت ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی تھی۔ جاوید اختر نے ایک دفعہ نہایت تلخی سے کہا: ''بہت سے ہدایتکار میرے پاس آئے اور کہا کہ انہیں کسی فلم کا اصل مسودہ چاہیے جس پر پہلے بھی فلم بن چکی ہو۔''

شاہ رخ خان نے ہندوستانی فلموں میں نہایت پُراعتماد طریقے سے اپنے جدید اور تخلیقی رجحان و میلان کو داخل کیا۔ اکثر اداکاروں کے برعکس وہ شہرت اور نام کا بھوکا نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک ایسا سنجیدہ اور بردبار اداکار ہے جو ان اوچھے اور گھٹیا فلمی انداز و اطوار سے کہیں ماورا ہے۔ سبھاش گئی سے اس کی پہلی ملاقات ایک تقریب میں ہوئی۔ سبھاش نے جیکی شیروف کو ایک معمولی اداکار کے درجے سے اٹھا کر صف اول کے اداکار کے درجے تک پہنچا دیا تھا۔ ذرائع ابلاغ نے اسے ''شومین Showman'' کا خطاب دیا اور نوآموز اسے تعظیم و تکریم کا مستحق سمجھتے ہوئے اسے اپنی خدمت گزاری کے لائق سمجھتے تھے۔ سبھاش ایک ایسا بادشاہ گر تھا جس کا سنہری عکس کسی بھی نوآموز کو نہایت تیزی کے ساتھ ''بڑا اداکار'' بنا سکتا تھا۔ سبھاش نے شاہ رخ خان کا ہاتھ تھاما اور کہا: ''میرے سننے میں آیا ہے کہ تم اداکاری اچھی کر لیتے ہو۔'' شاہ رخ نے جواب دیا: ''جی ہاں جناب آپ کا خیال درست ہے!'' سبھاش نے یہ بھی محسوس کیا کہ شاہ رخ کی جسمانی حرکات و سکنات اداکاری کے بے شمار خواہش افراد کے مانند نہیں ہیں۔ سبھاش نے بتایا: ''اداکاری میں اپنی قسمت آزمانے کے خواہش مند افراد سے جب میری پہلی دفعہ ملاقات ہوتی ہے تو وہ میرے سامنے تعظیمی انداز میں ہاتھ باندھے جھکے کھڑے ہوتے ہیں'' پھر سبھاش نے کہا: ''جب وہ بڑے اداکار بن جاتے ہیں تو ان کے ہاتھ غصے کے عالم میں ان کی پشتوں پر بندھے ہوتے ہیں لیکن شاہ رخ خان کے ہاتھ ہمیشہ ہی اس کے دوران پہلو تہی کے ساتھ سیدھے لٹکے رہتے تھے اس کی آنکھیں پُراعتماد تھیں۔

شاہ رخ خان کی متلون مزاجی بہت سے مسائل کا باعث تھی۔ اس نے ابتدائی طور پر جن فلموں میں اداکاری کی ان میں ''کبھی ہاں، کبھی ناں'' بھی شامل تھی جس کی ہدایات کندن شاہ نے دی تھیں۔ اس کی بہترین اداکاری کا مظاہرہ وہ کردار سمجھا گیا جس میں اس نے ایک بے بس شکست خوردہ عاشق کا کردار ادا کیا جو فلم کے اختتام تک بھی اپنی محبوبہ کو حاصل نہیں کر پاتا۔ ''دیوانہ'' کے افتتاح کے موقع پر شاہ رخ خان نے ''کبھی ہاں کبھی ناں'' میں کام کرنے کے معاہدے پر پچیس ہزار روپے کے عوض دستخط کیے۔ یہ فلم ''دیوانہ'' سے قبل ہی تقریباً مکمل ہو چکی تھی لیکن مالی مشکلات کے باعث آخری پانچ دنوں کی عکس بندی وقت پر نہ ہو سکی اور اس کی نمائش 1994ء سے پہلے نہ ہو سکی۔

''کبھی ہاں کبھی ناں'' کی زیادہ تر عکس بندی گوا میں ہوئی۔ فلم کی تیاری کے دوران شاہ

رخ خان نے کندن کے ساتھ شدید جھگڑا کیا۔ بعض دفعہ وہ ہاتھا پائی کے تقریباً نزدیک پہنچ جاتے۔ دونوں کے نزدیک یہ افسوسناک صورتحال ''عمروں میں عدم موافقت'' کا شاخسانہ تھی۔ شاہ رخ خان نے بتایا: ''کندن، کمال پسند'' ہے وہ چاہتا ہے کہ ہر منظر نہایت صراحت اور قطعیت کے ساتھ عکس بند ہو۔'' میری مزاحیہ اداکاری ہلکی پھلکی ہے۔ اس کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ ہر اداکار ایک پتھر ہو جسے وہ اٹھا سکے، اسے رکھ سکے اور عکس بندی کرا سکے لیکن یہ چھوٹے چھوٹے ذاتی لڑائی جھگڑے انہیں فلم کو ایک بہترین صورت دینے کے ارادے سے باز نہ رکھ سکے۔ شاہ رخ خان میں ان تھک اور جان توڑ محنت اور کام کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ اس نے خود کو فلم کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ جب اس فلم کا آخری منظر عکس بند ہوا تو تمام عملے نے سکھ کا سانس لیا چونکہ اس فلم کی تیاری میں پہلے ہی مہینوں تاخیر ہو چکی تھی اور مالی مشکلات بھی بہت تھیں لہٰذا فلمساز نے مزید عکس بندی سے انکار کر دیا۔ شاہ رخ خان کو علم تھا کہ کندن مزید عکس بندی کا خواہش ہے اس لیے وہ ''کمالستان سٹوڈیو'' میں عکس بندی میں مصروف دیگر تمام افراد کی طرف بھاگا اور ان سے فالتو فلم طلب کی لیکن اس وقت نصف شب گزر چکی تھی اور اکثر فلموں کی عکس بندی کا مقررہ وقت ختم ہو چکا تھا۔ جب شاہ رخ کے ہاتھ کچھ نہ آیا تو وہ بیٹھ گیا اور رونا شروع کر دیا۔

شاہ رخ خان کے جرات مندانہ اور ولولہ انگیز رویے کے باعث ہر فلمی جریدہ اسے اپنے صفحات میں جگہ دینے کے لیے بے تاب نظر آتا تھا۔ سالہا سال سے ہندوستانی فلمی صنعت میں اداکاروں کے پرستاروں پر مشتمل ایک ذیلی صنعت بھی قائم تھی، یہ تمام جریدے بڑے اداکاروں کے ذکر سے بھرے ہوتے تھے اور محض اسی وجہ سے ان کی فروخت ممکن تھی۔ اداکاروں کے معاشقے اور ان کی ذاتی زندگیاں ان جرائد کا محور تھیں اور فروخت ہونے کا ذریعہ بھی۔ فلموں کے متعلق معلومات اور تبصرے بعد کی بات تھی۔ سب سے زیادہ بارسوخ جریدے انگریزی زبان میں ہیں جن میں اداکاروں کی چمکتی دمکتی تصاویر اور انٹرویو شامل ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے مکمل فلمی جریدے کا نام ''موج مزہ'' تھا جو گجراتی زبان میں تھا اور اس کا پہلا شمارہ 1924ء میں شائع ہوا تھا۔ ''فلم فیئر'' کی اشاعت 1952ء میں شروع ہوئی لیکن ''پرستاروں کی عملیت پسندی''، ''سٹارڈسٹ Stardust'' نے قائم کی جس کی اشاعت کی ابتداء اکتوبر 1971ء میں ہوئی۔ ''سٹارڈسٹ'' امریکی فلمی جریدے ''فوٹو پلے Photo Play'' کا چربہ تھا اور جھوٹ کا

پلندا ہوتا تھا۔ مختلف مضامین ہمیشہ مبالغہ آرائی کا شاہکار ہوتے اور سرخیاں متنازعہ ہوتیں۔ کچی کہانیوں اور مضامین کا کہیں وجود نہ ہوتا۔ افواہوں کا کالم بھی بے بنیاد معلومات پر مبنی ہوتا۔ یہ سب ممبئی ہنگلش Mombai Hinglish میں لکھا جاتا جو ممبئی میں بولی اور لکھی جانے والی ہندی اور انگریزی کا آمیزہ تھی۔

خاص طور پر جب سے ''سٹارڈسٹ'' نے فنکاروں کے متعلق بدنامی ورسوائی پر مشتمل مضامین شائع کرنے شروع کیے تھے، ہندوستانی فلمی صنعت اور جرائد واخبارات کے درمیان تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ عام طور پر فلمی جرائد فنکاروں کی بھڑکیلی اور چاپلوس تصاویر شائع کرتے، فلمی صنعت اور ناظرین کی درمیان غلط فہمیاں دور کرتے اور اداکاروں وفلموں کی تشہیر کا ایک مفید ذریعہ ثابت ہوتے لیکن جب یہ جریدے فنکاروں کے متعلق بے بنیاد ''انکشافات'' کرتے اور افواہیں پھیلاتے تو پھر یہ جریدے نقصان دہ اور مکروہ ثابت ہوتے۔ موخر الذکر صورت حال کے ضمن میں ہندوستانی ''ازالہ حیثیت عرفی'' قوانین بھی بہت کم اشک شوئی کا باعث ثابت ہوتے۔ اکادکا افراد عدالتی چکروں میں پڑتے جو آئندہ ایک دہائی پر مشتمل ہوسکتے تھے لہٰذا مشہور اور بڑے اداکار انہیں بدنام ورسوا کرنے والے اخبارات وجرائد سے نمٹنے کے لیے اپنے طور پر مناسب طریقے اختیار کرتے۔ کچھ فنکار لڑنے جھگڑنے کے بجائے ان جرائد واخبارات کا مقاطعہ کردیتے۔ ایک دفعہ دھرمیندر نے دیویانی چھایل نامی ایک شخص کو ایک تقریب میں جالیا جو فنکاروں کے متعلق جھوٹ گھڑنے کے لیے بہت مشہور تھا۔ جون 1992ء میں اداکار انوپم کھیر نے ''سٹارڈسٹ'' کے ایک صحافی ٹرائے ریبیرو کو اس بناء پر تھپڑ رسید کردیا کہ اس نے ایک مضمون میں انوپم پر یہ جھوٹا الزام عائد کیا تھا کہ اس نے اپنے ایک ساتھی اداکار کی بہن کے ساتھ دست درازی کی۔ اس وقت بہت سے اداکاروں نے انوپم کی حمایت کی حتیٰ کہ انہوں نے اس جریدے پر پابندی عائد کرانے کے لیے آپس میں مشورہ بھی کیا لیکن زیادہ تر تنازعات کے مانند یہ قصہ بھی جلد ہی لوگوں کے ذہنوں سے محو ہو گیا۔ مشہور اداکار اور صحافی ایک ''جنگجو جوڑے'' کے مانند اس طرح رہنے پر مجبور تھے جس طرح یہ جوڑا ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

بہرحال ''سٹارڈسٹ'' نے شاہ رخ خان کے اس بہترین قول کا ادراک کرلیا تھا کہ ''بڑا اداکار بننے سے پہلے ہی اس میں صلاحیتیں موجود تھیں۔'' اس وقت اس کی مدیر نشی پریم وہ پہلی

صحافی تھی جس نے شاہ رخ خان کے ساتھ ایک اہم اور بڑے انٹرویو کا اہتمام کیا۔ اپنی کسی بھی ایک فلم کی نمائش سے قبل ستمبر 1991ء میں جب وہ ٹیلی ویژن کا مشہور اداکار تھا، شاہ رخ خان کے لیے اس جریدے کے پانچ صفحات مخصوص کیے گئے۔ مضمون کی سرخی یوں تھی "Will Shah Rukh Khan's Intensity Burnhim Out" نشی نے شاہ رخ خان کا تقابل ''جوناتھن لیونگسٹون سیگل'' کے ساتھ کیا جو ہمیشہ سے اس استعجاب میں مبتلا تھا کہ دوسرے سمندری کوے اس سے اونچا پرواز کرنے کے خواہش مند کیوں نہیں ہیں۔ ''شاہ رخ خان نے اپنی اداکاری کا آغاز شرمیلے پن سے نہیں کیا بلکہ اس کی اداکاری ابتداء ہی سے شوخ وچنچل تھی۔ دیگر کاموں کے ساتھ ساتھ اس نے ہروہ کام کیا جو دوسرے اداکاروں کے لیے گھبراہٹ اور خوف کا باعث تھا۔ اس کا کہنا تھا ''ان اداکاروں کے متعلق یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہاں صرف دولت، شہرت اور عظمت کمانے کے لیے آئے ہیں اور بس پھر یہ سب کچھ ختم۔ جہنم میں جائے اداکاری۔ انہیں اداکاری کے تصور تک کا ادراک نہیں۔ میری مراد ہے کہ ان کے پاس کوئی تصور ہی نہیں کہ اداکاری کیسے کی جاتی ہے، اداکاری ان کے لیے وقتی ابال کی حیثیت اختیار کر چکی ہے، اگر میں کسی چھوٹے اداکار سے اپنے جوتے کے تسمے بندھواتا ہوں اور میں تصویر بنوانے کے لیے کھڑا یا بیٹھ جاتا ہوں تو پھر میں بڑا اداکار ہوں...... اے ہے، لیکن انہیں کچھ تو اداکاری کرنی چاہیے، میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کا پیشہ ورانہ انداز کہاں ہے، آپ کی پیشہ ورانہ روح کہاں پرواز کرگئی ہے؟'' کامیابی حاصل کرنے کے بعد اس کے یہ اقوال اس کے لیے زیادہ اہم ثابت ہوئے: ''میں سب سے بہترین اور عظیم ہوں اور میرا مقابلہ صرف مجھ سے ہے۔ میں ''اقتدار کی جنگ'' پر یقین نہیں رکھتا کیونکہ میں اقتدار اور شہرت کا بھوکا نہیں ہوں۔ جب میں رات کو سونے کے لیے جاتا ہوں تو میں خود کو کہتا ہوں کہ اپنے عروج کا سورج غروب نہیں ہونے دوں گا۔'' ستمبر 1992ء کے شمارے میں ''سٹارڈسٹ'' نے شاہ رخ کے متعلق یوں سرخی جمائی: "Can the Industry Digest Shah Rukh Khan's Arrogance?" اس ضمن میں شاہ رخ خان اور رسالے کی مدیرہ نشی نے ایک ایک روپے کی شرط لگائی۔ شاہ رخ خان کا کہنا تھا کہ بڑا اداکار بننے کے باعث اس کی شخصیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی لیکن نشی کا اصرار تھا کہ اس کی شخصیت میں ضرور تبدیل واقع ہوئی لیکن ابھی تک اس شرط کا فیصلہ نہیں ہو سکا۔

اکثر بڑے اداکاروں کے مانند مشہور جریدیوں کے ساتھ شاہ رخ خان کے تعلقات مستقل نوعیت نہیں اختیار کر سکے۔ فلمی صحافیوں کے ساتھ اس کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ ہی رہے۔ جب ایک صحافی نے اس کی ذاتی زندگی کے بارے ایک سوال پوچھا تو شاہ رخ خان نے جواب دیا: ''میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔'' جب ایک اور صحافی نے اس سے جنسی طاقت و قوت کے بارے سوال کیا تو شاہ رخ خان نے جواب دیا: ''اگر تم تجربہ کرنا چاہتے ہو تو پھر میں تم سے پیار کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' شاہ رخ خان ذو معنی اور چبھتی ہوئی بات کہنے میں ماہر ہے وہ ٹھہر ٹھہر کر اور بلاغت سے بات کرتا ہے وہ سانس لیے بغیر کسی بھی موضوع پر گھنٹوں بول سکتا ہے۔ وہ اپنی حاضر دماغی کے ذریعے دوسروں کو متاثر کر دیتا ہے اور اپنی اس صلاحیت پر اسے فخر ہے لیکن اگر ایک مضمون میں صرف ایک سطر اس کے لیے باعث آزار اور تکلیف دہ ثابت ہو تو پھر وہ اتنا ہی خطرناک اور غصیلا ثابت ہوتا ہے۔ ''مایا میم صاحب'' نامی فلم کے ضمن میں اس کے صحافیوں کے ساتھ کشیدہ تعلقات آخری حدوں کو چھونے لگے۔

''مادام باوری'' سے ماخوذ ''مایا میم صاحب'' میں شاہ رخ خان ایک ایسے نوجوان عاشق کا کردار ادا کرتا ہے جس کی محبوبہ اور معشوقہ ایک بوڑھی شادی شدہ خاتون ہے جو معمولی زندگی کی لش پش سے نفرت کرتی ہے اور اپنی ہی افسانوی دنیا میں رہتی ہے۔ ان کے تعلقات میں جذبات کا عنصر تو موجود ہے لیکن لڑائی جھگڑے، حسد اور جارحانہ رویوں کے باعث ان کے تعلقات کشیدہ ہیں۔ اس فلم میں ایک منظر یہ بھی ہے کہ یہ جوڑا محبت کے اظہار میں مصروف ہے۔ یہ منظر ہندی فلم کے معیار کے عین مطابق ہے۔ اداکارہ دیپا ساہی جو ہدایتکار مہتا کی بیوی بھی ہے سر سے ننگی ہو جاتی ہے۔ پہلے تو شاہ رخ خان اور دیپا کو ساٹن کی سفید چادروں کے نیچے دکھایا گیا اور پھر وہ اسے دیوار کی طرف دھکیلتا ہے وہ اس کی گردن پر کاٹتی ہے۔ آخر میں وہ ایک تکیہ پھاڑ دیتا ہے اور اس میں موجود روئی اس کے تمام بدن پر اچھال دیتا ہے۔

1992ء میں "Cine Blitz" نامی جریدے نے مکمل ایک صفحے پر مشتمل خبر نما مضمون اس سرخی کی تحت شائع کیا "Shah Rukh and Deepa's Steamy Scenes Revealed" اس مضمون میں مبینہ طور پر یہ بیان کیا گیا کہ مہتا نے شاہ رخ خان اور اپنی بیوی سے کہا کہ وہ فلم کا ایک منظر عکس بند کروانے سے قبل ایک مضافاتی ہوٹل میں اکٹھے ایک رات بسر کریں تا کہ وہ ایک دوسرے سے مکمل طور پر بے تکلف ہو سکیں۔ مصنف مزید لکھتا ہے کہ وہ منظر فلمبند کرواتے

وقت محض اداکاری نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ حقیقی انداز میں یہ سب کچھ کر رہے تھے۔ اس مضمون میں یہ دعوٰی بھی کیا گیا کہ دونوں اداکاروں نے (شاہ رخ اور دیپا) نے اس ہدایت کے مطابق عمل کیا اور اگلے دن جب یہ منظر فلمایا گیا تو وہاں صرف ہدایتکار اور عکس کار موجود تھے۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا تا کہ بیرون ملک بھی یہ فلم ناظرین کی زیادہ سے زیادہ توجہ حاصل کر سکے۔ قدرتی طور پر شاہ رخ نے اس قصے سے گاوری کو لاعلم رکھا۔ بہر حال فلمی صحافتی اقدار کا معمول اس قسم کے غیر معمولی، رسوا کن اور بدنام زمانہ مضامین کی اشاعت سے کوئی تعرض نہیں کرتا اور نہ ہی کسی قسم کی وضاحت کی جاتی ہے اور کسی بھی رسالے سے متعلق کوئی بھی صحافی اس قسم کے مضامین کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

اس مضمون کے شائع ہونے کے اگلے دن شاہ رخ خان ایک تقریب میں شریک تھا جہاں اس نے "Cine Blitz" کے صحافی کیتھ ڈی کوسٹا کو جا لیا۔ شاہ رخ خان کا خیال تھا کہ کیتھ نے یہ مضمون لکھا ہے اور پھر شاہ رخ خان نے اسے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اسی رات شاہ رخ خان نے کیتھ کو دھمکی دی کہ وہ اس کی پٹائی کرے گا۔ اگلے دن اس نے اپنی دھمکی پر بخوبی عمل کیا۔ اس نے کیتھ کے گھر کے دروازے پر بھی اس کی خوب پٹائی کی اور اس کے والدین کے سامنے اسے ننگی اور فحش گالیاں دیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس کی ہمت کیسے ہوئی کہ اس نے میرے (شاہ رخ) اور دیپا ساہی کے بارے یہ سب کچھ لکھا۔ اس کے علاوہ شاہ رخ خان نے کیتھ کو نامرد کرنے کی دھمکی بھی دی۔ کیتھ نے بتایا کہ شاہ رخ خان ایک ایسے شخص کے مانند تھا جو غیض و غضب سے پاگل ہو جاتا ہے۔ ''جس شدت کے ساتھ شاہ رخ خان نے مجھ سے نفرت و کراہت کا اظہار کیا اور ایک کیڑے کے مانند مجھ سے سلوک کیا تو مجھے اس سے مزید بھلائی اور خیر کی توقع نہ رہی۔''

اپنے مدیر کے مشورے پر کیتھ نے شاہ رخ خان کے خلاف تھانے میں رپٹ درج کروا دی لیکن شاہ رخ بدستور اس کے گھر آ کر اسے گالیاں دیتا رہا۔ کیتھ نے اس کے خلاف ایک اور رپٹ درج کروائی اور پولیس سے اپنے لیے حفاظتی انتظامات طلب کیے۔ اس سے اگلے دن شاہ رخ خان کو گرفتار کر لیا گیا۔ ''فلم سٹی'' میں اس کا کام عکس بند ہونے کے بعد اسے باندرا پولیس سٹیشن لے جایا گیا۔ پولیس کے کچھ سپاہیوں نے اس کے دستخط بھی حاصل کیے۔ پھر انہوں نے شاہ رخ خان کو ایک فون کرنے کی اجازت دی۔ اس نے کیتھ کو فون کیا اور کہا ''میں

اس وقت حوالات میں ہوں لیکن میں آؤں گا اور تمہیں...... دیکھ لوں گا......!'' تقریباً ساڑھے گیارہ بجے رات شاہ رخ خان کے قریبی دوست چنکی پانڈے نے اسے ضمانت پر رہا کروالیا۔

دو سال بعد "Cine Blitz" کی ایک اور صحافی ورجینیا واشا نے شاہ رخ خان کو قائل کر ہی لیا کہ کیتھ نے یہ مضمون نہیں لکھا تھا پھر شاہ رخ خان نے اپنے اس رویے کے لیے کیتھ سے بہت زیادہ معافی چاہی۔ اس نے کیتھ کو اپنے گلے لگایا اور اسے کہا کہ اگر وہ چاہے تو وہ اس کے گھر آ کر اس کے والدین سے بھی معافی مانگنے کے لیے تیار ہے۔ اس نے "Cine Blitz" کو ممنون کرنے کے لیے اپنی طرف سے معمول سے ہٹ کر کچھ اقدامات اٹھائے، جریدے کی مرضی کے مطابق تصویریں اتروائیں اور انٹرویو بھی دیے لیکن شاہ رخ خان نے پردہ سیمیں پر دوبارہ اس قسم کا تصریحی منظر کبھی عکس بند نہیں کروایا۔ اس نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں جو رومان انگیز مناظر فلمائے وہ بھی پہلے سے طے شدہ تھے لیکن تصریحی نہیں تھے۔ اس نے پردہ سیمیں پر کبھی بھی بوسہ لینے کا منظر نہیں عکس بند کروایا۔

ہندی فلموں میں کافی عرصے سے ہی ''بوسے'' سے پرہیز کیا جاتا رہا اور ابھی بھی بوسے پر مبنی مناظر پیش نہیں کیے جاتے۔ کروڑوں افراد پر مشتمل یہ قوم پہلے ہی ''جنسی معاملات'' کے متعلق عملی معلومات سے مالا مال ہے لیکن ہندوستانی فلمی صنعت اس معاملے سے دور ہی رہی ہے۔ ہندوستان میں نمائش پذیر ہونے والی تمام فلموں کو حکومت کے مقرر کردہ ''سنٹرل بورڈ آف فلم سرٹیفکیشن'' سے اجازت حاصل ہونا لازمی ہے اور سب طریقہ کار 1952ء میں وضع کیے گئے ایک قانون کے تحت اپنایا جاتا ہے۔ اگرچہ اس قانون کے تحت عملی طور پر بوسہ بازی کی ممانعت نہیں کی گئی لیکن فلمسازوں اور شرمیلے اداکاروں نے جنسی مناظر عکس بند کروانے سے صاف انکار کیا ہے۔ کئی دہائیوں سے بوسہ بازی کے علامتی اظہار کے لیے پرندوں کو ایک دوسرے کی چونچ میں چونچ ڈالے یا پھولوں کو مستی کے عالم میں ایک دوسرے سے گلے ملتے دکھایا جاتا ہے۔ جنسی مناظر کے علامتی اظہار کے لیے بھڑکیلے اور شوخ و چنچل نغمے اور رقص پیش کیے جاتے ہیں جن میں مرد و زن ایک دوسرے کو اٹھاتے، دھکیلتے اور دھکم دھکا ہوتے نظر آتے ہیں مگر ان کے ہونٹ کبھی بھی ایک دوسرے سے مس نہیں ہوتے۔ یہ منافقانہ قدامت پرستی بالآخر نئی ہزاروی کے موقع پر اس وقت ترک کر دی گئی جب فلمسازوں، اداکاروں اور ناظرین کی نئی نسل نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ بلاشبہ ذہنی طور پر اس وقت بالغ اور ذمہ دار ہیں کہ بوسہ بازی

کے باعث پیدا ہونے والی صورتحال سے مناسب طور پر نمٹ سکیں...... لیکن اس وقت بھی جب بوسہ بازی ایک بے تاب شوق میں ڈھل چکی تھی اور ملکہ شراوت نامی ایک اداکارہ نے فلم ''خواہش'' میں شاہ رخ خان کے ساتھ سترہ مرتبہ بوسہ بازی کی لیکن شاہ رخ خان نے یہ سب کچھ بادل نخواستہ کیا۔ اس نے کہا کہ وہ قدرتی طور پر بوسہ بازی سے شرماتا ہے۔ شاہ رخ خان اپنی ساتھی اداکاروں کے ہونٹوں میں اپنے ہونٹ پیوست کیے بغیر ہی ہندوستانی فلموں کا ایک بہت ہی بڑا رومان انگیز اداکار بن گیا۔

استہزائی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو اداکار جنسی معاملات کے حوالے سے اس قدر نازک طبع اور محتاط تھا وہ تشدد کے ضمن میں کیسے بے چینی اور اضطراب محسوس کر سکتا تھا۔ شاہ رخ خان کو مار دھاڑ پر مبنی فلمیں پسند تھیں۔ اس نے اپنی ایک خواہش کا اظہار اگست 1992ء میں "India Today" کے ساتھ یوں کیا: ''میری تمنا ہے کہ میں ہندوستانی فلموں کو مکمل طور پر ایک نئے رخ اور رجحان سے آشنا کروں۔'' شاہ رخ خان نے اپنی فلمی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز "The Idiot" میں ایک برے کردار روگوزن کی اداکاری کے ذریعے کیا، یہ کردار روسی ادب میں ایک شریف ولن کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ وہ ایک دولت مند سوداگر کا بیٹا ہے جو اپنے باپ کی دولت، عزت اور شہرت سب کچھ گنوا بیٹھتا ہے۔ روگوزن ایک بدنام حسینہ کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے جس کا نام نستاشیہ فلپوودنا ہے لیکن اس کے زہریلے جذبات حسد پر مبنی ہوتے ہیں۔ بالآخر جب روگوزن کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ نستاشیہ کو حاصل نہیں کر سکتا تو وہ اسے خنجر گھونپ کر موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ تنقید نگاروں کا کہنا ہے کہ سیاہ بالوں اور چہرے والا روگوزن برائی کا مجسمہ ہے۔ وہ اس ناول کے ہلکے سفید بالوں اور نیلی آنکھوں والے ہیرو ''مائیشکن'' کے بالکل برعکس ہے جو یسوع مسیح کے حلیے سے مشابہ ہے۔ روسی زبان میں ''روگ'' سینگوں کو کہتے ہیں اور اس طرح روگوزن کو برائی کے استعارے کے طور پر لیا گیا ہے جب مانی کاؤل نے اس کردار کو فلمی قالب میں ڈھالا تو اسے ''راغوجن'' کا نام دیا گیا۔ شاہ رخ خان کی مردانہ جنسی وجاہت پر مشتمل نقش و نگار اس کردار کے رویے اور طرز عمل کا بالکل الٹ تاثر پیش کرتے ہیں۔ آخر میں جب راغوجن نستاشیہ کو خنجر گھونپ دیتا ہے تو نہایت تلخی سے کہتا ہے کہ حالانکہ خنجر اس کے بدن میں نہایت گہرائی تک گیا لیکن صرف ایک چمچ بھر خون نکل سکا۔ راغوجن کے کردار میں شاہ رخ خان حقیقی طور پر نہایت خوفناک اور خطرناک دکھائی دے رہا تھا لیکن ایک بہترین

ادبی شاہکار سے ماخوذ ایک فلم میں ولن کے کردار کی اداکاری کسی بھی طرح ایک ہندی فلم میں ایک برے کردار کی اداکاری کے مترادف قرار نہیں دی جا سکتی۔ درحقیقت ایک ہندی فلم میں ہیرو کا کردار ولن کے کردار کے مترادف نہیں سمجھا سکتا۔

اس وقت تک ہندی فلموں میں یہ دکھایا جاتا تھا کہ ایک شخص یا تو اچھا ہو سکتا ہے اور یا پھر بُرا اور ایک شخص میں ان دونوں خوبیوں کی موجودگی کا تصور عنقا تھا۔ ہندوستانی فلم کا ہیرو رزمیہ داستان ''رامائن'' کے ایک کردار ''رام دیوتا'' کا استعارہ اور علامت تصور کیا جاتا تھا جو نیکی کا مجسمہ تھا۔ اس کے برعکس ولن انتہائی برائی اور بدمعاشی کی علامت تھا۔ یہ یک رخی منظر نامہ ان ابتدائی ہندی فلموں کا طرہ امتیاز تھا جن کی کہانیاں زیادہ تر چمکیلے، بھڑکتے لباس، تاریخی پس منظر یا مذہبی روایات پر مشتمل ہوتی تھیں۔ حتیٰ کہ جب ہندوستانی فلمیں جدید دور میں داخل ہوئیں تو پھر بھی اداکاروں نے کرداروں کے مطابق نہیں بلکہ وہی پرانے انداز کے مطابق اپنی اداکاری جاری رکھی۔ یہی صورتحال عظیم ہندوستانی رزمیہ داستانوں، مہابھارت اور رامائن میں بھی بدستور موجود رہی جن میں زندگی سے ماورا مرد وزن شامل ہیں اور جن کا تعلق معاشرے میں افراد کے مذہبی کردار سے ہے۔ انسانی جدوجہد اور کوشش اس عالمگیر کائنات کا ایک حصہ ہے۔ مرد مجرموں اور طوائفوں کے متعلق اوسط درجے کی ہندوستانی فلموں میں اچھائی اور برائی کے درمیان بڑے بڑے معرکے دکھائے جاتے تھے۔ مرکزی مرد کردار ادا کرنے کے لیے چند منتخب اداکار موجود تھے جو روایتی طور پر پرکشش شخصیت اور گورے رنگ کے حامل ہوتے تھے۔ اسی طرح ولن کے کردار کے لیے بھی چند منتخب اداکاروں کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں اور ان میں سے کم از کم کچھ خوفناک حلیے کے مالک ہوتے تھے لہٰذا کسی اداکار یا کردار کو دیکھ کر ہی ناظرین یہ اندازہ لگا لیتے تھے کہ یہ ہیرو ہے یا ولن!

ہندوستانی فلموں میں ''ہیرو مخالف'' کردار کی روایت بہت کم لیکن امتیازی حیثیت سے موجود تھی۔ 1943ء میں اداکار اشوک کمار نے ایک ایسے چور کا کردار ادا کیا جو ایک رقاصہ کی محبت میں گرفتار ہونے کے بعد اپنی اصلاح کر لیتا ہے۔ اس فلم کا نام ''قسمت'' تھا۔ یہ پہلی ہندی فلم تھی جو انتہائی کامیاب ثابت ہوئی۔ کولکتہ کے سینما رکسی تھیٹر میں اس فلم کی نمائش تین سال اور آٹھ ماہ جاری رہی۔ 1950ء کی دہائی میں جب ہندی فلمیں امریکہ اور یورپ میں بھی دکھائی جانے لگیں تو فلمسازوں نے ''ہیرو'' کے نقش کو بھی تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ اس دور کے

کامیاب ترین اداکاروں..... راج کپور، دلیپ کمار اور دیو آنند نے منفی کردار ادا کیے جو بعد ازاں اپنی اصلاح کر لیتے ہیں۔

1993ء میں سنجے دت نے ایک فلم کھل نائیک (ولن) میں دہشت گرد کا کردار ادا کیا، مار دھاڑ سے بھرپور اس فلم کی ہدایات سبھاش گئی نے دی تھیں۔ یہ کردار ایک ایسے سنگدل اور ظالم مجرم کا ہے جو اپنے ہی باپ کو ہلاک کر ڈالتا ہے لیکن حالات کا اتار چڑھاؤ اسے برے کاموں سے الگ رہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس دہشت گرد کو ایک نہایت ہی برے کردار کا حامل ولن گمراہ کرتا ہے۔ یہ دہشت گرد انسانوں کا خون بہانے کا عادی ہوتا ہے لیکن پھر بھی وہ بعض مخصوص اخلاقی معیارات کی پاسداری کرتا ہے۔ ایک جنگل میں ہیروئن اس کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے اور اسے بُرے کام کی ترغیب دینے کے لیے یہ گانا گاتی ہے: ''چولی کے پیچھے کیا ہے؟'' لیکن دہشت گرد اپنے کنوارپن کی حفاظت کرتا ہے اور غلط کام میں ملوث نہیں ہوتا اور پھر اکثر مرکزی کرداروں کے مانند اس دہشت گرد کو اپنے اندر ایک اچھا اور نیک آدمی نظر آتا ہے اور وہ بُرے کاموں سے توبہ کر لیتا ہے۔

ایک ہندوستانی فلم کا ہیرو جب ولن کا کردار بھی ادا کرتا ہے تو اس کا رویہ نہایت محتاط ہوتا ہے۔ ''رامائن'' کا ہیرو لکشمن زمین پر ایک لکیر کھینچتا ہے اور اپنی سالی سیتا سے کہتا ہے کہ وہ اس ''لکشمن ریکھا'' (لکشمن کی کھینچی ہوئی لکیر) سے باہر قدم نہ رکھے یہ لکیر نسوانی شرم وحیا کی حد ہے۔ سیتا کے مانند فلمی ہیروئنوں نے بھی آفاقی اخلاقی معیارات کی خلاف ورزی نہیں کی۔ ایک ناقابل اصلاح اور نفسیاتی طور پر منتشر ہیرو جو اپنی بہن سمیت بے گناہ اور معصوم لوگوں کو ہلاک کر دیتا ہے، اس کی اصلاح کا تصور بھی ناممکن ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب فلمساز عباس مستان نے "A kiss Before Dying" کو دوبارہ تیار کرنے کی کوشش کی تو کوئی بھی اداکار اس فلم میں کام کرنے پر تیار نہ ہوا۔

عباس، مستان اور حسین برمانوالا ہندوستانی فلمی صنعت کے ''سفید آدمی'' کہلاتے تھے۔ یہ تینوں بھائی تقریباً ایک ہی جیسے کڑک استری شدہ سفید سفاری سوٹ پہنتے تھے، انہوں نے یکے بعد دیگرے بہت سی فلمیں تیار کیں۔ عباس اور مستان ہدایتکاری کرتے اور حسین تدوین کے فرائض سرانجام دیتا۔ انہیں ''عباس مستان'' (درمیان میں کسی وقفے کے بغیر) کہا جاتا تھا۔ ان کے بھتیجے سیفو نے انہیں مشورہ دیا کہ ارالیون کے ناول سے ماخوذ A Kiss Before Dying

نامی فلم دیکھیں جس کی کہانی ایک مزدور طالب علم کے گرد گھومتی ہے جو اپنی خاتون دوست کو قتل کر دیتا ہے اور پھر اس کی بہن سے شادی کرنے کا منصوبہ بناتا ہے۔ عباس مستان نے مکمل فلم نہیں دیکھی نصف فلم گزرنے کے بعد بجلی بند ہوگئی لیکن جس قدر بھی انہوں نے یہ فلم دیکھی وہ قائل ہوگئے کہ انہیں یہ فلم دوبارہ بنانی چاہیے۔

ہالی ورڈ کی فلموں کی دوبارہ تیاری کوئی خلاف معمول بات نہ تھی۔ ہندوستانی فلمی صنعت میں کافی عرصے سے ہی ہالی وڈ کی فلموں سے ماخوذ کہانیوں اور مسروقہ مرکزی خیالوں کے مطابق فلمیں تیار کرنے کا رجحان اور روایت موجود تھی۔ حتیٰ کہ راج کپور بھی چارلی چپلن کی آوارہ گرد اور مجہول شخصیت سے بہت متاثر تھا۔ اس میں اس قدر صلاحیت موجود تھی کہ وہ چارلی چپلن جیسے کردار کو ہندوستانی ماحول میں ڈھال کر ''شری 420'' جیسی فلمیں تیار کرتا لیکن جب صلاحیت اور مہارت کی کمی ہو تو پھر کسی کردار کو چوری کر لینا نہایت ہی آسان کام ثابت ہوتا ہے۔ ہندوستانی فلمی صنعت میں ایسے بے شمار مصنف اور ہدایتکار موجود ہیں جو ہالی وڈ کی فلمیں مکمل طور پر چوری کر لیتے ہیں اور انہیں ہندوستانی فلم کا روپ دے دیتے ہیں یعنی ہالی وڈ کی فلموں میں سے جنسی مناظر نکال کر ان کی بجائے جذباتی اور گھریلو مناظر اور گانے شامل کر دیتے ہیں۔ عباس مستان نے بھی یہی طریقہ کار اپنایا۔ ہیرو کا گھرانہ اس وقت تباہی کا شکار ہو جاتا ہے جب اس کے باپ کو اس کا کاروباری شراکت دار دھوکا دیتا ہے لہٰذا ہیرو بھی اس گھرانے کے ساتھ یہی سلوک کرتا ہے۔ پہلے اس خاندان کی ایک بیٹی سے محبت کی پینگیں بڑھاتا ہے، اسے قتل کر دیتا ہے اور پھر دوسری بیٹی کو اپنی محبت کے جال میں گرفتار کر لیتا ہے۔

بہرحال اس قسم کے مقاصد اور محرکات اس قدر زیادہ طاقتور نہیں تھے کہ کوئی بھی مشہور اداکار ''بازی گر'' نامی فلم میں کام کرنے کی حامی بھر لیتا۔ عامر خان نے انکار کر دیا۔ انیل کپور نے بھی یہ کردار ادا کرنے سے معذرت چاہی۔ سلمان خان کے والد کہانی نویس سلیم نے صاف انکار کرنے کے بجائے یہ گول مول جواب دیا کہ اس کے بیٹے (سلمان خان) میں اس قدر صلاحیت و مہارت موجود نہیں ہے کہ اس قسم کا منفی کردار ادا کر سکے۔ عباس مستان اب بہت مشکل میں پڑ گئے اور مایوس و پریشان ہوگئے تھے اور اسی مایوسی کے عالم میں ہی انہوں نے شاہ رخ خان کے متعلق سوچا۔ وہ ٹی وی پر اس کے نشر ہونے والے سلسلے وار کھیل دیکھ چکے تھے اور اس سے ملاقات بھی کر چکے تھے۔ اگرچہ ان کی نظر میں شاہ رخ خان ایک ''روایتی ہیرو'' کی

خوبیوں سے عاری تھا لیکن اس میں کوئی نہ کوئی ایسی صلاحیت اور خوبی موجود تھی جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی تھی۔ فلمساز رتن جین حیران تھا کہ کیا ہدایتکار ان کی فلموں کو کم تر سمجھ رہے ہیں۔ عامر اور سلمان دونوں نے ہی اپنی اداکاری کا آغاز نہایت ہی کامیاب فلموں سے کیا تھا۔ انیل ایک تجربے کار ہیرو تھا۔ ان کے مقابلے میں شاہ رخ خان ایک معمولی اداکار تھا جس کو صرف ایک ہی کامیابی نصیب ہوئی تھی اور بے شمار صلاحیتوں سے مالا مال تھا۔

لیکن شاہ رخ خان ہی ایک ایسا واحد اداکار تھا جو ایسا کردار کرنے پر آمادہ تھا جو شادی کے قابل اپنی خاتون دوست کو چھت سے نیچے پھینک دیتا ہے اور پھر اس کے دو دوستوں کو بھی ہلاک کر دیتا ہے تا کہ وہ اس کا راز فاش نہ کر سکیں۔ 1992ء میں عباس مستان نے شاہ رخ خان کو ڈیڑھ گھنٹے تک کہانی کی تفصیلات سے آگاہ کیا جب انہوں نے اپنا کام ختم کر لیا تو شاہ رخ خان نے اس فلم میں اداکاری کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی اور فوراً ہی ان کے ساتھ گفتگو کا آغاز کر دیا کہ وہ بعض مناظر میں اداکاری کیسے کرے گا...... شاہ رخ خان کو ''برا کردار'' بہت پسند تھا ''میرا استدلال یہ ہے کہ اگر آپ ''شعلے'' کو گبر سنگھ کے نقطہ نظر کے مطابق بیان کریں تو یہ قتل درست دکھائی دیں گے۔'' عباس مستان اس خدشے میں مبتلا تھے کہ یہ نہ ہو کہ ایک مستند اداکارہ کو قتل کرنے کے باعث شاہ رخ خان ناظرین کی ہمدردیوں سے محروم ہو جائے۔ لہٰذا نئی لڑکیوں کا انتخاب کیا گیا۔ ایک لڑکی کا نام کاجل تھا جو مشہور اداکاروں کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اسکی ماں نانو جا اور دادی شوبھانا سمارتھ مشہور اداکارائیں تھیں۔ 1990ء کی دہائی میں کاجل اور شاہ رخ خان ہندی فلموں کا سب سے اچھی جوڑی بن چکے تھے اور انہیں بے شمار کامیابیاں حاصل ہوئیں تھیں لیکن جب ''بازی گر'' تیار ہو رہی تھی تو وہ ابھی بالغ بھی نہیں ہوئی تھی اور اس کی ماں نے معاہدے پر دستخط کیے تھے۔

اداکاری کے دوران شاہ رخ خان نے اپنے اوپر ولن کا مکمل روپ طاری کر لیا تھا۔ وہ پردہ سیمیں پر ایک برا اور بدمعاش انسان کے طور پر نمودار ہونے سے قطعی گھبرا نہیں رہا تھا۔ بعض مناظر میں اس کا چہرہ اس قدر قریب سے بھی دکھا دیا جاتا کہ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئیں اور ڈھیلے باہر نکلے ہوتے، چہرے پر خون کی دھاریاں ہوتیں اور اس کے ہونٹ اس قدر شدید انداز میں کانپ رہے ہوتے کہ ایسے معلوم ہوتا کہ وہ کسی شدید بیماری میں مبتلا ہے۔ اس کردار میں مزید شدت پیدا کرنے کے لیے شاہ رخ خان نے اپنی طرف سے بھی کئی طریقے

آزمائے۔ جس لڑکی کے پاس اس کے جرم کا تصویری ثبوت موجود تھا، اسے نہایت بہیمانہ انداز میں قتل کرنے کے بعد وہ کیمرے کے شیشے میں سے گھور کر دیکھتا ہے۔ اس ثبوت کو اپنے دانتوں سے چباتا ہے اور پھر اسے نگل لیتا ہے۔ اپنی خاتون دوست کو چھت پر سے اچھالنے سے قبل وہ اسے خوفناک نظروں سے گھورتا ہے اور پھر کہتا ہے "آئی ایم سوری!" شاہ رخ خان قاتل کا کردار انتہائی صراحت کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ کئی سالوں بعد اس نے دستاویزی فلمساز نسرین منی کو بتایا کہ "برے کردار کی اداکاری میرے ذہن میں آنے والا پہلا تخلیقی خیال تھا میں نے یہ جوبن گنوادیا ہے اور کچھ نیا اور تخلیقی کام کرنا چاہتا ہوں۔"

شاہ رخ خان فلمی صنعت میں مروج روایتی معمولات کے خلاف کام کرنے کا اس قدر مشتاق تھا کہ اس نے مزید دو فلموں میں برے کردار ادا کرنے کی حامی بھر لی۔ ایک فلم تو اسی وقت بازی گر کے مانند تیار کی گئی۔ اس کا نام "ڈر" تھا جسے ہندی فلموں کے ایک بہت ہی مشہور فلمساز یش چوپڑا نے تیار کیا تھا۔

❁

دسواں باب

قتل ہی قتل

یش چوپڑا کی زندگی میں رومان کا عنصر کم ہی تھا۔ وہ ایک ایسا فلمساز تھا جو سر سے گنجا تھا اور عمر بھی اس کی کافی ہو چکی تھی اور پنجابی ایسے ٹھیٹ لہجے میں بولتا تھا کہ اس کے بولے ہوئے فقرے آسان زبان میں ترجمہ کیے بغیر کسی کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ اس نے نہ تو کبھی سگریٹ نوشی کی تھی، نہ ہی الکحل کو ہاتھ لگایا تھا اور نہ ہی کسی بھی شکل میں کیفین استعمال کی تھی۔ اس کا پسندیدہ مشروب خالص دودھ سے تیار شدہ "لسی" تھا۔ ہندوستانی فلمی صنعت میں دہائیوں کی کوچہ گیری کے باوجود اس پر فلمی صنعت کی چکاچوند کا رنگ نہیں چڑھا تھا۔ وہ سادہ سی قمیض پہنتا تھا اور اپنی عادت کے مطابق اپنے سے چھوٹے کو "بیٹا" کہہ کر پکارتا تھا۔ درحقیقت بہت سے اداکار اسے "یش چچا" کہہ کر بلاتے تھے۔ یش نے پینتیس برس کی عمر میں اپنے والدین کی مرضی سے شادی کی، اس کے دو بیٹے تھے جو اس کے ساتھ قدیم وضع کی تعظیم و تکریم کے ساتھ پیش آتے تھے۔ مختصر یہ کہ یش ہندوستانی فلمی صنعت سے منسلک ہر فرد کے لیے اس کا پسندیدہ اور قابل تعظیم انسان تھا۔

یش ایک باقاعدہ فلمساز نہیں تھا۔ چالیس برس تک کامیاب فلمیں بنانے کے بعد اس نے فلمسازی کا ایک خاص انداز تخلیق کر لیا تھا جس کا سب احترام و ادراک کرتے تھے اور بے شمار لوگ اسی انداز کو اپنانے کی کوشش کرتے تھے۔ کہنہ مشق یش چوپڑا کی فلمیں غیر معمولی حسن اور خوبصورتی کا مرقع ہوتی تھیں۔ اس کی فلم کی ہیروئن جو اس دور کی صف اول کی اداکارہ ہوتی تھی، حسن اور خوبصورتی کا مجسمہ ہوتی تھی اور شفون کی ساڑھی اس کے حسن کو چار چاند لگا دیتی تھی۔ رومانی مناظر خوبصورت اور شاندار غیر ملکی مقامات (عام طور پر سوئٹزر لینڈ) پر فلمائے جاتے تھے اور تصنع سے بالکل پاک ہوتے تھے۔ یش بے ہودہ شہوانیت کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا۔ برقی بارش میں گائے جانے والے نغمے اس کی تنقید کا نشانہ ہوتے تھے جن میں ہیروئن

لازمی طور پر سفید باریک کپڑوں میں ملبوس ہوتی تھی اور بھیگ جاتی تھی لیکن شہوانیت نے اس روشن دنیا کو کم ہی متاثر کیا تھا اور عیش وعشرت، بے وفائی، حسد، رشک، عدم تحفظ جیسے عناصر پردہ سیمیں پر کم ہی نظر آتے تھے اور ان سب سے بڑھ کر لیش نے گھریلو اور خاندانی اقدار کو فروغ دیا اور ان کی ترویج اس کی ہر فلم کا مقصد ہوتا تھا۔ اس کی فلموں میں دولت مند، مہذب اور شائستہ لوگ بدرجہ اتم موجود ہوتے تھے جو معاشرتی اور خاندانی اقدار کی حفاظت کے لیے بھرپور جدوجہد اپنا فرض سمجھتے تھے۔

1990ء کی دہائی میں لیش کامیاب فلموں کا ''بادشاہ گر'' بن گیا تھا۔ اس کا فلمی ادارہ ''لیش راج فلمز'' ایک کامیاب لیکن مستحکم ادارے کی حیثیت سے ابھرا جو ہر چند سال بعد ایک دو ایسی غیر معمولی کامیاب فلمیں تیار کرتا جو ناظرین کے لیے دلچسپی اور تفریح کا باعث ہوتیں۔ اس ادارے کے کئی شعبے تھے فلمسازی، ٹی وی سافٹ ویئر، میوزک ویڈیوز اور گھریلو تفریح۔ یہ ادارہ عالمی سطح پر فلموں کا تقسیم کار بھی تھا اور موسیقی (نغموں) کے ایک ذیلی ادارے کا مالک بھی تھا۔ ایک لاکھ اسی ہزار مربع فٹ پر مشتمل وسیع وعریض شاندار اور تمام سہولیات سے مزین لیش راج فلم سٹوڈیو کا افتتاح 2005ء میں ہوا۔ ایک سال پہلے ''ہالی وڈ رپورٹر'' کے مطابق لیش راج فلمز سٹوڈیو دنیا بھر کے سو فلم سٹوڈیوز میں سے ستائیسویں درجے پر تھا۔

لیش کی زندگی ''پریوں کی کہانی'' پر مبنی ایک فلم کی مکمل تصویر تھی جب وہ یکم جنوری 1951ء میں ممبئی آیا تو اس کی جیب میں صرف دو سو روپے تھے اور اس کی عمر محض انیس برس تھی۔ لیش کی پیدائش تقسیم ہند سے پہلے لاہور میں ہوئی تھی اور اس کی زیادہ تر پرورش اس کے بڑے بھائی بی۔ آر۔ چوپڑا کے گھر ہوئی تھی جو اس وقت ایک فلمی صحافی تھا۔ 1945ء میں لیش اپنی تعلیم جاری رکھنے کی خاطر جالندھر منتقل ہو گیا۔ 1947ء میں تقسیم ہند سے فوراً پہلے بی۔ آر۔ چوپڑا ممبئی چلا گیا اور اس نے فلمسازی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ لیش نے اس کے نائب کی حیثیت سے ایک سو پچاس روپے ماہوار کے عوض اس کے پاس ملازمت حاصل کر لی۔ سات سال کے بعد وہ آہستہ آہستہ کوشش کرتے ہوئے اوسط درجے کا نائب ہدایتکار بن چکا تھا۔ 1959ء میں بی۔ آر نے اسے کامیابی کا موقع دیتے ہوئے اسے ایک فلم ''دھول کا پھول'' کی ہدایتکاری کے فرائض سونپے۔ یہ فلم ایک غیر قانونی (ناجائز) بچے کے متعلق تھی جو نہایت ہی کامیاب ثابت ہوئی اور پھر لیش نے اپنے بھائی کے لیے چار کامیاب فلموں کی ہدایتکاری کی۔

1965ء میں بننے والی ''وقت'' نامی فلم وہ پہلی فلم تھی جس میں لیش نے اپنے مخصوص انداز کار کا مکمل اور بھرپور اظہار کیا تھا۔ یہ فلم اب تک بننے والی فلموں میں سے سب سے مہنگی فلم تھی۔ زیادہ تر رقم بڑے اداکاروں اور ان کے مخصوص انداز ہائے اداکاری پر صرف کی گئی تھی۔ ''وقت'' کا ایک ایسی پہلی ہندی فلم کے طور پر وسیع پیمانے پر خیر مقدم کیا تھا جس میں بہت سے بڑے اداکار شامل تھے۔ صف اول کے پانچ اداکار اس فلم کی زینت تھے اور مناظر چمک دمک سے مزین تھے۔ اداکارائیں نئے اور جدید انداز کے لباس اور ہیرے جواہرات کی نمائش کرتے ہوئے تقریبات میں شامل ہو کر اور عظیم الشان عمارتوں میں آمدورفت کے ذریعے اپنی سج دھج دکھا رہی تھیں۔ اداکار جدید لباس پہنے ہوئے تھے، غیر ملکی کاروں میں ایک دوسرے سے ریس لگا رہے تھے اور بلیرڈ کھیلتے تھے۔ اس فلم کی عکس بندی کشمیر اور شملہ جیسے خوبصورت مقامات پر ہوئی تھی۔ مختلف مناظر کے لیے بنائے گئے مصنوعی مقامات بہت ہی دلکش اور شاندار تھے۔ بہت سے ایسے عظیم الشان گھر بھی دکھائے گئے تھے جن میں عظیم الجثہ پیانو پڑے تھے اور پھر دالانوں میں فوارے اپنی بہار اور شان وشوکت دکھا رہے تھے۔ دولت مندی کے اس اظہار کو مزید بھڑکیلا بنانے کے لیے مختلف رنگ استعمال کیے گئے تھے۔ بی۔ آر چوپڑا نے اپنے ادارے کے لیے پہلی رنگین فلم بنانے کی ذمہ داری اپنے بھائی لیش کو سونپ دی تھی۔

1971ء میں لیش نے اپنی انتالیسویں سالگرہ پر اپنا ذاتی فلمی ادارہ لیش راج فلمز قائم کیا۔ اس کے لیے اپنے بھائی کے سایہ عاطفت سے باہر نکلنے کا عمل ایک اہم اور ہیبت ناک فیصلہ تھا۔ ان بھائیوں نے اپنے اس اختلاف کے بارے کبھی بھی علی الاعلان اظہار نہیں کیا تھا لیکن فلمی دنیا میں ان کی باہمی علیحدگی کے ضمن میں ایک یقینی افواہ موجود تھی۔ لیش نے حال ہی میں شادی کی تھی اور اس کی بیوی پامیلا ان دونوں بھائیوں کے درمیان اختلاف کی ممکنہ وجہ بیان کی جاتی تھی۔ بی۔ آر نے باپ کے مانند لیش کی پرورش کی تھی۔ سالوں بعد لیش نے اپنے سوانح نگار ڈاکٹر راشل ڈائیر کو بتایا: ''میں بی۔ آر کا احترام کرتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ میں جو کچھ ہوں صرف اسی کی وجہ سے ہوں۔ اس نے میری پرورش کی لیکن میں نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا۔'' لیکن پیشہ وارانہ طور پر اپنے بھائی سے علیحدگی سے پیدا ہونے والی مایوسی اور افسردگی کو کم از کم اس کی پہلی ذاتی طور پر تیار کردہ فلم ''داغ'' نے بہت کم کر دیا۔ ''داغ'' کی تشہیر ''پیار کی نظم'' کے طور پر کی گئی اور یہ ایک ایسے شخص کی روایتی داستان تھی جو دو بیویوں کے بعد بھی خوشگوار

زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ فلم یش چوپڑا کے تصور کے مطابق اعلیٰ جذباتی مناظر، چمکتے بھڑکیلے لباس پہنے اداکاروں، خوبصورت مقامات اور دل نشین نغمات پر مشتمل تھی۔

بعض اوقات یش اپنے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے مختلف قسم کی فلم بناتا۔ 1975ء میں اس نے امیتابھ بچن کی انتہائی کامیاب فلم ''دیوار'' کی ہدایتکاری کی۔ اس بہترین فلم کے باعث فلمی دنیا میں امیتابھ بچن کا ''اینگری ینگ مین'' کا تاثر قائم ہوا لیکن ایک سال بعد ہی یش نے اسے اپنی فلم ''کبھی کبھی'' میں ایک پر تفکر شاعر کا کردار دے کر اس کا نقش اور تاثر تبدیل کر دیا۔ یہ ایک رومانی داستان تھی جو کئی نسلوں پر مشتمل تھی۔ اب ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یش کامیاب فلموں پر اپنی گرفت کھو رہا ہے۔ اس کی یکے بعد دیگرے پانچ فلمیں ناکام ہوئیں۔ دس برس کامیابی کی تلاش میں مسلسل ناکامی کے بعد 1989ء میں یش اپنے پرانے موضوع ''رومان'' کی طرف لوٹ گیا۔ متوسط طبقے کی ایک لڑکی اور ایک دولت مند لڑکے کی رومان انگیز کہانی ''چندنی'' کے ذریعے یش نے بطور فلمساز اپنی حیثیت مستحکم کر لی پھر اس نے کبھی بھی اپنے اس ''سکہ بند'' انداز سے روگردانی نہیں کی۔

یش کا بڑا بیٹا ادتیا جہاں تک دیکھ سکتا تھا اور سن سکتا تھا اس نے اپنے باپ کا انداز اپنے اندر جذب کیا۔ ایک چار سالہ بچے کی حیثیت سے وہ ''کبھی کبھی'' کی فلمبندی کے مقام پر اپنے گلے میں بھاری کیمرہ ڈال کر گھوما پھرا کرتا حالانکہ یہ بھاری کیمرا اکثر اس کی گردن کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوتا لیکن وہ اسے اپنے گلے سے اتارنے پر رضامند نہ ہوتا۔ فلمبندی کے اکتا دینے والے مناظر اس کے لیے بیزار کن ثابت نہ ہوتے اور اس کے والدین اسے یہاں سے گھسیٹ کر گھر لے جاتے۔ چھ سال کی عمر تک ادتیا کو یہ سمجھ آ چکی تھی کہ ایک فلم میں ہر شخص کی اپنی اپنی اہمیت اور کردار ہے۔ مشہور اداکار، ہدایتکار، موسیقار اس کے وسیع و عریض مکان میں مہمان کی حیثیت سے موجود رہتے تھے۔ فلم ہی اس کے لیے سب کچھ تھی۔ ادتیا کے فلمساز بننے کا فیصلہ شعوری نہیں تھا بلکہ یہ اس کی قسمت کا فیصلہ تھا۔

''یش راج فلمز'' کی فلموں کو ناظرین کے لیے تفریحی رنگ دینے میں ادتیا کا کردار بہت اہم ثابت ہوا۔ برس ہا برس تک فلمیں دیکھنے اور ان کا جائزہ لینے کے باعث اس میں موجود تجارتی اور کاروباری جبلتیں نکھر گئی تھیں اور انہیں بہت تقویت پہنچی تھی۔ ادتیا اپنی نوعمری ہی سے ہندوستانی فلموں کو دیکھنے کا شوقین تھا اور ان کا ہر لحاظ سے جائزہ لیا کرتا اور پھر ان کا تجزیہ کرتا۔

وہ راج کپور، بمل رائے اور اپنے تایا بی۔ آر۔ چوپڑا کی ہدایتکاری میں تیار شدہ اثر انگیز فلمیں دیکھتا اور کہانی بیان کرنے کے انداز کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتا اور یہ بھی غور کرتا کہ فلم کے اجزائے ترکیبی کیا ہوتے ہیں اور اس ذریعہ ابلاغ کے ماہرین کیونکر ناظرین پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہر جمعے کو وہ اپنے نزدیکی سینما میں نمائش کے لیے پیش کی جانے والی نئی فلم دیکھنے کے لیے پہنچ جاتا۔ یہ ایک انتہائی انوکھی اور عجیب بات تھی کیونکہ فلمی صنعت سے منسلک لوگ عام طور پر نہایت شاہانہ انداز میں اپنے خاندانی افراد، دوستوں اور خوشامدیوں کو ساتھ لیے سینما ہال میں فلم سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن ادتیا چاہتا تھا کہ وہ اصلی ناظرین کے مانند فلم دیکھے اور انہی کے مانند محسوس کرے تاکہ اسے معلوم ہو کہ دراصل ناظرین چاہتے کیا ہیں۔ اس نے ناظرین کے تاثرات اور ردعمل کے متعلق تحقیق کی، جائزہ لیا اور تجزیہ کیا۔ وہ فلمی صنعت کے افراد میں ''پہلے دن پہلا شو دیکھنے والا شخص'' کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔

1989ء سے 1991ء کے درمیان ادتیا نے جو فلمیں دیکھی تھیں ان کے متعلق اس نے تفصیلی معلومات اپنے پاس درج کر لی تھیں۔ وہ جو بھی نئی فلم دیکھتا وہ اس کی نمائش کے پہلے ہفتے کے دوران ناظرین کے تاثرات اپنے پاس تحریر کر لیتا پھر اگلے دو تین ہفتوں میں اس فلم کے متعلق عوام کا ردعمل اپنے پاس لکھ لیتا اور پھر اس کے بعد اس فلم کے متعلق اپنا اندازہ بھی درج کر لیتا۔ علاوہ ازیں وہ اپنی دیکھی جانے والی فلموں کا ماہانہ تفصیلی جائزہ بھی مرتب کرتا۔ اس ضمن میں ادتیا کسی بھی قسم کے تعصب سے کام نہ لیتا۔ وہ ''بڑے گھر کی بیٹی'' جیسی عام اور معمولی فلمیں بھی اسی جوش و خروش سے دیکھتا (اس نے اپنی کاپی میں لکھا ہوتا: فلمسازی کی توہین)۔ ہر سال کے آخر پر فلموں کے متعلق اپنی پیش گوئیوں کا اصل نتائج کے ساتھ تقابل کرتا اور عام طور پر اس کے 80 فیصد اندازے درست ثابت ہوتے۔

اپنے والد کے نائب کی حیثیت سے اس نے 1989ء میں اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ یہ دور اس کے لیے مواقعوں سے بھرپور تھا۔ ''چندنی'' کے ذریعے ستاون سالہ بوڑھا یش اپنی فلموں کی گم شدہ ''رومانی'' حیثیت اور اپنی کامیابی ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ادتیا کی ماں نے اصرار کیا کہ اسے پہلے اپنے کالج کی تعلیم مکمل کر لینی چاہیے اس لیے ادتیا بعض مواقعوں پر فلمبندی کے وقت موجود نہ رہ سکا لیکن فلمبندی مکمل ہونے کے بعد تمام مراحل کے دوران وہ بدستور موجود رہا۔ نمائش سے قبل فلمی صنعت نے اس کے متعلق ''ملاجلا ردعمل'' کی پیش گوئی کی

تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ''رومانی مثلث'' نہایت ہی بے معنی اور گھسی پٹی ہے لیکن ادتیا کو یہ رومانیت بہت پسند تھی۔ اس نے پیش گوئی کی کہ اس کے والد نے ایک ''بہت ہی کامیاب فلم'' تیار کی ہے۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ ''چندنی'' نے تشدد کے اس رجحان اور کردار کو فنا کر دیا جسے ایک سال قبل ''قیامت سے قیامت'' تک نے رواج دیا تھا۔ اس فلم نے لیش کو دوبارہ صف اول کے فلمسازوں میں شامل کر دیا۔

وہ شرمیلا لڑکا جو کبھی کبھاری ہکلاتا بھی تھا ایک ایسے نوجوان کے روپ میں ظاہر ہوا جو اپنے علم، تجربے اور مہارت کے ذریعے کسی بھی فلم کے متعلق بالکل درست پیش گوئی کر سکتا تھا اور جس کی خواہشات بھی اسی کے مانند جوان تھیں جب ادتیا نے اپنے باپ کے سامنے ایک ایسے عاشق کے متعلق فلم بنانے کا عندیہ ظاہر کیا جس کا اوڑھنا بچھونا ہی محبت تھا تو لیش نے اپنے بیٹے کی بات سن لی۔

1989ء کی ہیجان خیز فلم "Dead Calm" ایک ایسے شادی شدہ جوڑے کے متعلق تھی جو بحری جہاز میں تفریحی دورے پر جاتے ہوئے نفسیاتی طور پر منتشر ایک مجرم کی دہشت گردی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ کسی حد تک فلم 'ڈر' سے متاثر ہو کر بنائی گئی۔ ادتیا کے خیال کے مطابق یہ ایک کم خرچ فلم تھی جس میں نہ تو نغمے تھے اور نہ ہی بڑے اداکار تھے لیکن اداکار رشی کپور نے جس نے اپنے طور پر اس فلم میں اپنے لیے مرکزی کردار کا انتخاب کر لیا تھا لیش کو مشورہ دیا کہ وہ اس کی ہدایتکاری کے فرائض خود انجام دے اور یہی موقع تھا جب یہ فلم ایک بھرپور رومان پر مبنی فلم میں تبدیل ہو گئی جس میں خوبصورت لباس پہنے ہوئے اداکار سوئٹزرلینڈ کے مقام پر اچھلتے کودتے نظر آتے تھے۔ لیش چوپڑا کے بیان کے مطابق یہ ایک بہت بڑی رقم سے تیار ہونے والی فلم ہونا تھی جس میں موسیقی بھی بھرپور طور پر موجود ہونا تھی۔

بالآخر سنی دیول نے ''ڈر'' کے روایتی ہیرو کا کردار ادا کیا، بحری فوج کا ایک دیانتدار کمانڈو جو ایک منتشر نوجوان کے ساتھ جنگ کرتا ہے۔ جوہی چاولہ کو شیفون میں ملبوس خوبصورت ''کرن'' خاتون کے کردار کے لیے منتخب کیا گیا لیکن چوپڑا باپ اور بیٹا اس وقت حیران و پریشان ہو گئے جب انہیں غیر روایتی محبت کی تکون کا تیسرا ''ضلع'' منتخب کرنا پڑا۔ راہول کا کردار ہندوستانی فلموں کا ایک کردار تھا۔ راہول ایک تنہا اور مضطرب نوجوان ہے جو اپنی اس ماں سے باتیں کرتا ہے جس کا انتقال اٹھارہ سال پہلے ہو چکا تھا۔ وہ ہیروئن کا تعاقب

کرتا ہے اور اسے اپنے تشدد کا نشانہ بناتا ہے جب وہ اس کی محبت دھتکار دیتی ہے تو اس کے جذبات متشددانہ ہو جاتے ہیں۔ ''بازی گر'' کے مرکزی کردار کے مانند راہول معصوم اور بے گناہ افراد کو بغیر کوئی پشیمانی محسوس کیے ہلاک کر ڈالتا ہے۔ ''ڈر'' کے آخر میں وہ سنیل اور کرن کا ان کی شادی کے موقع پر پیچھا کرتا ہے۔ وہ نہایت بہیمانہ انداز میں سنیل کو خنجر گھونپ دیتا ہے اور اسے فوراً اپنے ساتھ شادی پر مجبور کرتا ہے۔ ''ڈر'' کے آخر میں سنیل راہول کی اس قدر پٹائی کرتا ہے کہ وہ خون میں لت پت ہو جاتا ہے اور پھر اسے گولی مار کر ہلاک کر دیتا ہے۔

اداکاروں کے انتخاب کے لحاظ سے ''ڈر''، ''بازیگر'' کا چربہ تھی۔ کوئی بھی مستند اور سکہ بند اداکار نفسیاتی طور پر منتشر عاشق کا کردار ادا نہیں کرنا چاہتا تھا حالانکہ فلم کا ہدایتکار اپنے وقت کا نہایت ہی مشہور اور تجربے کار ہدایتکار لیش چوپڑا کے مانند تھا۔ فلم کے آخری منظر میں جس میں سنی دیول نے راہول کو زمین پر پھینک کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا تھا۔ خاص طور پر دوسرے اداکاروں کے لیے اس کا ادراک بہت ہی مشکل تھا۔ انہیں یہ فکر تھی کہ پردہ سیمیں پر ان کی طرف سے اس قسم کے بہیمانہ ظلم کے باعث ان کے ''ہیرو'' کے تشخص کو ٹھیس پہنچتی لیکن سنی کے متعلق مشہور تھا کہ وہ مسودے میں مداخلت کا مرتکب ہو سکتا ہے اور عامر کو یہ خدشہ تھا کہ اس کا تجربے کار ساتھی مسودے میں تبدیلی کے لیے مجبور کرتا بالآخر عامر خان نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ بہرحال ''ڈر'' کی فلمبندی کا آغاز تیسرے مرکزی کردار کی موجودگی میں ہو گیا پھر لیش نے اجے دیوگن اور سنجے دت سے بات کی لیکن ان دونوں نے بھی انکار کر دیا۔ اس وقت صورتحال بہت ہی پریشان اور مایوس کن تھی جب ان کے ذہنوں میں شاہ رخ خان کا نام ابھرا۔

ادتیا کو ''دیوانہ'' میں شاہ رخ خان کی اداکاری بہت پسند آئی تھی۔ شاہ رخ خان عروج پر تھا لیکن ادتیا یہ ادراک کر سکتا تھا کہ وہ ایک ذہین اداکار ہے جو فلم میں جذباتی گھریلو لب و لہجے کو اپنا سکتا ہے۔ اڈتیا کا کہنا تھا: ''شاہ رخ خان کی اداکاری قابل تحسین تھی میں نے اسے اداکاروں کی پرانی اور نئی نسل کے درمیان ایک پل کی حیثیت سے سمجھا۔ اسے دیکھ کر مجھے شدت سے احساس ہوا کہ وہ اپنی اداکاری کے ذریعے ناظرین کے دل موہ لینا چاہتا ہے۔'' اس کی اداکاری کے متعلق اندازہ لگانے کے لیے لیش نے ایک نامکمل فلم "King Uncle" کا ایک نغمہ منگوا کر دیکھا لیکن لیش قطعی متاثر نہ ہوا۔ اس کے خیال کے مطابق شاہ رخ خان کی شخصیت اس کے مطلوبہ مرکزی کردار کے مطابق نہ تھی لیکن ادتیا کے اصرار پر وہ شاہ رخ خان سے ملاقات

کرنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ یہ ملاقات کامیاب رہی کیونکہ ایک تو شاہ رخ کی شہرت ایک اچھے اداکار کی سی تھی لیکن بڑی وجہ یہ تھی کہ یش اور ادتیا کی نظر میں کوئی متبادل اداکار نہ تھا۔ اس طرح شاہ رخ خان کو ''ڈر'' میں ایک شرمیلے، مضطرب، ظالم عاشق کے کردار کے لیے منتخب کر لیا گیا۔

آئندہ دہائیوں میں ''شاہ رخ خان یش راج فلمز'' کے لیے ایک مستقل ''ذریعہ تقویت'' کی حیثیت اختیار کیا گیا۔ یش اور ادتیا دونوں نے اپنی فلموں میں اسے بار بار اداکاری کے لیے منتخب کیا جس طرح فلمی رفقاء سلیم اور جاوید اور ہدایتکاروں پرکاش مہرا، رمیش سپی، من موہن ڈیسائی اور یش چوپڑا نے امیتابھ بچن کی شخصیت تخلیق کی تھی، عین اسی طرح عظیم اداکار شاہ رخ خان کے تشخص کی تشکیل بھی یش اور ادتیا کے ہاتھوں ہوئی۔ ادتیا کے نہایت قریبی دوست اور کسی زمانے میں اس کے نائب کرن جوہر نے اپنی فلموں میں شاہ رخ خان کی شخصیت کے تاثر کو مزید تقویت بخشی جو ناگزیر طور پر یش اور ادتیا کے ہاتھوں تشکیل پانے والی شاہ رخ خان کی شخصیت کی ہی ایک قسم تھی۔

یش چوپڑا کے ساتھ کام کرتے ہوئے شاہ رخ خان کو کرن کے ساتھ کام کرنے کے برعکس ''عمر میں فرق کے باعث پیدا ہونے والے مسائل'' کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس نے ساٹھ سال سے زائد عمر کے یش اور تیس سال سے کم عمر کے ادتیا کے ساتھ بہترین طور پر کام کیا جس قسم کی فلمیں ''یش راج فلمز'' تیار کر رہا تھا ان کے لیے شاہ رخ خان کی ''بڑے اداکار کی حیثیت'' نہایت مناسب اور پراثر تھی۔ خوبصورت اور حسین افراد کے متعلق ان کی خوشگوار اور سادہ ترین کہانیاں جو دل کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں، شاہ رخ خان کی شخصیت کی دلکشی میں اضافے کا باعث بنیں۔ یش، ادتیا اور کرن نے شاہ رخ خان کو ایک خوش باش اور زندہ دل رومانی ''ہیرو'' کے طور پر دوبارہ اپنے انتخاب میں شامل کیا۔ انہوں نے شاہ رخ خان کے لیے ایک عالمی سطح کا تشخص تخلیق کیا جس نے امیتابھ بچن کے ''اینگری ینگ مین'' کی جگہ لے لی۔ ان کی قسمت کے ستارے اکٹھے چمکنے لگے اور ان کے فہیم اور ذمہ دار فیصلوں نے انہیں اس دہائی کا حکمران بنا دیا۔

''ڈر'' کے لیے شاہ رخ خان نے جو سب سے پہلا منظر عکس بند کروایا وہ ہیروئن کے گھر منعقد ہونے والی ایک تقریب میں چوری چھپے داخل ہونے پر مشتمل تھا۔ اس وقت تقریب میں

شامل مہمان ''ہولی'' کا تہوار منا رہے ہیں جس میں ایک دوسرے پر رنگ پھینکے جاتے ہیں۔ ہر شخص مکمل طور پر رنگوں میں غرق ہے لہٰذا کسی کی بھی پہچان ممکن نہیں۔ اس صورت حال کے باعث راہول کو موقع حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر ''کرن'' (ہیروئن) کے نزدیک جا پہنچے جب وہ کرن کو سنی کے ساتھ اس تہوار کی آڑ میں محبت کا کھیل رچاتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ ایک مجنونانہ طاقت سے ڈھول پیٹنا شروع کر دیتا ہے۔ ادتیا کو یقین اور اعتماد تھا کہ شاہ رخ خان یہ کردار ادا کرنے کا اہل ہے لیکن عامر کے انکار کے باعث وہ ابھی تک مایوسی اور پریشانی کا شکار تھا۔ عامر پہلے ہی سے ایک مقبول اداکار تھا لیکن جب ادتیا نے شاہ رخ خان کو ''ہولی'' کا منظر کرتے ہوئے دیکھا تو اس کا فیصلہ یہ تھا کہ شاہ رخ خان اس فلم کو بلندی پر لے جائے گا۔ اس نے کہا: ''مجھے معلوم تھا کہ اب مجھے عامر کی کمی محسوس نہیں ہوگی۔''

''ڈر'' اور ''بازیگر'' بیک وقت تیار کی گئیں۔ شاہ رخ خان کبھی ''نفسیاتی طور پر مضطرب عاشق'' کا کردار ادا کرتا اور کبھی ''خونیں انتقام'' پر آمادہ کردار ادا کرتا۔ یہ سب کچھ ہندی فلموں کی روایتی اقدار اور پیشہ وارانہ خودکشی کے عین مطابق تھا۔ اگر ناظرین اخلاقی طور پر گھٹیا اور کم تر کردار پسند نہ کرتے تو پھر شاہ رخ خان کا روشن مستقبل آغاز سے پہلے ہی دم توڑ دیتا لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے شاہ رخ خان کو یہ یقین کامل ہوتا گیا کہ ناظرین اسے پسند کریں گے۔ اسے خود پر مکمل اعتماد تھا کہ وہ یہ کام بخوبی انجام دے سکتا ہے۔

1993ء میں یہ دونوں فلمیں یکے بعد دیگرے نمائش پذیر ہوئیں۔ ناظرین کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ کس فلم کا ''ولن'' زیادہ مہیب، خطرناک اور ظالم ہے۔ بازیگر میں شاہ رخ کا کردار ''اجے'' اپنی خاتون دوست کو یہ کہتا ہے کہ چونکہ اس کا والد اس کی کسی دوسرے شخص کے ساتھ شادی پر مصر ہے لہٰذا ہم دونوں کو خودکشی کر لینی چاہیے جب یہ دونوں اپنی خودکشی کے متعلق ایک جیسا اطلاع نامہ تیار کر لیتے ہیں تو وہ ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ یہ تو صرف مذاق ہے پھر وہ اسے اٹھا کر چھجے پر بٹھا دیتا ہے وہ گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھ جاتا ہے اس سے معافی طلب کرتا ہے اور اسے چھت سے نیچے پھینک دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ خون میں لت پت اس کے بدن کے پاس سے نہایت اطمینان سے ٹہلتا ہوا گزرتا ہے اور اس کی طرف سے خودکشی کا اطلاع نامہ بھجواتا ہے۔ اگلے منظر میں وہ غم زدہ خاندان کو تسلی دیتا ہوا نظر آتا ہے۔

''ڈر'' میں شاہ رخ کا کردار ''راہول'' ایک طویل القامت عمارت کے چھجے پر چہل قدمی

کرتا ہوا ایک کھیل "وہ مجھ سے محبت کرتی ہے وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی" کھیلتا دکھایا جاتا ہے۔ بعد ازاں فلم میں وہ چاقو کے ذریعے اپنے سینے پر "کرن" کا نام کندہ کرتا ہے۔ سنیل اور کرن کے شادی کرنے کے بعد وہ ان کے نئے گھر کو بدشکل کر دیتا ہے۔ فلم کے آخر میں جب سنیل اس کی پٹائی کرتا ہے تو راہول اس کے پاؤں پکڑ لیتا ہے اور اس سے معافی طلب کرتا ہے پھر جب سنیل ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتا ہے تو راہول اس کے پیٹ میں خنجر گھونپ دیتا ہے پھر اس سے معافی طلب کرتا ہے اور پھر اس کی بیوی کو اغوا کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ ناقابل یقین حد تک یہ دونوں فلمیں انتہائی کامیاب ثابت ہوئیں۔

"بازیگر" تیار کرنے والے ادارے "وینس ریکارڈز اینڈ ٹیپس" نے اپنی اس فلم کے لیے گشتی افتتاحی نمائش کا اہتمام کیا۔ ادارے کا عملہ کئی سینما گھروں میں گیا، شائقین میں گھل مل گیا اور ان کا ردعمل معلوم کیا۔ قتل کے منظر کے دوران ناظرین سانس روکے ہوئے بالکل خاموش یہ منظر دیکھ رہے تھے لیکن شاہ رخ خان کا بہیمانہ ظلم بھی ناظرین کو اس سے دور نہ لے جا سکا بلکہ جب اس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اپنا انتقام لیا تو ناظرین نے اسے داد دی۔ ناظرین کے ساتھ شاہ رخ خان کے تعلق کے باعث فلم میں موجود اخلاقی کمتری زیادہ نمایاں نہ ہو سکی۔ شاہ رخ خان کے کہنے کے مطابق: "یہ ایسا ہی تھا کہ جیسے وہ "شعلے" کو گبر سنگھ کے نقطہ نظر کے مطابق دیکھ رہے ہیں۔" حتیٰ کہ جب شاہ رخ خان معصوم اور بے گناہ لوگوں کو قتل کرتا ہے تو پھر بھی ناظرین اس کی حمایت کرتے ہیں جب شاہ رخ خان نے فلم میں کوئی قتل کیا تو ناظرین نے تالیاں بجائیں۔ خاص طور پر ناظرین اس دوران بلند آواز سے سیٹیاں بجاتے جب وہ اپنے "تکیہ کلام" پر مشتمل یہ فقرہ ادا کرتا: "کبھی کبھی کچھ جیتنے کے لیے کچھ ہارنا پڑتا ہے اور ہار کے جیتنے والے کو بازیگر کہتے ہیں۔"

بازیگر کی نمائش کی اسی رات کو فلم کے مرکزی کردار اور عملہ ایک پرواز کے ذریعے لندن چلا گیا۔ شاہ رخ پہلی دفعہ کسی مغربی ملک گیا تھا۔ اس فلم کے لیے بیرون ملک تقسیم کار "ایروز انٹرنیشنل" نے تین دنوں میں چھ دفعہ یہ فلم دکھانے کا اہتمام کیا تھا۔ شاہ رخ خان اور گاوری ایک نہایت ہی پرتعیش ہوٹل میں ٹھہرے جہاں انہیں تین کمروں پر مشتمل ایک جدید اور پرآسائش "منزل" مہیا کی گئی۔ اس سے اگلی رات تین بجے ہندوستان سے آنے والے ایک فون نے شاہ رخ خان کو بیدار کر دیا۔ یہ فون کرن کے والد فلمساز لیش جوہر کا تھا جس نے شاہ

رخ خان کو اطلاع دی کہ "بازیگر" نہایت ہی بہترین فلم ثابت ہوئی۔

ایک ماہ بعد دسمبر میں یہی منظر، فلم "ڈر" کے لیے بھی دہرایا گیا۔ "ڈر" کے افتتاحی منظر کے باعث کئی بڑے اداکاروں نے کام کرنے سے اس لیے انکار کر دیا تھا کہ وہ پردہ سیمیں پر کسی اور اداکار کے ہاتھوں پٹتے نظر نہیں آنا چاہتے لیکن شاہ رخ خان جبلی طور پر یہ سمجھ چکا تھا کہ جس قدر زیادہ سنی اس کی پٹائی کرے گا، ناظرین اسی قدر اس کے ساتھ ہمدردی کریں گے۔ ادتیا کے کہنے کے مطابق "اس نے سنی کو اجازت دے دی کہ وہ اسے خون میں نہلا دے اور اس طرح وہ پوری فلم پر چھا گیا۔" کسی نے یہ شکایت کی کہ لیش اور ادتیا نے اس کے کردار کو تبدیل کر دیا اور فلم کا اختتام اس طرح نہیں ہوا جس طرح اسے بتایا گیا تھا۔ اس نے شاہ رخ خان پر الزام عائد کیا کہ اس نے ناظرین کے دل جیتنے کے لیے کہانی میں تبدیلی کی۔ لیش نے اس بات سے انکار کیا لیکن سنی نے پھر ان دونوں کے ساتھ کام نہیں کیا۔

"بازیگر" اور "ڈر" نے ان اصول و ضوابط کو تبدیل کر دیا جو ایک ہندی فلم کے ہیرو کے لیے برسوں سے متعین و مروج تھے۔ اب ہیرو کے لیے ضروری نہیں رہ گیا تھا کہ وہ محض مہذب اور شائستہ ہی ہو۔ امیتابھ بچن کا "اینگری ینگ مین" کا کردار روایتی اعتبار سے "ہیرو" کا کردار نہیں تھا لیکن اگر اس نے سپاہی، سمگلر، کوئلے کی کان کا مالک یا شرابی کا کردار بھی کیا تو اسے ہمیشہ عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اس کے ان کرداروں میں بھی ایک مخصوص قسم کی تہذیب اور شائستگی موجود تھی۔ امیتابھ بچن ایک ایسا واحد غیر فلمی شخص تھا جس نے تن تنہا اپنے درجنوں ہم عصر حریفوں، بدعنوان انتظامیہ اور ایک بے حس دنیا کا وقار اور شان کے ساتھ مقابلہ کیا۔ شاہ رخ خان نے ان کرداروں کو "قدیم طرز کی اقدار" کے مطابق بنا دیا۔ شاہ رخ خان کا کہنا تھا: "اب ہندی فلموں میں ہیرو کا کردار تبدیل ہو گیا ہے۔ اب وہ فلم میں مر بھی سکتا ہے اور اپنی محبوبہ سے ہاتھ بھی دھو سکتا ہے وہ لوگوں کو قتل بھی کر سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم اسے پسند کریں کیونکہ فلم کی کہانی کا تقاضا یہی ہے۔"

فروری 1994ء میں شاہ رخ خان کو "Filmfare" کے تین انعامات کے لیے نامزد کیا گیا۔ اگرچہ اس نے ان دو فلموں میں قاتل کا کردار ادا کیا تھا۔ فلم فیئر رسالے نے اس کی کارکردگی کو بلاحیل و حجت فلم "بازیگر" کے لیے "بہترین اداکار" کے عین مطابق پایا اور فلم "ڈر" میں ولن کے کردار کے لیے بھی اسے بہترین اداکار کی حیثیت سے نامزد کیا۔ "Filmfare Critics Award"

نے بھی اسے فلم ''کبھی ہاں کبھی ناں'' میں بہترین اداکار کے طور پر منتخب کیا۔ شاہ رخ خان نے عباس مستان کو بتایا کہ اگر ''فلم فیئر'' اسے محض ''بہترین ولن'' کے لیے نامزد کرتا تو وہ یہ انعام اٹھا کر باہر پھینک دیتا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ان دونوں انعامات کا مستحق ہے یا کم از کم بہترین اداکار کا انعام تو اسے لازمی طور پر ملنا چاہیے۔ تقسیم انعامات کی تقریب کئی گھنٹوں پر مشتمل تھی تقریب کے عروج پر شاہ رخ خان بہترین اداکار کی ٹرافی ہاتھ میں تھامے شائقین کے سامنے چہل قدمی کر رہا تھا۔ اسی طرح "Critics Award" میں بھی اس نے بہترین اداکار کی ٹرافی کے ساتھ شائقین کے سامنے چہل قدمی کی۔ تقریب کے دوران اور بعد میں شاہ رخ خان کو عباس مستان کہیں نظر نہ آئے۔ اب شاہ رخ خان نے محسوس کیا کہ وہ اپنے ان پہلے ''فلم فیئر'' انعامات کے ساتھ اس وقت تک اپنے گھر نہیں جا سکتا جب تک وہ ان افراد کو خراج تحسین نہ پیش کرے، جن کے باعث یہ سب کچھ ممکن ہوا لہٰذا اب اس نے معلوم کر لیا کہ اس کے ہدایتکار کہاں رہتے ہیں اور رات گہری ہونے کے باوجود شاہ رخ خان نے ان کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا۔

عباس مستان جنوبی ممبئی کے ایک نہایت ہی پسماندہ علاقے بنڈی بازار میں رہتے تھے حالانکہ ممبئی ایک ایسا علاقہ ہے جہاں ایک مربع میل میں تقریباً اٹھارہ ہزار افراد رہائش پذیر ہیں، بنڈی بازار اس سے بھی زیادہ گنجان آباد ہے۔ یہ ایک ایسی بستی ہے جہاں زیادہ تر محنت کش اور مزدور مسلمان گھرانے آباد ہیں۔ تنگ و تاریک، پانچ سے سات منزلہ عمارتیں ایک دوسری میں گھسی نظر آتی ہیں۔ زیادہ تر گھروں کو دہشت ناک سبز اور نیلا روغن کیا گیا ہے اور ٹیوب لائٹس سے بمشکل تمام ان میں روشنی ہوتی ہے۔ یہ دونوں بھائی ایک "Chawl" ایک کثیر المنزلہ عمارت میں رہائش پذیر تھے جہاں ایک ایک کمرے کے گھر ایک قطار میں بنے ہوئے تھے اور ہر راہداری کی اختتام پر سرکاری مشترکہ غسل خانے تھے۔ شاہ رخ خان کو یاد آیا کہ جب وہ اس عمارت میں داخل ہوا تو ایک کمرے میں کم از کم دس یا بارہ افراد سوئے ہوئے تھے۔ اس کی آمد اور شور کے باعث تقریباً ہر شخص بیدار ہو گیا تھا۔

شاہ رخ خان نے عباس مستان کو بتایا کہ وہ ان کی آشیرباد لیے بغیر اپنے گھر واپس نہیں جا سکتا تھا اور پھر شاہ رخ خان نے ان بھائیوں کے قدم چھوئے۔ وہ آپس میں گفتگو کرنے لگے، ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوئے اور اپنی کامیابی پر اظہار تفاخر کیا جب شاہ رخ خان

اپنے گھر کے لیے روانہ ہونے لگا تو سورج طلوع ہونے کو تھا لیکن اس عمارت میں زندگی پہلے ہی بیدار ہو چکی تھی...... یہ رمضان کا مہینہ تھا اور لوگ سحری کھانے کے لیے طلوع آفتاب سے پہلے ہی بیدار ہو گئے تھے۔ اس عمارت میں شاہ رخ خان کی موجودگی کی خبر جنگل کی آگ کے مانند پھیل چکی تھی اور جب وہ اس عمارت سے باہر نکلا تو وہ ہجوم میں گھرا ہوا تھا۔

''فلم فیئر'' کے آئندہ شمارے کو رسالے کی طرف سے دیے جانے والے انعامات اور جیتنے والوں کے انٹرویو کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ اپنے انٹرویو میں شاہ رخ خان نے علی الاعلان کہا تھا: ''میں نے پہلے ہی تین انعام حاصل کر لیے ہیں اور میرا ارادہ ہے کہ ہر سال میں ایک انعام مزید حاصل کروں اور کیوں نہیں؟ میں اس وقت پردہ سیمیں کا بہترین اداکار ہوں۔''

❁

خان، ادتیا اور اس کے چھوٹے بھائی ادے کے ساتھ منسلک ہو گیا تھا۔ ادے بھی اپنے بڑے
بھائی کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ وہ باہمی طور پر انوکھی اور عجیب وغریب کہانیاں تخلیق کرتے اور یہ منصوبہ
بندی کرتے کہ کس طرح لیش کو یہ کہانیاں استعمال کرنے کے لیے قائل کیا جائے۔ ''ڈر'' مکمل
ہونے کے بعد ادتیا ایک ایسی فلم کے متعلق سوچنے لگا جس کے لیے وہ ہدایتکاری کے فرائض بھی
خود ہی انجام دے سکے۔ اس نے شاہ رخ خان کے ساتھ ایک فلم ''اوزار'' کے بارے میں گفتگو
کی۔ شاہ رخ نے کہا کہ صوتی اعتبار سے ایک نہایت ہی خطرناک تاثر پیدا کرنے والے نام کی
فلم لازمی طور پر ''مار دھاڑ اور جرات وشجاعت'' قسم کی فلم ہوگی۔ بہرحال اس کے بجائے ادتیا
نے 1994ء میں شاہ رخ خان کے ساتھ مل کر ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' بنانے کا فیصلہ
کیا اور اسے مرکزی کردار ''راج'' کی پیشکش کی۔

اس فلم کی کہانی بہت ہی سادہ تھی اور جائے مقام لندن تھا۔ ہیرو راج ملہوترا انگلستان
میں مقیم ہندوستانیوں کی دوسری نسل سے تھا اور مال ودولت سے مالا مال تھا۔ اس کی پیدائش اور
پرورش لندن میں ہوئی تھی۔ وہ نہایت گستاخ اور ہنگامہ پرور نوجوان تھا جو مختلف لڑکیوں کے
ساتھ محبت کا جھوٹا کھیل کھیلنے کا عادی تھا لیکن باطنی طور پر وہ اپنے والدین کے مانند نہایت ہی
ایماندار اور خوش دل نوجوان تھا۔ ہیروئن جس کا نام سمرن تھا اور اس کی پرورش لندن میں متوسط
طبقے کے ہندوستانیوں کی بستی ساؤتھ ہال میں ہوئی تھی۔ اس میں بھی جذبہ اور ولولہ بدرجہ اتم
موجود تھا لیکن وہ انتہائی قدامت پسند تھی۔

راج کے والد کی داستان اس شخص کی داستان تھی جو جیب میں ایک قلیل رقم لیے انگلستان
آتا ہے اور پھر وہ دولت میں کھیلنے لگتا ہے۔ وہ بھٹنڈہ کے ایک سکول سے دسویں جماعت مکمل
کیے بغیر چلا جاتا ہے اور شدید محنت کے ذریعے لکھ پتی بن جاتا ہے۔ نئی وضع کی پتلون اور پرانے
وضع کے کوٹ میں وہ نہایت شاندار نظر آتا ہے۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جو مستقل طور پر ہشاش
بشاش اور زندہ دل ہے اور چاہتا ہے کہ اس کا واحد بیٹا دنیا کی ہر آسائش سے لطف اندوز ہو۔
لہٰذا راج ایک عالی شان گھر میں رہتا ہے اور ایک شاندار کار چلاتا ہے۔ جب راج اپنے
یونیورسٹی کے امتحان میں ناکام ہو جاتا ہے تو اس کا باپ اس کی سرزنش کرنے کے بجائے شمپین
کا فوارہ چھوڑتا ہے اور ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ اس نے تعلیمی میدان میں ناکام ہو کر خاندانی
روایت برقرار رکھی ہے۔ اس کے برعکس سمرن کا والد ایک نہایت ہی جفاکش، محنت کش اور

کفایت آمیز زندگی گزارنے کا عادی ہے جو اشیائے صرف کی ایک دکان کا مالک ہے۔ وہ
چاہتا ہے کہ اس کی دونوں بیٹیاں مغربی زہریلے ماحول سے پاک روایتی ہندوستانی ماحول میں
پرورش پائیں۔ لندن میں بائیس برس گزارنے کے بعد بھی وہ ہندوستانی لباس استعمال کرتا ہے
اپنی بیٹیوں کو عبادت میں باقاعدگی اختیار کرنے کی نصیحت کرتا ہے اور مغربی موسیقی اور تہذیب
پر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔

راج اور سمرن اپنے اپنے ساتھیوں اور دوستوں کے ساتھ تفریح کے لیے ایک ہی مقام پر
گئے ہوتے ہیں۔ ابتداء میں تو ان کے درمیان جھگڑا ہو جاتا ہے لیکن پھر ریل گاڑیاں چھوٹ
جانے اور کاروں کے انجن خراب ہو جانے کے باعث وہ ایک رات اکٹھے گزارنے پر مجبور ہو
جاتے ہیں۔ بلاشبہ وہ جنسی تعلق کا تصور بھی نہیں کرتے اور بالآخر ایک دوسرے کی محبت میں
گرفتار ہو جاتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ سمرن کی پہلے ہی سے منگنی ہو چکی ہوتی ہے۔ اس کے
باپ نے اپنی مرضی سے اس کی منگنی ہندوستان میں مقیم اپنے گہرے دوست کے بیٹے کے ساتھ
کر رکھی ہے۔ وہ جلد ہی ایک ایسے ملک روانہ ہو جائے گی جہاں وہ کبھی بھی نہیں گئی اور ایسے شخص
کے ساتھ شادی کرے گی جس سے وہ پہلے کبھی بھی نہیں ملی۔ سمرن اپنی قسمت پر شاکر ہے۔
جب راج اس کی ہونے والی شادی کے متعلق پوچھتا ہے تو وہ کہتی ہے: ''ہمارے یہاں تو ایسا
ہی ہوتا ہے!'' لیکن جب وہ راج کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے تو اپنے ہاتھوں محبت سے بنایا
ہوا مستقبل دھڑام سے گر جاتا ہے۔

جب سمرن کے باپ کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بیٹی نے خاندانی روایت کی خلاف ورزی
کی ہے تو وہ اپنے گھرانے کو واپس ہندوستان بھیج دیتا ہے۔ اسے راج کے وعدوں پر یقین
نہیں ہوتا جب سمرن ہندوستان میں اپنے آبائی پنجاب پہنچ جاتی ہے تو راج بھی اس کے پیچھے
پیچھے پنجاب آ جاتا ہے۔ جیسا کہ ہندوستانی فلموں میں حقیقت عنقا ہوتی ہے لہٰذا سمرن کا پتہ
معلوم نہ ہونے کے باوجود راج بغیر کسی کوشش کے اس کا گاؤں اور گھر تلاش کر لیتا ہے لیکن
ہندوستانی فلموں کی عرصہ دراز سے قائم روایت کے برعکس یہ دونوں محبت کرنے والے راہ فرار
اختیار نہیں کرتے۔ بہرحال سمرن اپنے خاندان کو چھوڑ کر اس کے ساتھ بھاگ جانے پر آمادہ
ہو جاتی ہے لیکن راج یہ کہتے ہوئے انکار کر دیتا ہے کہ ''یہ درست ہے کہ میں انگلستان میں پیدا
ہوا لیکن میں ہندوستانی ہوں میں تمہیں اپنی دلہن بنانے کے لیے یہاں آیا ہوں۔ میں تمہیں

صرف اس وقت لے کر جاؤں گا جب تمہارا باپ تمہاری میرے ساتھ شادی کر کے تمہارا ہاتھ مجھے تھما دے گا۔" راج ایک گمنام شخص کی حیثیت سے گاؤں میں رہنے لگتا ہے اور وہ سمرن کے گھرانے کے ہر فرد کے ساتھ محبت و پیار کا تعلق قائم کر لیتا ہے۔ بالآخر بے شمار آنسو اور تھوڑا بہت خون بہنے کے بعد راج سمرن کے باپ کا دل جیتا لیتا ہے۔ اس فلم کے ذریعے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ محبت و پیار کے پنپنے کے لیے خاندانی رضامندی لازمی ہوتی ہے اور والدین کو اپنے بچوں کی ایسی جگہ شادی کرنا چاہیے جہاں انہیں ایک دوسرے سے پیار بھی ہو...... پھر اس وقت ہی دل والے اپنی دلہن لے جا سکتے ہیں۔

ایک ہدایتکار کی حیثیت سے ادتیا کو اپنے باپ یش چوپڑا کا انداز ورثے میں ملا تھا۔ شدید جذباتی مناظر، پرتکلف اور شاندار نغمے اور سوئٹزرلینڈ کے خوبصورت اور دلکش مقامات پر فلمبندی اس کے فلمی ذوق کا لازمی حصہ تھے لیکن اس کے علاوہ وہ ایک نوجوان ہدایتکار سوراج بھارجاتیہ سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ سوراج ہندوستانی فلمی صنعت کے ہدایتکاروں کی تیسری نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے دادا تارچند بھارجاتیہ نے 1962ء میں "راج شری پروڈکشن" قائم کی تھی۔ اس کے تین بیٹوں اور کئی پوتوں نے بھی اسی کاروبار کو اپنایا تھا۔ ان کا تعلق ایک نہایت ہی قدامت پسند جین برادری سے تھا اور وہ ایک مشترکہ خاندان کے طور پر رہتے تھے اور انہوں نے بھی گوشت یا الکوحل کو ہاتھ تک نہ لگایا تھا۔ وہ اس قدر کٹر سبزی خور تھے کہ ان کی فلمیں اور ٹی وی کے سلسلے وار کھیلوں میں "انڈوں" کا نام ونشان تک نہیں ملتا تھا۔ ایک انحطاط پذیر اور دحشت ناک فلمی دنیا میں ان کا وجود خلاف معمول تھا۔

بھارجاتیہ کے فلمی دفتر میں فلمیں تیار کرنے کا اصول سیدھا سادا تھا۔ "ایک ایسی فلم کی تیاری جو ایک خاندان کے لیے ہو جس میں بھرپور موسیقی بھی ہو اور جس میں ہندوستانی جذبہ اور ولولہ موجود ہو۔" یش کے مانند راج شری نے بھی اپنی فلموں میں خاندانی اقدار کو فروغ دیا لیکن دولت مندی کا اظہار قدرے کم کیا۔ ان کی فلمیں زیادہ سے زیادہ گھریلو ہوتی تھیں۔ 1989ء میں یہ ادارہ ناکامیوں کا شکار ہو رہا تھا اور پھر اس وقت چوبیس سالہ سوراج نے اپنی پہلی فلم "میں نے پیار کیا" تیار کی۔ "میں نے پیار کیا" میں اس قدر پاکیزہ رومان دکھایا گیا تھا کہ جب لڑکا لڑکی کی زخمی پنڈلی پر دوا لگاتا ہے تو وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے کہ اسے لڑکی کی برہنہ پنڈلیاں نظر نہ آئیں۔ یہ فلم نہایت ہی کامیاب ثابت ہوئی۔ ادتیا کو یہ فلم اس قدر پسند آئی کہ اس نے یہ فلم

یکے بعد دیگرے دو دفعہ دیکھی۔ اس نے اپنے روزنامچے میں تحریر کیا: "ایک ایسی فلم جو ذہنوں کو تبدیل کر دیتی ہے، مکمل تفریح مہیا کرتی ہے اور کامیابی کی مکمل طور پر مستحق ہے۔"

"میں نے پیار کیا" کی کامیابی سوراج کی دوسری فلم "ہم آپ کے ہیں کون" کے لیے مشق ثابت ہوئی۔ تین گھنٹوں پر مشتمل اس فلم میں سوراج نے ہندوستانی رسومات کے مطابق دو شادیاں اور تجہیز و تکفین دکھائی اور ایک متحد و مشترک ہندوستانی گھرانے کو پیش کیا۔ اس فلم میں بے شمار کردار مثلاً سسرالی، دوست، چچیاں، ممانیاں، چچا، تایا، ملازمین حتیٰ کہ پالتو جانوروں کو بھی زندہ دل اور خوش باش دکھایا گیا تھا۔ اس فلم میں کہانی کا بنیادی ڈھانچہ بہت کمزور تھا، ڈرامائی اتار چڑھاؤ بھی بہت کم تھا، نیز کردار بھی یکسانیت کا شکار تھا۔ یہ فلم زیادہ تر خوشگوار اور مسرت انگیز بندھنوں پر مبنی مناظر اور چودہ نغموں پر مشتمل تھی۔ تنقید نگاروں نے اسے "شادی کی فلم" قرار دے کر اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی لیکن ناظرین نے اسے یوں اپنی داد و تحسین سے نوازا کہ یہ فلم حالیہ ہندوستانی فلمی صنعت کی تاریخ میں ایک بلند مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی اور کاروباری لحاظ سے بھی اس کی گرد کو کوئی اور فلم نہ چھو سکی۔ "ہم آپ کے ہیں کون" نے ایک اخلاقی اور اقداری نظام تخلیق کیا جس کی گونج بعد ازاں "دل والے دلہنیا لے جائیں گے" میں سنائی دی یعنی ایک مشترک خاندانی نظام قابل احترام و تعظیم ہے۔ یہ ایک سچے ہندوستانی کی بنیاد ہے۔ یہ اخلاقی اور اقداری نظام ہندوستانی تہذیب کو تقویت بخشتا ہے لہٰذا عظیم تر معاشرتی مفاد اور فائدے کے لیے انفرادی خواہش و مفاد قربان کر دینا چاہیے۔ "ہم آپ کے ہیں کون" اگست 1994ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی اس سے ایک ماہ پہلے ادتیا اس کی عکس بندی شروع کر چکا تھا۔ اس کے باعث اسے اپنی ذاتی کہانی پر یقین میں مزید اضافہ ہو گیا۔

بہر حال شاہ رخ خان ادتیا کے اس نقطہ نظر سے متفق نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا "یہ رومانی فلمیں مجھے آغاز ہی سے پسند نہیں ہیں، میں نہ تو سیر و تفریح کے لیے جانا چاہتا تھا اور نہ میں نے کالج جانا چاہا تھا۔" دیگر دو "خان" عامر اور سلمان نوعمر عاشقوں کے کردار نہایت کامیابی سے ادا کر رہے تھے اور شاہ رخ خان اپنے طور پر بہت ہی خوش تھا کہ وہ ان سے مختلف ہے۔ ایک منفی اور برے ہیرو کے طور پر اس نے ایک پرتشدد اور مار دھاڑ سے بھرپور فلم "انجام" میں بھی تیسری مرتبہ یہ کردار ادا کیا۔ یہ فلم ناکام ہو گئی لیکن اس نے اس فلم پر اپنی گرفت قائم رکھی۔ ذرائع ابلاغ

نے اسے ''پسندیدہ اور کامیاب ہیرو'' قرار دیا۔ ''مووی'' رسالے نے اپنی دسمبر 1994ء کی اشاعت کے سرورق پر شاہ رخ خان کی تصویر امیتابھ بچن کے ساتھ شائع کی اور یہ سرخی جمائی:

''ہندوستانی فلمی صنعت کا ولی عہد؟''

روایتی طور پر ہندوستانی فلموں کے ہیرو اپنی تلخ زندگی کا آغاز ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' میں دکھائے گئے رومانی انداز کے مطابق کرتے ہیں۔ فی زمانہ کامیابی کا نسخہ بہت ہی سادہ ہے: ''لڑکا لڑکی سے ملتا ہے، لڑکا لڑکی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے پھر لڑکے کو لڑکی مل جاتی ہے اور وہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے افق کی طرف چہل قدمی کرتے نظر آتے ہیں۔ کہانی کا تانا بانا ایسے بنا جاتا ہے کہ اداکار کو یہ موقع حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ خود کو بڑا اداکار ثابت کر سکے۔ وہ محبت کرتا ہے، رقص کرتا ہے، لڑائی مار کٹائی کرتا ہے اور موسیقی سے بھرپور مشہور گلوکاروں کے گائے ہوئے نغموں پر اپنے ہونٹ ہلاتا ہے۔ ہندوستانی فلموں کا انداز یہ بتاتا ہے کہ ایک نیا اداکار ناظرین کے دل صرف ایک رومانی فلم ہی کے ذریعے جیت سکتا ہے لیکن ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' سے پہلے شاہ رخ خان کی چودہ فلمیں نمائش کے لیے پیش کی جا چکی تھیں اور ان میں سے تین شعوری طور پر غیر رومانی تیار کی گئی تھیں اور ان میں ہیرو کا کردار بھی روایتی نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ادتیا اس کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔

ادتیا نے راج کو قدرے مکار کردار کے طور پر پیش کیا تھا۔ اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ خواتین ہندوستانی فلموں کے اکثر پاکباز اور نیک ہیرو کی نسبت ایک گستاخ اور شوخ و چنچل ہیرو پسند کریں گی۔ راج کو اس فلم میں ''ظالم'' کی حیثیت سے دکھایا گیا۔ فلم کے ایک ابتدائی مسودے میں ادتیا نے شاہ رخ خان کو کنڈوم (مانع حمل پلاسٹک کا غلاف) خریدتا دکھایا تھا مگر بعد میں ''بیئر'' (شراب) کو اس منظر میں شامل کر لیا گیا تاکہ ناظرین پر برا تاثر مرتب نہ ہو۔ راج نہایت بے تکلفی اور سنگدلی کے ساتھ لڑکیوں کے ساتھ جھوٹی محبت کا کھیل کھیلتا ہے اور وہ ایک بگڑے ہوئے رئیس زادے کا کردار ادا کرتا ہے۔ راج کی پاکبازی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب وہ اور سمرن اکٹھے رات بسر کرتے ہیں۔ سمرن ایک عادی شراب نوش کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔ جب وہ اگلی صبح بیدار ہوتی ہے تو راج اسے یقین دلاتا ہے کہ انہوں نے آپس میں ''پیار'' کیا ہے لیکن جب وہ سسکیاں لے کر رونا شروع کر دیتی ہے تو وہ اسے سچ سے آگاہ کر دیتا ہے۔ وہ اس کا کاندھا جھنجھوڑتا ہے اور کہتا ہے: ''میں بدکار نہیں ہوں سمرن، میں ایک

ہندوستانی ہوں اور مجھے علم ہے کہ ایک ہندوستانی خاتون کی حرمت سے کیا مراد ہے۔ میں تو خواب میں بھی ایسا کرنے کا کبھی نہیں سوچ سکتا!'' یہ منظر ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' کا تاثر ہی بدل دیتا ہے۔ ادتیا یہ سمجھتا تھا کہ شاہ رخ خان ''راج'' کا کردار کسی بھی اور اداکار کی نسبت بہتر ادا کر سکتا تھا کیونکہ وہ کردار ایک ایسے بہترین اور خوبصورت انداز میں ادا کرتا کہ اس اہم اور مشکل منظر میں کم از کم ایک لمحے کے لیے ہی ناظرین یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے کہ ماضی میں بدنام کردار ادا کرتے ہوئے شاہ رخ خان ''دلکشمن ریکھا'' کو عبور کر سکتا تھا اور قبل از شادی، جنسی تعلق میں مبتلا ہو سکتا تھا۔

تین ہفتوں کے دوران ادتیا نے شاہ رخ خان سے تین ملاقاتیں کیں اور اسے اس فلم میں کام کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ چوتھی ملاقات کے دوران ادتیا نے شاہ رخ خان کو بتایا کہ بلاشبہ وہ ایک بڑا اداکار ہے لیکن اس وقت تک عظیم اداکار نہیں بن سکتا جب تک وہ ہر لڑکی کے خوابوں کا شہزادہ، ہر بہن کا بھائی اور ہر ماں کا بیٹا نہیں بن جاتا اور پھر ادتیا کے مطابق: ''اس کے بعد سے تو شاہ رخ خان ایک رکشا ڈرائیور کا بھی ہیرو ہے۔'' جب شاہ رخ خان قدرے پس و پیش میں مبتلا ہوا تو ادتیا نے متبادلات پر غور کرنا شروع کر دیا تھا لیکن ایک دن محبوب سٹوڈیوز میں ''کرن ارجن'' کی فلمبندی کے دوران شاہ رخ خان نے ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' میں کام کرنے کے لیے اپنی آمادگی کا اظہار کر دیا لیکن ابھی بھی اسے اس فلم سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اسے کہانی کا یہ اختتام بہت پسند آیا کہ سخت دل باپ بالآخر سمرن کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہے اور اسے راج کے ساتھ گاؤں سے باہر جانے والی ریل گاڑی کے ذریعے اسے لے جانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ ایک رومانوی کردار کے طور پر فلمی دنیا کے ماہرین اس شک میں مبتلا تھے کہ کیا شاہ رخ خان یہ کردار بخوبی ادا کر سکے گا۔ شاہ رخ خان ''بازیگر'' کے فلمساز رتن جین کے ساتھ کار میں ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' کے افتتاح کے موقع پر سینما گھر گیا تو رتن جین شاہ رخ سے کہنے لگا ''اگر تم برا نہ مانو تو میرا یہ خیال ہے کہ یہ فلم کامیاب نہیں ہو گی۔ لوگ تمہیں ''رومانی ہیرو'' کے طور پر قبول نہیں کریں گے۔''

فلمی دنیا کے متعلق ولیم گولڈ مین کا ایک مشہور قول ہے: ''کسی کو بھی معلوم نہیں کہ آئندہ کیا ہو گا۔'' ناظرین نے جب غیر متوقع طور پر شاہ رخ خان کے منفی کردار کو پسند کیا تھا، اب انہوں نے شاہ رخ کو رومانوی کردار میں بھی بے حد پسند کیا۔ ممبئی کے سینما گھروں میں پہلے ہفتے کے

دوران افتتاحی نمائش کے دوران کوئی بھی نشست خالی نہیں تھی۔ فلم کے تقسیم کنندگان نے ملک بھر سے اطلاع دی کہ ٹکٹوں سے حاصل ہونے والی رقم ماضی کی کسی بھی فلم سے زیادہ ہے۔ تنقید نگاروں نے بھی فلم کی تعریف کی۔ ''ٹائمز آف انڈیا'' کے تنقید نگار خالد محمود نے لکھا: ''بھاری رقم سے تیار شدہ فلموں کا دور آچکا ہے۔'' ایک ہفتہ وار جریدے ''سکرین'' نے اس فلم پر تبصرہ کرتے ہوئے یوں سرخی جمائی: ''ایک نوجوان ''ماسٹر'' کی آمد۔''

''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' ہندوستانی فلمی صنعت کی ایک ایسی فلم ثابت ہوئی جس نے فلمی دنیا میں تہلکہ مچا دیا اور اس کی نمائش غیر معینہ عرصہ تک جاری رہی۔ یہ فلم بذات خود اپنے لیے زندگی ثابت ہوئی اور بڑی سکرین پر اس کی نمائش کے دورانیے کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ یہ فلم قدم بہ قدم، دن بہ دن ایک سنگ میل پر پہنچتی رہی...... پانچ سال، 300 ہفتے، دس سال...... ذرائع ابلاغ کا ایک طوفان مراٹھا مندر سینما پر ٹوٹ پڑا تھا جہاں اس فلم کی نمائش ہو رہی تھی لیکن یہ فلم ایسے پرواز کر رہی تھی جیسے ایک طیارہ خودکار طریقے پر اڑا جا رہا ہو۔ یہ فلم تشہیر سے بے نیاز تھی۔ آئندہ سالوں میں شاہ رخ خان کی کئی فلمیں انتہائی کامیاب ثابت ہوئیں اور اس کے دو بچے بھی پیدا ہوئے۔ ادتیا نے شادی کی اور پھر طلاق بھی ہو گئی، اس نے ایک فلم سٹوڈیو قائم کر لیا، فلم کی ہیروئن کاجل نے بھی شادی کر لی اس کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی پھر اس نے تین سال کے لیے فلمی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کی پھر دوبارہ فلمی دنیا میں لوٹ آئی۔ یہ سب واقعات پیش آتے رہے اور ساتھ ساتھ ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' کی نمائش بھی بدستور جاری رہی۔

اس فلم کے ذریعے ہیرو کا ایک نیا نقش مرتب ہوا۔ امیتابھ بچن کا ''اینگری ینگ مین'' ''وجے'' کہیں دفن ہو گیا اور پھر کہیں نظر نہ آیا اور اس کی جگہ راج نے لے لی۔ راج سماج مخالف باغی نہیں تھا۔ وہ ایسا بہادر اور دلیر انسان تھا جو اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے ''مروجہ نظام'' سے جنگ کرتا ہے۔ وہ عالمی سطح کا ایک ایسا بردبار ہندوستانی تھا جو پیرس کے ایک شبینہ کلب یا پنجاب کے ایک گاؤں میں یکساں راحت اور سکون محسوس کرتا ہے۔ راج ایک نئی روایت کا نقیب بھی تھا اور قدیم روایت کا پاسدار بھی تھا اور حالات کے مطابق وہ جدت پسند یا قدامت پسند بن سکتا تھا۔ وہ اصولوں کے مطابق عمل بھی کرتا تھا اور بوقت ضرورت انہیں توڑ مروڑ بھی دیتا تھا۔

وجے کے برعکس راج زندگی سے ماورا نہیں تھا۔ اڈتیا کے کہنے کے مطابق ''وہ بذات خود زندگی تھا۔'' اب ہیرو پرستی کا زمانہ گزر چکا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جسے حقیقت کی نظر سے دیکھنا ضروری تھا۔ وجے کے ہیرو کے کردار میں ''ڈرامائی مکالمہ بازی'' بنیادی عنصر تھا، دہائیاں گزرنے کے بعد بھی ناظرین فلم ''شعلے'' اور ''دیوار'' میں امیتابھ بچن کے اثرانگیز مکالمے یاد کرتے ہیں لیکن راج نے روزمرہ کی سلیس زبان استعمال کی۔ اگرچہ اس نے تن تنہا کئی بدمعاشوں کی پٹائی کی لیکن اسے ''بدمعاش'' نہیں سمجھا گیا۔ ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' میں راج گھر کی خاتون کے ساتھ باورچی خانے میں بیٹھ کر سبزیاں چھیلتا ہے جب سمرن ''کرواچوتھ'' ادا کرتی ہے (شمالی ہندوستانی کی ایک رسم جس کے مطابق ہندوستانی خواتین اپنے خاوند کی صحت اور تندرستی کے لیے دن بھر فاقہ کرتی ہیں) تو راج بھی اس کے ساتھ بھوکا رہتا ہے۔ ان رسوم میں اس کی شرکت اور روایتی نسوانی رہائشی مقامات پر سکون اور راحت کے احساس کے باعث راج ماضی کے ''مردانہ'' ہیرو سے مختلف نظر آتا ہے۔ وہ ایک احساس، منکسر المزاج انسان ہے جو چیخنے چلانے اور رونے سے نہیں گھبراتا لیکن اس میں اس قدر صلاحیت اور فہم بھی موجود ہے کہ وہ فلم میں مکار اور عیار افراد کو اپنی دانش اور فراست کے ذریعے شکست دے سکے۔ مثلاً سمرن کا والد اور اس کا گنوار منگیتر۔ راج ایک بہت ہی مختلف اور نیا ہندوستانی شخص تھا۔

''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' تیار کرتے ہوئے ادتیا نے شاہ رخ خان کو ہدایت کی کہ وہ اپنا نقاب اتار دے۔ ''بازیگر'' اور ''ڈر'' کے برعکس اس فلم میں خون، خون ریزی، بے تحاشا تشدد اور مار دھاڑ نہیں تھی جس کے باعث شاہ رخ خان کو نقاب کے استعمال کی بھی ضرورت نہیں تھی اور اڈتیا کی خواہش تھی کہ شاہ رخ خان اپنا اصلی چہرہ ناظرین کے سامنے پیش کر دے۔ راج عقلمند اور گستاخ ضرور تھا لیکن وہ حساس اور تفکر آموز بھی تھا جو ادتیا اور شاہ رخ خان کے نقطہ نظر کو تقویت بخشتا تھا۔ ادتیا کے مطابق راج برا آدمی ضرور تھا لیکن باطنی اور جبلی طور پر وہ ایک نیک اور اچھا آدمی تھا۔ اپنی بنیادیں پشاور میں رکھنے کے باوجود شاہ رخ خان نے اپنی ''مردانہ طاقت'' کو فروغ نہیں دیا۔ اس نے ''سی۔ گینگ'' کے اپنے دوستوں کو چھوڑ کر خواتین کی صحبت کو ترجیح دی۔ حتیٰ کہ اس کے بعد جو مرد دوست اپنی زندگی میں بنائے، وہ بھی زیادہ تر ''مردانہ طاقت'' کے حامل نہیں تھے (شاید یہی وجہ ہے کہ جب شاہ رخ خان فلمی دنیا سے

مسلک ہوا تو پھر اس کے ''ہم جنس پرست'' ہونے کی افواہ نے اسے بہت پریشان کیا تھا)۔ شاہ رخ خان کو یہ فخر تھا کہ اس نے اپنے نسوانی پہلو کو پوشیدہ نہیں رکھا۔ اس نے اپنی ذات کو ان الفاظ میں بیان کیا: ''ایک پٹھان جو رو بھی سکتا ہے۔''

ادتیا کے الفاظ میں ''شاہ رخ اپنی کارکردگی کے لحاظ سے انتہائی ایماندار تھا۔ اگرچہ اس سے قبل امیتابھ بچن نے بھی اسی جذبے کا اظہار کیا تھا پھر بھی شائقین امیتابھ اور وجے کو ایک ہی شخصیت نہیں سمجھتے تھے۔ ''وجے'' کا کردار محنت کش، ہیجان آمیز اور ظالمانہ قسم کا تھا لیکن ذاتی طور پر امیتابھ انتہائی مہذب اور نفیس شخص تھا لیکن شاہ رخ خان کے لحاظ سے اداکار اور اس کے کردار کے درمیان فاصلہ معدوم ہو چکا تھا۔ ناظرین سمجھتے تھے کہ شاہ رخ خان راج تھا۔ ادتیا کے الفاظ کے مطابق: ''شاہ رخ ہر لڑکی کے خوابوں کا شہزادہ، ہر بہن کا بھائی اور ہر ماں کا بیٹا بن چکا تھا۔'' مختصر یہ کہ وہ اب نہایت ہی کامیاب اور عظیم اداکار بن چکا تھا۔

جس طرح ''وجے'' کا کردار 1970ء کی دہائی کے ہندوستان کا استعارہ تھا۔ اسی طرح ''راج'' کا کردار 1990ء کی دہائی پر مشتمل آزاد خیال ہندوستانیوں کی خواہشات کا مظہر تھا۔ شاہ رخ خان ملک کے سماجی ڈھانچے میں ترقی اور روشن خیالی کے متعلق عوام کی اجتماعی سوچ اور خواہشات کا مجسم اظہار تھا۔ یہ دہائی اس قوم کی تاریخ میں مشکل ترین اور غیر یقینی دور تھا۔ روشن خیالی اور اعتدال پسندی کے باعث معاشی نمونے ہندوستان کے شہری علاقوں میں ترقی کی ایک نئی لہر پیدا کر دی تھی۔ ان اصلاحات کے باعث رجائیت اور اعتماد کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ تقریباً پچاس برس تک معاشی ترقی سے محروم رہنے کے بعد ایک آزاد ملک نے دنیا کے ساتھ قدم ملانے کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی اور سب سے پہلے تو ٹیلی ویژن کے ذریعے عوام نے بیرونی دنیا کی جگمگاہٹ کا نظارہ کرنا شروع کر دیا۔ عوام کے طرز زندگی، رویوں اور سماجی اقدار میں یکسر تبدیل واقع ہو گئی۔ ''یہ دل مانگے اور'' یہ پیپسی کولا کے ایک تجارتی اشتہار کا ابتدائی فقرہ تھا جو 15 اگست 1990ء کو پیش ہوا اور جلد ہی یہ فقرہ جدید ہندوستان میں ایسا مقبول ہوا کہ ہندوستانیوں کے دلوں کی خواہش کی حیثیت اختیار کر گیا۔ متوسط طبقے کے ہندوستانیوں میں بہت جلد ایک خوشحال زندگی کی تمنا انگڑائیاں لینے لگی اور ملک کی ترقی پذیر معیشت نے انہیں کم از کم اپنے کچھ خواب حقیقت میں ڈھالنے کا موقع فراہم کر دیا۔ گزشتہ دور کے متوسط طبقے کے افراد کی نسبت نیا متوسط طبقہ دولت کو اپنے لیے باعث شرم یا رکاوٹ محسوس نہیں کرتا تھا۔ 1990ء

کی دہائی میں دولت مندی کا رجحان ایک واحد اصول کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ وال سٹریٹ کے گورڈن گیکو نے نہایت درست طور پر ''لالچ/طمع'' کے حق میں آواز بلند کی تھی۔

لیکن حسب دستور مغرب سے سیلاب کے مانند آنے والی اشیاء اور نظریات کے ساتھ ہندوستان میں ایک نیا اخلاقی معیار بھی ترویج پانے لگا۔ اب جنسی مناظر ہر جگہ نظر آنے لگے تھے۔ بڑے بڑے اخبارات اور رسائل نیم برہنہ خواتین کی تصاویر چھاپنے لگے جبکہ ٹیلیویژن پر متوسط طبقہ زنا کاری، آبروریزی، ہم جنس پرستی اور قبل از شادی جنسی تعلق کے متعلق بلاتکلف گفتگو کرنے لگا۔ مختلف جائزوں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے یہ معلوم ہوا کہ اب ہندوستان کا نوعمر طبقہ جنسی تعلق کی حقیقت سے آشنا ہونے کے لیے شادی کے تکلف کا انتظار نہیں کرتا۔ ذرائع ابلاغ ''جنسی مناظر'' کی تشہیر اور فروغ میں مصروف ہو گئے اور انہوں نے ہندوستان کے شہری علاقوں کی ایک تہذیبی روایت "amrit manthan" کو سرتوڑ کوشش کے ذریعے رواج دینا شروع کر دیا۔ اخبارات و رسائل نے رنگین خاص شمارے نکالنے شروع کر دیے جن میں جدید انداز کی تقریبات کے علاوہ جدید انداز کے لباس اور آرائش حسن کے نت نئے انداز و اطوار کو نمایاں طور پر جگہ دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ دولت مند افراد کے رنگین شب و روز کا ذکر بھی نہایت صراحت کے ساتھ موجود ہوتا تھا۔ اسی طرح دولت مند اور مشہور افراد کے پرستار ان قومی اخبارات کے مخصوص صفحات کا نہایت شوق سے مطالعہ کرتے تھے اور اس طرح اخبارات میں ''صفحہ نمبر تین'' نے جنم لیا (ٹائمز آف انڈیا دولت مند اور مشہور افراد کے متعلق جھوٹی سچی کہانیاں اور تصاویر اپنے تیسرے صفحے پر شائع کیا کرتا)۔ جو اخبار یا رسالہ اپنے قارئین کے لیے زیادہ سے زیادہ اس قسم کی چٹپٹی کہانیاں اور خبریں شائع کرتا وہ فروخت کے لحاظ سے سرفہرست ہوتا۔

ان گمراہ کن اور سحر انگیز معیارات نے تمام اقدار اور اصول و ضوابط کو یکسر تبدیل کر دیا۔ شہروں میں نوعمر بچے مغربی تہذیب اپنانے لگے اور ایک ایسی زبان بولنے لگے جو ان کے والدین کے لیے ناقابل فہم تھی۔ اب ہندوستانی گھرانے بھی مختلف مسائل کا شکار ہونے لگے تھے کیونکہ خواتین بھی مردوں کے مانند ملازمت کر کے دولت حاصل کرنے کی شائق ہو گئی تھیں، مزید براں روایتی اقدار انہیں بیزار کن نظر آنے لگی تھیں اور ان کے دلوں میں ''خود مختاری'' کی خواہش کی چنگاری سلگنے لگی تھی۔ قدیم خاندانی و معاشرتی نظام استحکام کا باعث تھا لیکن نیا نظام

دلفریب اور باعث تحریص تھا۔ نئی نئی آزادیوں اور خود مختاریوں کے باعث ہندوستانی لوگ نئی الجھنوں اور پریشانیوں کا شکار ہونے لگے۔ ایک عالمگیر معاشرے اور معیشت کے سیلاب کے باعث ایک ہندوستانی فرد کا نیا مفہوم اور تصور سامنے آنے لگا تھا۔

ایک طرف تو لوگ اس عالمگیریت کے رنگ میں رنگے جا رہے تھے اور دوسری طرف بالکل متوازی طور پر کچھ لوگ قدیم معاشرتی نظام اور خاندانی اقدار کی راحتوں اور مسرتوں میں پناہ ڈھونڈ رہے تھے۔ انہی حالات کے تحت ہندوستانی سیاست میں ''دائیں بازو'' نے سر نکالا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی قائم کی گئی۔ بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) نے ہندوستانی تہذیب کو ایک نہایت ہی تنگ نظر مفہوم عطا کیا۔ کیا چیز ہندوستانی ہے اور کیا چیز ہندوستانی نہیں ہے اس کے متعلق ذرائع ابلاغ میں بحث و مباحثہ کا آغاز ہو گیا، بعض اوقات یہ بحث و مباحثہ گلی کوچوں میں جارحانہ انداز میں بھی منعقد کیا گیا اور اس بحث و مباحثے نے سیاسی مفادات اور سرکاری حکمت عملیوں کو بھی متاثر کیا۔ اسی لیے ممبئی میں بی جے پی کی اتحادی جماعت شیو سینا ہر سال ''ویلنٹائن ڈے'' کو ہندوستانی اخلاقیات اور تہذیب کے ''خلاف'' قرار دیتی اور ''ویلنٹائن ڈے'' کارڈز کے علاوہ ان کارڈوں کو فروخت کرنے والی دکانوں کو جلا کر ''عشق معاشقے'' کے کاروبار کو منتشر کر دیتی۔ 1998ء میں ہندو قوم پرستوں نے اپنے غیض و غضب کا اظہار "Fire" کی شکل میں کیا۔ ہدایتکارہ دیپا مہتا کی یہ فلم دہلی کے مضافات میں رہائش پذیر متوسط طبقے کی تنہا اور عدم توجہ کی شکار دو ''سالیوں'' کے متعلق تھی جو ایک دوسرے میں اپنے لیے محبت و پیار اور جنسی لذت کی متلاشی تھیں۔ ممبئی کے جن سینما گھروں میں یہ فلم دکھائی جا رہی تھی وہاں عوام کا سیلاب ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ شیو سینا کے شعبہ خواتین کی ایک رہنما مینا کمبلی نے ذرائع ابلاغ کو بتایا کہ "Fire" جیسی فلموں کے ہندو تہذیب پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں خواتین کی اکثریت ''خواتین ہم جنس پرستی'' جیسی چیزوں کے متعلق قطعی ناآشنا ہے ہم انہیں اس قسم کی چیزیں کیوں بتائیں؟'' بہرحال یہ تہذیبی معمول اس دہائی میں بھی نہایت شدومد کے ساتھ جاری رہا۔

ہندوستان کی معاشی ترقی اور اس ملک کے خوشحال اور چمکتے دمکتے چہرے کو فرقہ وارانہ تشدد اور دہشت گردی نے داغدار کر دیا۔ دسمبر 1992ء اور جنوری 1993ء میں ممبئی میں ہونے والے فسادات اور دو ماہ بعد برپا ہونے والے دہشت ناک بم دھماکوں کے سلسلوں نے

ہندوستان کے سب سے بڑے تہذیبی شہر ممبئی اور بذات خود ہندوستان کے اخلاقی و تہذیبی اقدار و معیارات کو تبدیل کر دیا۔ ان پیچیدہ حالات میں ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' نے ایک آسان حل پیش کر دیا: متوازن اور معتدل معاشرہ۔ لباس اور خوراک کے مانند اس فلم نے متوازن اور معتدل طرز زندگی کی تبلیغ کی۔ راج کے کردار میں شاہ رخ خان جتنا اچھا مشرقی تھا، اس قدر اچھا مغربی بھی تھا۔ وہ ہر فرد کی پسند بن گیا۔ وہ ایک ایسا خوش باش، زندہ دل اور شوخ و چنچل ہیرو بن گیا جس کے بھڑکیلے لباس اور طرز زندگی نے اسے نوجوانوں کے لیے ایک مثالی کردار بنا دیا لیکن اس نے بغیر ہچکچاہٹ اور شرم کے گھریلو اقدار کو اپنایا اور رواج دیا۔ وہ اخلاقی اقدار کا پاسدار تو تھا لیکن انتہائی پاکباز بھی نہیں تھا۔ لاکھوں ہندوستانی شہریوں کے مانند اس نے روایتی اور جدیدیت کے درمیان توازن قائم رکھا لیکن ایک حقیقی جدوجہد کرنے والے انسان کے برعکس راج کو درپیش رکاوٹیں اور مشکلات بغیر کسی دل کے دورے یا ناجائز جنسی تعلق کے خوبصورتی کے ساتھ دور ہوتی گئیں۔ ادتیا نے جو جنت ارضی تخلیق کی تھی اس میں گزشتہ و موجودہ امیر و غریب، شہری و دیہاتی، بیرونی و مقامی ہندوستانی نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ اکٹھے زندہ رہ سکتے تھے اور ایک دوسرے کے لیے تقویت کا باعث بن سکتے تھے۔

امیتابھ بچن اور وجے کے مانند شاہ رخ اور راج ایک دوسرے کے بالکل مطابق تھے۔ اس ضمن میں ایک دفعہ ادتیا نے کہا: ''سب سے اہم بات یہ ہے کہ شاہ رخ خان ہر ایک فرد کو خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زیادہ تر اداکار آپ کو خوش تو کرتے ہیں لیکن وہ چاہتے ہیں کہ آپ ان کی اداکاری کے باعث انہیں بھی پسند کریں۔ ایک بڑے اداکار کی حیثیت سے شاہ رخ خان اس خواہش سے بے نیاز تھا۔ وہ اپنی اداکاری کے ذریعے نہایت ہی انوکھے انداز میں آپ کو خود سے محبت کرنے پر اکساتا ہے۔ اپنے والدین سے محرومی کے باعث اسے سخت محنت و جدوجہد کرنا پڑی ہے۔ وہ اب اس کے پاس موجود نہیں ہیں اور وہ ان کے نقصان کو بھلانے اور ان کا متبادل تلاش کرنے کے لیے اس دنیا (فلمی دنیا) میں ڈوب جانا چاہتا ہے۔''

''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' کے دو سال بعد یش چوپڑا نے شاہ رخ خان کو اپنی ہدایتکاری میں تیار ہونے والی فلم ''دل تو پاگل ہے'' میں اداکاری کے لیے منتخب کیا۔ ''ہم آپ کے ہیں کون'' کے مانند یہ فلم بھی باقاعدہ کہانی سے محروم تھی۔ یہ فلم یش چوپڑا کے مخصوص رومانی انداز کے عین مطابق تھی۔ فلم میں یہ اہم سبق دیا گیا تھا کہ انسان کی زندگی کا مقصد محبت و پیار

ہے۔ ہر انسان ایک جوڑے کی شکل میں پیدا ہوتا ہے۔ مشہور کہاوت ہے کہ ''جوڑے آسمان پر بنتے ہیں'' اور خدا نے پہلے ہی سے یہ فیصلہ کر لیا ہوتا ہے کہ کون کس کا شریک حیات بنے گا، اب محض سوال اس شریک حیات کی تلاش کا ہے۔ اس حوالے سے آفاقی اصول یہ ہے کہ ''کسی بھی جگہ کوئی بھی شخص آپ کے لیے بنایا گیا ہے!'' اس لیے تقریباً نصف فلم تک ہیرو اور ہیروئن آپس میں ملاقات کیے بغیر ایک دوسرے سے گفتگو کر سکتے ہیں، ایک دوسرے کا تصور کر سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے آس پاس آتے جاتے بھی ہیں۔ جذباتی صورتحال اس لیے مزید پیچیدہ ہو جاتی ہے کیونکہ ہیرو کی بہترین دوست بھی ہیرو سے پیار کرتی ہے۔ ہیروئن مادھوری ڈکشٹ، سفید شیفون کی ساڑھی پہنے وسیع میدانوں میں اچھلتی کودتی ہے جبکہ ہیرو کی بہترین دوست کرشمہ کپور تنگ لباس میں ادھر ادھر پھدکتی ہے۔ یہ فلم رومانوی چکاچوند سے بھرپور ہے جو بہترین اور ہیجان خیز مغربی موسیقی سے مزین ہے۔

اس فلم میں شاہ رخ خان نے راہول کا کردار ادا کیا جو راج سے کہیں زیادہ شوخ و چنچل ہے۔ راہول ایک زندہ دل اور خوش باش فلمی ہدایتکار ہے جو ممبئی میں رہتا ہے لیکن اس کا شاندار وسیع گھر ایسا ہے جسے ''مین ہٹن'' سے درآمد کیا گیا ہے۔ گھر کی دیواریں حسین مناظر سے مصور کی گئی ہیں۔ پہلے پہل تو راہول نہایت خبطی پن کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن آہستہ آہستہ اس کے دل میں محبت پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے اسے یقین ہو جاتا ہے کہ بلاشبہ اس دنیا میں اس کا شریک حیات موجود ہے۔ ''دل تو پاگل ہے'' کی کہانی میں گہرائی تو کم ہے لیکن اس کے باعث اس کی بہترین کامیابی کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں آتی۔ 1990ء کی دہائی میں شاہ رخ خان فلمی دنیا کی چمک دمک اور روشن چہرے کا اشتہار بن گیا تھا۔ ''دل تو پاگل ہے'' کے ایک سال بعد فلمی دنیا میں ایک نئے رجحان کے حامل لیکن روایتی ''فارمولے'' کو مزید نکھارا گیا اور اس میں مزید ''مرچ مصالحہ'' ڈال کر ''کچھ کچھ ہوتا ہے'' تیار کی گئی جو کرن جوہر کی پہلی فلم تھی۔

✿

بارہواں باب

عالمی شاہکار شخصیت

شاہ رخ خان کی عالمی شاہکار شخصیت کی تشکیل کے ضمن میں کرن جوہر کا کردار بہت اہم تھا۔ ہندوستانی فلمی صنعت کے لیے مغربی فلمیں بہت حد تک ایک ''معیار'' کی حیثیت سے موجود تھیں لیکن ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' اور ''کچھ کچھ ہوتا ہے'' کے بعد مغرب ہندوستانی فلموں کے لیے منڈی اور ''کہانی کے خاکے'' کی حیثیت اختیار کر گیا۔ انگلستان اور امریکہ میں وسیع پیمانے پر ہندی فلموں کی نمائش ہونے لگی اور ان ناظرین کے لیے بھی یہ فلمیں اہم حیثیت کے حامل ہو گئیں جو انہیں دیکھنے کے لیے کثیر تعداد میں ڈالر اور پاؤنڈ ادا کرتے تھے۔ نئی ہزاروی کے آغاز تک ہندی فلمیں ایسے ہی نیویارک میں دکھائی جانے لگیں جیسے دہلی میں دکھائی جاتی تھیں۔

جوں جوں ہندی فلمیں غیر ملکی منڈیوں میں مقبول ہونے لگیں اور ان کی مانگ بڑھنے لگی تو پھر زیرک اور ہوشیار ہدایتکاروں نے بیرونی ممالک کے ماحول کے مطابق فلمیں تیار کرنا شروع کر دیں۔ یہ فلمیں بڑے اور نامور اداکاروں/اداکاراؤں، شاندار عکس بندی، رومانوی کہانی اور کم از کم مار دھاڑ پر مشتمل تھی۔ تشدد اور خون ریزی کو الگ کر کے گھریلو اقدار کو فروغ دیا جانے لگا۔ کرن جوہر کے مطابق: ''بیرون ملک مقیم ہندوستانی ایک ایسی عظیم اور خوشگوار فلم دیکھنے کے خواہش مند تھے جس میں خوبصورت چہرے، چمکیلے اور بھڑکیلے لباس، مہذب اور شائستہ مکالمے موجود ہوں اور یہ فلمیں ان کے بچوں کو اعلیٰ اخلاقی اقدار سکھائیں۔ شاہ رخ خان کی فلمیں عین اسی معیار کے مطابق تھیں۔ عجیب بات ہے کہ ''دل سے'' (1998) ہندوستان میں قطعی طور پر ناکام رہی لیکن یہ پہلی ہندوستانی فلم ثابت ہوئی جو انگلستان میں صف اول کی دس فلموں میں ساتویں درجے پر ہیں۔ 2003ء میں نیلسن کے ایک جائزے کے مطابق انگلستان میں 1989ء کے بعد زیر نمائش دس صف اول کی ہندی فلموں میں سے سات میں شاہ رخ خان

نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔

دنیا بھر میں موجود مختلف پس منظر کے حامل بیس ملین ہندوستانیوں کے لیے ہندوستانی فلموں کا مقصد کچھ ہو نہ ہو لیکن وہ ان کے لیے ہمیشہ تفریح کا سامان ضرور مہیا کرتی رہیں۔ یہ فلمیں ان کا اپنے ہم وطنوں کے ساتھ بندھن، دور افتادہ اپنے مادر وطن کے ساتھ جذباتی رشتے کا ایک مفید ذریعہ تھیں اور وہ نہایت سستے داموں اپنے ان بچوں کو ہندوستانی تہذیب وتمدن سے آشنا کر سکتے تھے جو مغربی تہذیب کی چکا چوند میں پرورش پا رہے تھے۔ 1970ء کی دہائی میں لندن کے مقام پر زیر نمائش ایک ہندوستانی فلم ایک معاشرتی تقریب کی حیثیت اختیار کر گئی تھی جہاں خواتین اپنی ریشمی ساڑھیوں کی نمائش کر سکتی تھیں اور 24 قیراط وزنی سونے کے زیورات کی چمک سے دوسروں کی آنکھیں خیرہ کر سکتی تھیں جس طرح فلم بہت ہی کامیاب طور پر دکھائی جا رہی تھی اسی طرح فلم کے وقفے کے دوران سموسوں اور چائے کے ساتھ ناظرین کی دعوت بھی لازمی تھی۔ 1980ء کی دہائی میں مقامی اور بیرونی طور پر ویڈیو اور کیبل کے باعث فلموں کی طرف عوام کا رجحان کم ہو گیا تھا اب بیرونی ممالک میں مقیم ہندوستانی سینما گھر جانے کے بجائے تازہ ترین ہندوستانی فلمیں گھر میں یا سڑک کی نکر پر واقع ہندوستانی ''جنرل سٹور'' میں دیکھ لیتے تھے جسے ''ویڈیو سٹوڈیو'' کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود بیرون ملک مقیم ہندوستانی نہایت جذبے اور ارادے کے ساتھ ہندوستانی فلمیں دیکھتے تھے اور اس طرح وہ خود کو اپنے وطن میں موجود پاتے تھے۔

ہندی فلموں نے ہمیشہ ہی روایتی طور پر مغرب کو ''کالا پانی'' کی حیثیت سے پیش کیا یعنی روحانی اور تہذیبی تنہائی ومحرومی۔ اپنے مادر وطن کی تہذیب وتمدن کے اثرات بیرون ملک مقیم ہندوستانیوں پر صاف دیکھے جا سکتے ہیں جنہیں کم وبیش ایک ایسا بدمعاش کہا گیا جس نے ایک ایسی نقصان دہ سودے بازی کی جس نے ہندوستانی اعلیٰ روح اور جذبے کے عوض مادی آسائشات حاصل کرنے کو ترجیح دی۔ ہندوستانی اعلیٰ اخلاقی اقدار اور جذبے سے محرومی پر مبنی اس صورتحال کو 1970ء میں تیار ہونے والی ایک نہایت ہی کامیاب فلم ''پورب اور پچھم'' میں بخوبی طور پر پیش کیا گیا جس میں لندن میں مقیم ایک ایسا ہندوستانی گھرانہ دکھایا گیا جو ہندوستانی روح اور جذبے سے محروم ہو چکا ہوتا ہے...... بیٹا ایک آوارہ گرد سیاح ہے اور بیٹی شبینہ کلبوں کی شائق ہے۔ ان دونوں کو ایک سچا اور مخلص ہندوستانی راہ راست پر لے کر آتا ہے جس کا نام

بھارت (ہندی میں ہندوستان کا نام) ہے جس کے باعث ناظرین فلم کے اصل مقصد کو سمجھ جاتے ہیں۔

آٹھ سال بعد ''دیس پردیس'' کے نام سے ایک اور فلم تیار کی گئی جس میں لندن کی سڑکوں پر سرعام بوس وکنار اور فحش تصویری اشتہاروں کے باعث معاشرے میں پیدا ہونے والی ابتری کو پیش کیا گیا۔ اس مکمل فحاشی وعریانی سے گھبرا کر فلم کی ہیروئن ہندوستانی گاؤں کی ایک کنواری دوشیزہ نہایت افراتفری کے عالم میں اپنے وطن واپس لوٹ آتی ہے اور ایک نہایت ہی جذباتی گیت گاتی ہے: ''کیسا ہے یہ نگریا، کیسے ہیں یہ لوگ، ہائے سب کو لاگا، پربھو، بے شرمی کا روگ!'' ان فلموں کے باعث مقامی ناظرین کو قدرے اطمینان وسکون حاصل ہوا کہ ممکن ہے کہ بیرون ملک مقیم ان کے بھائی آرام وآسائش سے لطف اندوز ہو رہے ہوں لیکن وہ دراصل اس گندے ماحول میں رہ کر بھی ہندوستانی جذبہ اور روح برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں جس ماحول کے باعث درحقیقت ان کی روح بھی آلودہ ہو گئی ہے۔

چوپڑا خاندان...... لیش اور ادتیا...... اور ان کے ساتھی کرن نے ان روایتی موضوعات سے فائدہ اٹھایا اور کاروباری لحاظ سے کامیابی حاصل کی۔ 1997ء میں ادتیا کے اصرار پر لیش نے انگلستان میں فلموں کی نمائش کے لیے دفتر قائم کیا۔ اس دفتر کے تحت ان کی پہلی نمائش کردہ فلم نے ایک ملین پاؤنڈ کی خالص آمدن حاصل کی۔ اس سے قبل کوئی بھی ہندوستانی فلم اس کے مقابلے میں ایک چوتھائی آمدن بھی حاصل نہیں کر سکی تھی پھر ایک سال بعد انہوں نے امریکہ میں بھی ایسا ہی ایک دفتر قائم کیا اور کرن کی پہلی فلم ''کچھ کچھ ہوتا ہے'' نمائش کے لیے پیش کی۔ اس فلم نے دنیا بھر میں نمائش کے ذریعے مجموعی طور پر سات ملین ڈالر کی آمدن حاصل کی جو ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ کرن کی فلم نے انگلستان کی صف اول کی دس فلموں میں سے نواں درجہ حاصل کیا۔ جنوبی افریقہ میں ''کچھ کچھ ہوتا ہے'' سے حاصل ہونے والی آمدن "Titanic" سے حاصل ہونے والی آمدن سے کہیں زیادہ تھی۔

''کچھ کچھ ہوتا ہے'' کی کہانی ایک نوجوان رنڈوے راہول کے گرد گھومتی ہے جس کی آٹھ سالہ بیٹی اپنی کوششوں سے اپنے باپ کی عرصہ دراز سے گم شدہ خاتون دوست انجلی کے ساتھ اپنے باپ کا تعلق دوبارہ استوار کرا دیتی ہے۔ فلم کے پہلے حصے میں ان دونوں کے کالج میں گزرے ہوئے گزشتہ ایام دکھائے جاتے ہیں جب یہ شوخ وچنچل لڑکی باسکٹ بال کے ایک

مقابلے کے دوران اس کی پٹائی کر دیتی ہے اور اس کی دیگر شرمیلی خاتون دوستوں کے باعث اس سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہے لیکن ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ پر مشتمل یہ باہمی تعلقات اس وقت تبدیل ہو جاتے ہیں جب منی سکرٹ میں ملبوس حسینہ ''پوجا'' داخل ہوتی ہے۔ جس کے بال مستقل طور پر ہوا میں لہراتے رہتے ہیں۔ راہول فوراً ہی اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے جب پوجا اور راہول ایک دوسرے کے ساتھ پیار کرنے لگتے ہیں تو پھر انجلی کو بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ تو راہول سے محبت کرتی ہے۔ لہٰذا انجلی یک دم کالج چھوڑ جاتی ہے۔ راہول اور پوجا ایک دوسرے کے ساتھ شادی کر لیتے ہیں۔ پوجا اپنی بچی کی پیدائش کے بعد فوت ہو جاتی ہے لیکن اپنی بیٹی کے لیے ایک خط چھوڑ جاتی ہے۔ جس میں اسے کہتی ہے کہ وہ اپنے باپ کی اصلی محبوبہ کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے۔

کرن کا یہ تراشا ہوا افسانہ ہندوستانی ماحول کے حقائق سے کسی طرح بھی میل نہیں کھاتا تھا...... کالج کے حسین و دلکش مناظر اور سحر انگیز رومانی مقامات ہندوستان میں موجود کسی بھی تعلیمی ادارے سے ذرہ بھر بھی مشابہ نہیں تھے۔ امریکی فلموں کے مانند کہانی کا اہم موڑ فلم کے نصف حصے کے بعد شروع ہوتا ہے جسے زیادہ تر بچوں کے ''سمر کیمپ'' میں فلمایا گیا۔

شاہ رخ خان پہلے والا راہول دوبارہ بن جاتا ہے جو کالج کا ایسا طالب علم ہوتا ہے جسے کبھی غصہ ہی نہیں آتا۔ اس کا مزاج اس قدر دھیما ہے کہ اس کا ہر انداز اور پہناوا اس کی اس عادت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس جگمگاتی اور بھڑکیلی دنیا میں انسان کا پہناوا اور دیگر لوازمات اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ کرن کو بخوبی علم ہے کہ اس کے ناظرین کس قسم کا پہناوا اور لوازمات پسند کرتے ہیں۔ ''دل تو پاگل ہے'' میں کرن شاہ رخ خان کے لیے ایک مخصوص شخصیت تشکیل دی لیکن اس فلم میں راہول نے ابھی تک اپنے لیے کوئی مخصوص شخصیت منتخب نہیں کی...... ''کچھ کچھ ہوتا ہے'' میں کرن کی خواہش تھی کہ وہ ہندوستانی فلموں کے لیے ایک نئے رجحان و معیار کی بنیاد ڈالے۔

فلمبندی کے آغاز سے قبل کرن اور اس کا ڈیزائنر دوست مہیش ملہوترا نے مناسب لباسوں کی تلاش کے لیے لندن کا کئی دفعہ دورہ کیا۔ (جب کرن نے پہلی بار اپنے باپ کو اپنی فلم کے لیے مناسب لباسوں کی تلاش کے لیے لندن میں خریداری کرنے کی تجویز پیش کی تو اس نے سوچا کہ شاید اس کا بیٹا پاگل ہو گیا ہے لیکن بالآخر وہ پانچ ہزار پاؤنڈ دینے پر رضامند ہو گیا

اور پھر اس رقم میں مزید تین ہزار پاؤنڈ کا اضافہ کر دیا گیا)۔ یہ امر یقینی بنانے کے لیے کہ ناظرین اس کی کوشش اور خرچ کی جانے والی رقم کی اہمیت سمجھیں، کرن اور ملہوترا نے دانستہ ان کپڑوں کا انتخاب کیا جن پر ان کے غیر ملکی ڈیزائنروں کا نشان کندہ تھا۔ کئی ایک نشانات قمیص کی چھاتی کے پورے حصے پر نقش تھے۔ انجلی نے جب باسکٹ بال کھیلتے ہوئے پہلا منظر عکس بند کروایا تو وہ DKNY کا تیار کردہ کھیلوں کا لباس پہنے ہوئے تھی اور یہ الفاظ نمایاں طور پر اس لباس پر کندہ تھے...... راہول نے بھی ''پولو سپورٹ اور گیپ'' کا تیار کردہ ''کھیلوں کا لباس'' پہنا ہوا تھا۔

لیکن یہ غیر ضروری اور بے وقعت سحر انگیز مناظر ہندوستانی شائقین کے جذبات بھڑکانے کے لیے ضروری تھے۔ کرن فلمیں تیار کرتے ہوئے اکثر رو دیا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ فلم کے مناظر اس قدر شدید جذباتی نوعیت کے ہونے چاہئیں کہ سامعین بھی رو پڑیں۔ اگرچہ فلم کی عکس بندی مقامی طور پر ہی ہوئی ہے لیکن ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' کی طرز پر اداکار اور اداکارائیں شوخ و چنچل، ہشاش بشاش اور زندہ دل ہیں اور ان کے یہ انداز و اطوار ان کے لباس اور دیگر لوازمات سے بخوبی طور پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہ جدید انداز و اطوار کے مالک لوگ نہایت بردبار اور مہذب ہیں جو جدید مغربی روایات کو اپناتے ہوئے بھی باطنی طور پر اپنا ہندوستانی تشخص قائم اور برقرار رکھتے ہیں۔ راہول ہر ہفتے مندر جاتا ہے۔ بلاشبہ اس نے ''پولو سپورٹ'' پہنی ہوتی ہے۔ پوجا جس کی پرورش لندن میں ہوئی ہے اور اس نے آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی ہے وہ ''فیشن اڈل'' جیسے لباس پہنتی ہے لیکن جب راہول اور اس کے دوست اسے عوام کے سامنے گانے پر مجبور کرتے ہیں تو وہ ہندی میں ''حمد یہ نظم'' گانا شروع کر دیتی ہے۔ شور و غوغا کرتے ہوئے ہجوم پر یکدم سناٹا چھا جاتا ہے اور بالکل خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ کہتی ہے: ''لندن میں رہنے، پڑھنے اور پرورش پانے کے باوجود میں نے اپنی جڑوں کو فراموش نہیں کیا اور آپ سب بھی اپنے اصل تشخص کو برقرار رکھیں۔''

''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' میں سمرن کا باپ بیرون ملک مقیم ہندوستانیوں کی دوسری نسل کو محاورتاً ''دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا'' کہتا ہے لیکن ان فلموں کے ذریعے بیرون ملک مقیم ہندوستانیوں کو یہ یقین دلایا گیا ہے کہ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ ان کا ایک وطن موجود ہے۔ مغرب میں رہنے کے باعث ان کا ہندوستانی تشخص ختم نہیں ہوا۔ ہندوستانی اقدار پہلے

بھی معتدل اور لچک دار تھیں اور اب بھی ہیں۔ یہ اقدار دونوں دنیاؤں مغربی اور ہندوستانی کو سہارا دے سکتی ہیں جس طرح ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' اور ''کچھ کچھ ہوتا ہے'' میں دکھایا گیا ہے۔ ان دونوں فلموں کے ذریعے بیرون ملک مقیم ہندوستانیوں کو یہ یقین دلایا گیا کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں آرام وراحت کے ساتھ زندگی بسر کی جاسکتی ہے۔ مادر وطن چھوڑنے کی تمام وجوہات غربت، بدعنوانی، ناانصافی شاید صحیح ہوں لیکن ان کا محتاط انداز سے جائزہ لیا جاتا ہے۔ ان فلموں کے باعث بیرون ملک مقیم ہندوستانیوں کے تصور میں اس جنت اراضی کا سحر انگیز نقش بنا دیا گیا جہاں خوبصورت گھروں میں بڑے بڑے محبت آمیز خاندان رہائش پذیر ہیں۔ ہندوستانی رسوم ورواج اور اخلاقی اقدار بدرجہ اتم برقرار ہیں اور بچے اپنے والدین کے فرمانبردار ہیں۔

شاہ رخ خان ایک ایسا عظیم اداکار ہے جو مشرق ومغرب کا حسین امتزاج ہے۔ لہٰذا جب ہندوستان کے مقامی ناظرین اسے ایک بردبار جدید انداز کے کپڑوں میں ملبوس شوخ وچنچل کردار کے روپ میں دیکھتے ہیں تو پھر بیرون ملک مقیم ہندوستانی بھی اسے اپنے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔ ہندوستان چھوڑ کر دیار غیر میں بسنے والی ہندوستان کی پہلی نسل یہ سمجھتی ہے کہ مغربی رنگ میں رنگے ہوئے ان کے بیٹے اور بیٹیاں بھی اسی متوازن تہذیب کے حامل ہو جائیں جس طرح ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' میں راج تھا دوسری نسل کے ہندوستانی بچے اور نوجوان ''کچھ کچھ ہوتا ہے'' میں راہول کے شیریں پن اور نفاست سے بہت متاثر تھے۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس سے وہ اپنا کچھ تعلق قائم کر سکتے تھے۔ وہ ان کے مانند دکھائی دیتا تھا اور ان کی زبان بولتا تھا (''کچھ کچھ ہوتا ہے'' کی نمائش کے بعد نارنجی رنگ کی سویٹر نما قمیصیں جو راہول نے فلم کے دوران پہنیں وہ لندن کے آکسفورڈ سٹریٹ پر واقع GAP STORES کے باہر فروخت ہوئیں۔

ہندوستانی فلموں کے ماضی کے ہیرو کے برعکس شاہ رخ خان ایک ''گھٹو'' طالب علم نہیں تھا۔ یہ ایک ایسی تحقیر آمیز اصطلاح ہے جو اس طالب علم کے لیے استعمال کی جاتی ہے جس نے ان ''مقامی'' سکولوں میں تعلیم حاصل کی جہاں انگریزی کے بجائے ہندوستانی زبان ذریعہ تعلیم تھی۔ اس نے ہر طرح کا انسان نظر آنے کی کوشش کی اس نے اس لڑکی کا سا انداز بھی اختیار کیا جو سوئٹزرلینڈ میں کھیلتی پھرتی ہے اور اس لڑکی کا سا انداز بھی اختیار کیا جو اپنی ماں کی گود میں سر

رکھ کر اطمینان وراحت محسوس کرتی ہے۔ ہندوستانیوں کی بے شمار نسلوں کے لیے ہندوستانی فلمیں ایک ایسا نقش قدم ثابت ہوئیں جو رہنمائی مہیا کرتا ہے اور انہیں اپنے گھر سے ناطہ جوڑنے کا سبق دیتا ہے۔

شاہ رخ خان کو کرن میں ایک ایسا فلمساز نظر آیا جو جبلی اور ادراکی طور پر اس فہم وفراست کا مالک تھا کہ شائقین اور ناظرین کے نزدیک اداکار نہیں بلکہ اس کی شخصیت قابل قدر ہوتی ہے۔ کرن نے یش چوپڑا کے وضع کردہ اعلیٰ چمک دمک اور اعلیٰ جذباتیت پر مبنی انداز کو مزید نکھار اور تقویت بخشی لیکن یہ انقلاب اور ارتقاء معقولیت کا حامل بھی تھا۔ یش کی بھڑکیلی اور شوخ وچنچل فلموں میں بھی دھیما لب ولہجہ موجود تھا لیکن ہندوستانی فلموں سے منسلک دوسری نسل کے نوجوانوں کرن اور ادتیا دونوں نے زندگی کے متعلق بلند لب ولہجہ اپنایا۔ یش کے سوانح نگار ڈاکٹر راشل ڈائیر کے مطابق ''انسان کے متعلق ان کا نقطہ نظر قدرے سادہ تھا۔'' دونوں نے مل کر رومان میں سے زہریلا عنصر نکال دیا اور ہندوستانی ذمہ دار اور عاقل شائقین وناظرین کے لیے پر اطمینان، راحت بخش اور سحر انگیز کہانیاں تخلیق کیں۔ پریوں کی ان سحر انگیز کہانیوں کا خوبصورت اور دلکش شہزادہ شاہ رخ خان تھا۔

کرن کی کامیابی خاص طور پر بہت شاندار تھی کیونکہ یہ قطعی طور پر غیر متوقع تھی۔ ادتیا کے برعکس کرن کو اپنے بچپن یا لڑکپن میں فلموں کا کوئی شوق نہ تھا۔ اس کا باپ یش جوہر (جس کا انتقال 2004ء میں ہوا) ہندوستانی فلمی صنعت میں ایک کہنہ مشق اور تجربہ کار شخص تھا جس نے 1952ء میں ''پروڈکشن کنٹرولر'' کی حیثیت سے اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز کیا اور آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے اس نے 1976ء میں اپنا ذاتی فلمی ادارہ قائم کر لیا لیکن کرن ہندوستانی فلموں کو جمالیاتی حقارت کی حیثیت سے دیکھتا تھا۔ وہ جنوبی ممبئی کا ایک سخت دل امارت پرست شخص تھا جس کے دل میں غریبوں کے لیے حقارت کے سوا کچھ نہ تھا۔ حتیٰ کہ ایک بچے کی حیثیت سے بھی وہ اپنا منفرد انداز اپنانے کا شدید شائق تھا (وہ بہت ہی خود سر تھا اور اس خود سری کے باعث اس قدر خود پرست ہو گیا تھا کہ وہ بعض اوقات سالگرہ کی تقریبات میں شرکت کرنے سے انکار کر دیتا تھا۔) کرن ادتیا اور اس کے چھوٹے بھائی سے آشنا تھا۔ مختلف فلمی تقریبات کے علاوہ سالگرہ کی تقریبات کے مواقع پر ان کی ملاقاتیں ہوتی تھیں لیکن کرن نے اپنی ماں کو بتایا کہ وہ ان سے اس وجہ سے دوستی نہیں کر سکتا کہ وہ ہندی فلموں کے متعلق ہندی

میں بات کرتے ہیں جو اسے پسند نہیں۔

لیکن اس کا بات بات پر ناک چڑھانا اس کی ظاہری عادت تھی جو اپنے اس قسم کے دوستوں کے ساتھ مل کر پختہ ہو چکی تھی۔ درحقیقت کرن مخفی طور پر نہایت ناکارہ شخص تھا۔ اپنے بچپن اور لڑکپن ہی میں دراصل اسے ہندی فلموں کا بہت شوق ہو گیا تھا اور وہ بظاہر ان فلموں کے ناک منہ چڑھتا رہتا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ وہ ان فلموں کی تیاری اور دیگر مراحل کے متعلق اپنائے جانے والے طریقوں اور تراکیب کا بھی مطالعہ کرتا رہتا تھا لیکن اس نے کبھی بھی اپنے جذبات کا واضح طور پر اظہار اپنے والد کی تخلیق کی ہوئی دنیا کے حوالے سے نہیں کیا تھا۔ کالج کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے خاندانی ملکیت کے ایک برآمدی کاروبار میں کام کیا، فرانسیسی زبان سیکھی اور مزید تعلیم حاصل کرنے کے ضمن میں پیرس جانے کے لیے کچے پکے منصوبے بناتا رہا۔

ادتیا نے فی الحال اپنے منصوبے ملتوی کر دیے تھے۔ ستمبر 1994ء میں ایک مشترکہ دوست نے دو افراد سے اس کا دوبارہ تعارف کرایا۔ ان کی شخصیات یکسر متضاد تھیں۔ ادتیا ایک خود پرست شخص تھا اپنے تعلقات کے ضمن میں بہت محتاط تھا۔ وہ ایک ضدی، شعور خود قدری کا حامل اور اسے شکست دینا بہت ہی مشکل تھا۔ اگر وہ کبھی کسی کھیل میں بھی ہار جاتا تو اس کا مزاج برہم ہو جاتا۔ کرن بہت زیادہ خوشامد پسند تھا اور خوشامدی ہر وقت اس کے گرد گھیرا ڈالے رکھتے۔ وہ محنتی تو تھا لیکن اطمینان وسکون کے ساتھ کام کرنا پسند کرتا تھا۔ (یہ تضاد ان کی انفرادی کامیابیوں کے دوران واضح طور پر نمایاں ہو گیا...... جب ادتیا کی پہلی فلم نے شاندار کامیابی حاصل کر لی تو وہ مزید گمنام اور گوشہ نشین ہو گیا۔ اس نے اس قدر موثر انداز میں ذرائع ابلاغ کو اپنے سے دور رکھا کہ ناظرین کو اس کی شخصیت کے متعلق بہت تھوڑا علم ہو سکا لیکن کرن نے اپنی پہلی فلم کی نمائش کے بعد دانستہ طور پر ذرائع ابلاغ کے لوگوں میں رقم بانٹی اور اس نے اخبارات کے فلمی صفحات اپنے لیے مخصوص کروا لیے۔) بہر حال ادتیا نے کرن میں وہ کچھ دیکھ لیا جو اس سے پہلے کسی کو نظر نہیں آیا تھا۔

اب ادتیا نے یکے بعد دیگرے مختلف قسم کی کہانیاں اور مسودے کرن کے حوالے کرنا شروع کر دیے۔ بالآخر اس نے کرن کو قائل کر ہی لیا کہ وہ پیرس کو بھول جائے اور ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' کے حوالے سے اس کا ہاتھ بٹائے۔ کرن کو فلموں کی تیاری کے ہر مرحلے

کا علم تھا۔ مسودے کے حوالے سے مشاورت کے علاوہ اس کا ایک چھوٹا سا کردار بھی تھا۔ اس کی سب سے اہم ذمہ داری لباسوں کا انتخاب تھا۔ ادتیا کا انداز اور مزاج بہت سادہ تھا لیکن کرن چاہتا تھا کہ فلم میں ظاہری طور پر چمک دمک اور خوبصورتی موجود ہو کیونکہ انسانی فطرت نمائش پسند ہوتی ہے۔ وہ مختلف قسم کے نئے اور جدید انداز کی تلاش میں بہت ماہر تھا کیونکہ وہ ایک سیمابی مزاج کا شخص تھا۔ وہ ممبئی کے مضافات کے گنجان بازاروں میں مناسب چوڑیوں اور بندوں کی تلاش میں گھنٹوں صرف کر دیتا۔ وہ اس امر کے لیے بہت مضطرب تھا کہ فلم کی ہیروئن کس طرح دبلی پتلی نظر آئے۔ بعض اوقات سوئٹزرلینڈ کی سڑکوں پر فلمبندی کے دوران کرن بذات خود کاجل کے بال درست کرتا۔

''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' کی تیاری کے دوران شاہ رخ خان کرن کے ساتھ اس طرح منسلک رہا جس طرح وہ ''ڈر'' کی تیاری کے دوران ادتیا سے منسلک رہا تھا۔ ادتیا اب فلم کے معاملات میں الجھ گیا تھا۔ فلم کی تخلیق کے حوالے سے گنجلک معاملات سے قدرے متفکر ہو کر وہ کام میں اس قدر مصروف اور مشغول ہو گیا تھا کہ اسے سر کھجانے کی فرصت بھی نہ ملتی اور کھانا تو کبھی کبھار ہی اس کے حلق میں جاتا۔ انہوں نے مسودے کی نہایت جانفشانی سے چھان پھٹک کی اور اس میں مناسب اضافہ اور تبدیلیاں کیں۔ سوئٹزرلینڈ میں بیرونی فلمبندی کے موقع پر شاہ رخ خان، جس نے کبھی بھی اپنی بے خوابی کا علاج کرنے کی کوشش نہیں کی، نے کرن کو بھی راتوں کو دیر تک اپنے ساتھ بیٹھنے اور فلموں کے متعلق گفتگو کرنے پر مجبور کر دیا۔ کرن کے معصوم چہرے اور بھونڈے انداز و اطوار، کہانی اور مسودے کے متعلق اس کی فہیم جبلت اور ہندوستانی فلموں کے متعلق اس کے وسیع تجربے اور علم کی غیر موجودگی کی چغلی کھاتے تھے۔ ان دونوں میں ایک ہی طرح کی انوکھی اور جنونی حس مزاح ہوتی تھی۔ شاہ رخ خان نے کرن میں بھی اس وسیع اور وافر ذوق وشوق کا مظاہرہ دیکھ لیا تھا جو اس نے ادتیا میں دیکھا تھا۔ ایک دن کافی پیتے ہوئے شاہ رخ خان نے کرن سے کہا کہ وہ ایک فلم بنائے اور مزید کہا کہ وہ اس فلم میں اداکاری کرنے پر آمادہ ہے۔

چھ ماہ بعد کرن راجھستان گیا جہاں شاہ رخ خان ایک فلم میں اپنے چند مناظر عکس بند کروا رہا تھا۔ اس وقت شاہ رخ خان ''امیر پیلس'' کے زینوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ کرن نے شاہ رخ خان کو تصنیف کے مراحل طے کرتی ہوئی ایک رومانی کہانی سنائی جس کا مرکزی کردار ایک رنڈوا

ہے جو اپنی پہلی محبوبہ کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ کرن یہ دیکھ کر بت بن گیا کہ شاہ رخ خان کو یہ کہانی پسند آئی لیکن شاہ رخ خان نے اس مضطرب اور منتشر لڑکے کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔ وہ کہنے لگا: ''اگر ادتیا بھی اس معاملے میں اتنا ہی پر جوش ہے تو پھر اس کا ''اسسٹنٹ ڈائریکٹر'' ہی کافی ہوگا جس طرح کرن نے چند مناظر کی تصویر کشی کی میرا اس پر اعتماد مزید بڑھ گیا ہے۔ اب ہم سب وہی لوگ مل جل کر کام کریں گے یش، جوہر، کاجل اور ہم ایک بہترین تخلیق پیش کریں گے۔

21 اکتوبر 1997ء کرن نے ''کچھ کچھ ہوتا ہے'' کا آغاز کر دیا۔ ایک رات پہلے کرن کی والدہ اس کے کمرے میں آئی اور ہچکچاتے ہوئے اس سے پوچھا کہ کیا اسے علم ہے کہ کیمرے کے عدسے میں سے کیسے دیکھا جاتا ہے اور ایک منظر کو کیسے کیمرے کی آنکھ کے اندر لایا جاتا ہے۔ اسے علم نہیں تھا کہ اس کا تکلیف دہ حد تک شرمیلا بیٹا ایک فلم کی ہدایتکاری کے فرائض سرانجام دینے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔ عکس بندی کا پہلا دن کچھ زیادہ اچھا ثابت نہ ہوا جس کے باعث اسے اپنی ماں کا سوال قدرے صحیح اور درست محسوس ہوا۔ فلم کا تمام عملہ نوجوان اور ناتجربہ کار تھا۔ کرن اور اس کے نائبین کم ہی جانتے تھے کہ کون سا عدسہ استعمال کرنا ہے اور کس طرح تمام مناظر کو قطع و برید کے بعد آپس میں جوڑتا ہے۔ اس وقت شاہ رخ خان عملے کو مختلف تکنیکی طریقوں سے آگاہ کر رہا تھا مثلاً کیمرے کو دائیں طرف لے کر جانا ہے، کیمرے کو بائیں طرف لے کر جانا ہے۔ اس نے کہا: ''جب اس نے اس دہائی کی کامیاب ترین فلم بنائی تو کرن نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ فلم کی تیاری کے متعلق اسے کچھ زیادہ علم نہیں ہے۔'' کرن کی پیشہ وارانہ لاعلمی اور تجربے کا فقدان زیادہ اہم محسوس نہیں ہوا۔ فلم کی نمائش کے بعد کرن کو ''بہترین ہدایتکار'' کا انعام دیا گیا۔ اس نے اخبارات کو بتایا کہ وہ آئندہ جو بھی فلم بنائے گا اس میں شاہ رخ خان ہی کام کرے گا۔

ان دونوں کے درمیان پیشہ وارانہ اور ذاتی دوستی اور ہم آہنگی کے باعث یہ افواہ پھیل گئی کہ شاہ رخ خان اور کرن کے درمیان رومانی تعلق قائم ہو چکا ہے۔ اس پر شاہ رخ خان نے اپنی روایتی فہم کے ساتھ جواب دیا: ''تو پھر میرے دو بچے کس طرح ہو گئے؟'' درحقیقت کرن گاؤری کے بہت نزدیک تھا۔ کرن شاہ رخ خان کی تقریباً جنونی حد تک عزت کرتا تھا لیکن گاؤری اس کی بیوی تھی۔ کرن نے گاؤری کو ہندوستانی فلمی صنعت میں عیارانہ اور مکارانہ

طور پر بدلتی ہوئی وفاداریوں کے رجحان کو ترک کرنے میں اس کی معاونت کی اور اسے ایک بڑے اور عظیم اداکار کی بیوی کے نئے ملنے والے مرتبے کے مطابق رویہ اور طرز عمل اختیار کرنے میں مدد مہیا کی۔ گاؤری نے کہا: ''میں بالکل بیزار نہیں ہوں کیونکہ کرن یہیں موجود تھا۔ مجھے قطعی طور پر شاہ رخ خان کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ کرن کے ساتھ وقت جیسے تیسے گزر ہی گیا۔''

شاہ رخ خان کو ایک عظیم اور بڑا اداکار کا درجہ حاصل ہونے کے باعث اس کے اداکاری کے معیار میں کوئی فرق رونما نہیں ہوا۔ ابتدائی چند سالوں بعد گاؤری نے انٹرویو دینے بند کر دیے تھے۔ وہ شہر کی اعلیٰ درجے کی تقریبات میں مروج جدید انداز ہائے حسن و سنگھار کی موجودگی کی علامت تھی۔ کبھی کبھار وہ کسی ڈیزائنر یا دوست کو ممنون کرنے کے لیے اپنا نام استعمال کرنے کی اجازت دے دیتی لیکن زیادہ تر وہ اپنے شوہر کی عظمت ہی میں گم رہتی۔ ان کا بیٹا آرین 12 نومبر 1997ء کو پیدا ہوا اور پھر تین سال بعد 22 مئی کو ان کے ہاں بیٹی سہانا پیدا ہوئی۔ ہندوستانی فلموں کے اکثر بڑے اداکاروں کے برعکس شاہ رخ خان کسی بھی بدنام زمانہ واقعے یا رسوا کن رومانی صورتحال سے محفوظ رہا۔ افواہ ساز اور گپ باز رسالے کبھی کبھار اسے اس کی ہیروئنوں سے منسلک کر دیتے اور فلمی صنعت کے گرگ بارہ دیدا اس کا کرن کے ساتھ تعلق جوڑ دیتے لیکن غیر فطری شادی کے قصوں کا کوئی مستند ثبوت ہمارے سامنے نہیں آیا۔ شاہ رخ کا کہنا تھا: ''اپنے تعلقات کے ضمن میں میں نے اپنے ساتھ کچھ وعدے کر رکھے ہیں اور میرا خیال ہے کہ میں نے یہ وعدے نبھائے ہیں۔''

8 اکتوبر 1995ء کو شاہ رخ خان نے گاؤری کو ساحل سمندر پر واقع 26300 مربع فٹ رقبے پر مشتمل ایک ورثہ قدیمہ کو شاندار بنگلے کی حیثیت سے شادی کے تحفے کے طور پر پیش کیا۔ یہ بنگلہ 1892ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس شہر میں جہاں پانچ سو مربع فٹ رقبے پر مشتمل تنگ مکان، رہائش کے لیے مناسب سمجھا جاتا ہے وہاں اس قسم کا شاندار اور وسیع رقبے پر تعمیر شدہ بنگلہ بے شمار دولت اور طاقت کا قصہ بیان کرتا ہے۔ اس جگہ کو فلمبندی کے لیے بھی اکثر استعمال کیا جاتا رہا اور یہ عمارت ہیبت ناک کھنڈر میں تبدیل ہو چکی تھی لیکن ساڑھے چار سال میں ماہرین تعمیرات کی مہارت اور اندرونی تزئین و آرائش نے اسے ممبئی کا استعارہ بنا دیا ہے۔

ممبئی میں مروج قوانین ورثہ قدیمہ کی عمارتوں کی ازسرنو تعمیر کو ممنوع قرار دیتے ہیں تاکہ

ان کا اندرونی اور بیرونی حصہ متاثر نہ ہو لیکن اندرونی تزئین وآرائش کے ماہرین نے اسے ایک دلکش اور خوبصورت محل میں تبدیل کر دیا ہے جو واقعی ایک بڑے اور عظیم اداکار کی رہائش گاہ محسوس ہوتا ہے۔ ہندوستان کے مشہور مصور ایم۔ ایف۔ حسین نے سفید اور نیلے رہائشی کمرے کے بالکل عین مطابق یہاں مصوری کی۔ اس قصر میں شراب خانہ، تالاب، سکوں سے چلنے والا خودکار گراموفون اور شاہ رخ خان کی فلموں کے مانند بہت سی چیزیں یہاں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ کولا مشروب تیار کرنے والی مشین بھی یہاں مہمانوں کی خاطر مدارت کے لیے رکھی گئی ہے۔ شاہ رخ خان اور گاؤری بچوں سمیت یہاں 2000ء میں منتقل ہوئے پھر پانچ سال بعد بنگلے کے عقب میں واقع کھلی جگہ میں ایک چھ منزلہ عمارت تعمیر کی گئی جس میں ایک سینما گھر اور تیراکی کا تالاب بھی بنایا گیا ہے۔ شاہ رخ خان اور گاؤری اس گھر کو ''منت'' کہتے ہیں۔

اس ''منت'' کے اظہار کے ذریعے شاہ رخ خان اور گاؤری اپنی زندگی میں ''غیر معمولیت'' کے بجائے ''معمولیت'' کی اپنائیت کا عندیہ ظاہر کرتے ہیں لیکن کسی انسان کو مکمل طور پر اس کی اصل سے جدا کرنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ اب ذرائع ابلاغ کی طرف سے ان کی زندگی کی کچھ کچھ تفصیل سامنے آ رہی ہے مثلاً شاہ رخ خان اکثر ہی اپنے بچوں کو سکول سے اٹھوا لیتا ہے اور گاؤری اپنی مرضی کے مطابق مرکز آرائش حسن وسنگھار سے اپنے بال بنوانے جاتی ہے۔ اب شاہ رخ خان کی رائے اس قدر زوردار ہوتی ہے کہ عام طور پر اس کی دو رائے ہوتی ہیں۔ لہٰذا اب گاؤری اسے شاہ رخ خان ایک اور شاہ رخ خان دو کہہ کر پکارتی ہے جسے گاؤری اس کے دو ''کردار'' کہتی ہے۔ ایک کردار ایک چیز کہتا ہے اور دوسرا کردار اس کے بالکل الٹ کہتا ہے اور یہ دو مختلف کردار ایک منٹ کے اندر اندر ہی یہ متضاد اداکاری کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دفعہ مصنف جاوید اختر نے گاؤری سے یہ پوچھنے کی جرات کر ہی ڈالی:

''یہ دونوں ''شاہ رخ'' کیسے ہیں؟''

دوسرے لوگوں کے ساتھ تعلقات کے ضمن میں ایک اصول اور ضابطے کی حیثیت سے شاہ رخ کی یہ دورخی شخصیت ایک لاڑے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے ایک دفعہ کہا: ''شاہ رخ خان دو ہیں۔ بڑے اور عظیم اداکار کی حیثیت سے گاؤری کا اس کے ساتھ تعلق عجیب وغریب ہے، وہ اس سے بالکل آشنا نہیں ہے۔ میرا نہیں خیال کہ وہ اسے اس حیثیت سے بہت زیادہ پسند کرتی ہے۔ میں اس شاہ رخ کو اپنے گھر نہیں لاتا اور اس حوالے سے اس کا موقف قطعی واضح

ہے کہ وہ اس شاہ رخ سے آشنا بھی نہیں ہونا چاہتی لیکن اس کا اپنے خاوند کے ساتھ تعلق بہت ہی شاندار ہے۔ میرا خیال ہے کہ بڑا اور عظیم اداکار اس کا واحد انتخاب ہے جسے اس نے قبول کیا ہے اور اس کے ساتھ ہم آہنگی اختیار کی ہے۔ اس کی یہ بہت بڑی قربانی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے اپنے شوہر کے ساتھ تعلقات بہت اچھے اور پائیدار ہیں۔ یہ ایک بہتر اور اچھا طریقہ ہے اور اس میں پوشیدہ مزاح مجھے بہت پسند ہے۔

میں نے اس امر کا یقینی اہتمام کیا ہے کہ بڑا اور عظیم اداکار شاہ رخ خان اس قسم کا رویہ نہ اپنائے جو دوسرے شاہ رخ خان کی زندگی کو منتشر و مضطرب کر دے۔ میں نے اپنی ذاتی زندگی کی تحقیر کبھی نہیں کی ہے اور نہ ہی اسے کم تر سمجھا ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ شاہ رخ خان بڑے اور عظیم اداکار شاہ رخ خان سے زیادہ اہم ہے اور اسی یقین کے سہارے بڑا اور عظیم اداکار شاہ رخ خان مزید پھلتا پھولتا ہے۔ چونکہ میں سمجھتا ہوں کہ میرا دل صحیح جگہ پر ہے اور ایک اداکار کی حیثیت سے آپ کو یہی چیز درکار ہوتی ہے۔ میں تو اس افسانوی اور دیومالائی شاہ رخ خان کا محض ایک خادم ہوں۔''

❁

تیرہواں باب

منفرد اور مستند شخصیت

نسرین منی کبیر کی کتاب "Bollywood, The Indian Cinema Story" کے دیباچے میں جاوید اختر یہ سوال کرتا ہے ''ہم ایک کردار کیسے تخلیق کرتے ہیں؟'' پھر خود ہی اس کا جواب دیتا ہے: ''ہم معاشرے کی اخلاقی اقدار اور خواہشات کو اپنے پیش نظر رکھتے ہیں اور پھر انہیں شخصیت کا روپ دے دیتے ہیں۔'' لیش ادتیا اور کرن نے 1990ء کی دہائی کے لیے نئے اور جدید تقاضوں کے مطابق ایک بڑا اور عظیم اداکار تخلیق کیا۔ اب شاہ رخ خان محض کردار ادا کرنے والا ایک اداکار نہیں تھا بلکہ اب وہ اپنی ایک علیحدہ اور انفرادی شخصیت کا مالک تھا جس میں کردار بذات خود ڈھل جاتا ہے۔ اس ضمن میں ہدایتکار پیٹر بوگڈانووچ اپنی کتاب Who the Hell's in It میں لکھتا ہے: ''تمام کردار ایک قطعی اور جامع کردار میں سرایت کر گئے۔ ایک خاص عوامی کردار جو اصل کردار کے مانند تو ہوتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ یہ بنیادی اور حقیقی کردار کے مطابق بھی ہو اور پھر جس طرح ہدایتکار فرٹز لینگ نے اس ضمن میں یہ اصطلاح استعمال کی ''ایک مناسب ڈرامائی عنصر۔'' شاہ رخ خان کی بہت زیادہ کامیاب فلمیں وہ ہیں جن میں اس کے کردار، راج اور راہول کے دائرہ کار کے اندر رہ کر ادا کیے گئے ہیں۔ ''عاشق لڑکے'' پر مبنی کرداروں کو اپنانے کی اس کی کوششیں زیادہ کامیاب نہیں ہوئیں۔ اب تو ایک ایسی صورتحال تخلیق ہو گئی تھی کہ ناظرین اسے اس قدر زیادہ پسند کرنے لگے تھے کہ انہیں شاہ رخ خان کسی بھی کردار میں قبول تھا۔

اشتہار بازی کے باعث اس انفرادی ''رومانی ہیرو'' کی شخصیت کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔ شاہ رخ کی اس انفرادی سکہ بند شخصیت کو تخلیق کرنے اور برقرار رکھنے میں تجارتی اور کاروباری اشتہاروں نے اہم کردار ادا کیا۔ اشتہار بازی کی دنیا اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ گریجویشن کے بعد اس نے جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی نیو دہلی میں ''ابلاغیات'' کے مضمون

میں داخلہ لے لیا۔ ساٹھ سیکنڈ یعنی ایک منٹ میں کہانی بیان کرنے کے فن نے اسے بہت متاثر کیا۔ اس نے یہ بھی سیکھا کہ اشتہار کیسے تیار کیے جاتے ہیں اور کبھی کبھار اس نے چند اشتہاروں میں اداکاری بھی کی...... شاہ رخ خان نے ''لبرٹی شوز'' کے لیے ایک اشتہار میں کام کیا جس میں اسے راکی بالبوا کے مانند طلوع آفتاب کے وقت دوڑتے ہوئے دکھایا گیا۔ اس اشتہار کے لیے کل اخراجات ساٹھ ہزار روپے تھے لیکن اسے صرف تین ہزار روپے بطور معاوضہ ادا کیے گئے۔ ''فوجی'' کے بعد شاہ رخ خان نے عوامی خدمات کے ضمن میں کئی اعلانات کیے جن کے لیے ہدایات کرنل کپور نے دی تھیں۔

اگرچہ شاہ رخ خان ایک بڑا فلمی اداکار بن چکا تھا لیکن اس کے باوجود اشتہار بازی اس کی پیشہ وارانہ زندگی کا ایک ناگزیر حصہ بن چکی تھی۔ شاہ رخ خان نے خود کو ایک ایسی مستند مشہور شخصیت میں ڈھال لیا جو فروخت ہونے کے لیے ہر وقت دستیاب تھی۔ جب سے شاہ رخ خان اشتہار بازی کی صنعت سے منسلک ہوا ان سالوں میں اس نے بے شمار معمولی اور اعلیٰ مصنوعات کے اشتہاروں کے لیے اداکاری کی جن میں مقامی طور پر تیار ہونے والے بسکٹوں سے لے کر عالمی معیار کی Heuer گھڑیاں اور پیپسی کولا شامل تھے۔ اشتہاروں میں اداکاری کرنے کے ضمن میں اس کا استدلال بہت عملی تھا۔ وہ کسی بھی اشتہار میں کسی بھی قیمت پر اداکاری کرنے کے لیے تیار تھا کیونکہ اشتہاروں سے ملنے والی رقم کے باعث وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ فلموں میں مناسب معاوضہ حاصل کرنے کا تقاضا کر سکے۔ بہر حال فطری لحاظ سے شاہ رخ خان ایک ایسا بڑا اور عظیم اداکار ہے جس کا معاوضہ بہت کم ہے جب عامر خان ایک فلم کے لیے ستر ملین روپے کا تقاضا کر رہا تھا تو شاہ رخ خان یہی اس سے نصف معاوضے پر بھی کرنے کے لیے تیار تھا۔ ادتیا اور کرن جیسے قابل ترجیح اور پسندیدہ فلمسازوں کے لیے رقم کے لیے کوئی بات ہی نہیں ہوتی تھی۔

فلمیں شاہ رخ خان کے لیے شوق کی حیثیت رکھتی تھیں لیکن اشتہاروں کے لیے اسے کھانے کے لیے ''دال روٹی'' میسر ہوئی۔ اگرچہ اس کے تمام معاہدات خفیہ ہوتے تھے لیکن تجارتی دنیا میں افواہیں یہ تھیں کہ اس کا معاوضہ چالیس ملین اور سو ملین روپے کے درمیان ہے۔ امیتابھ بچن اور کرکٹ کے ایک بڑے کھلاڑی سچن ٹنڈولکر کے ساتھ ساتھ شاہ رخ خان ملک میں سب سے زیادہ معاوضہ حاصل کرنے والی مشہور شخصیت ہے۔ اس رقم کے باعث اسے فلمی

دنیا میں مالی محرومیوں سے نمٹنے میں بہت زیادہ مدد حاصل ہوئی۔ مئی 1998ء میں ''فلم فیئر'' جریدے کے ساتھ انٹرویو میں شاہ رخ خان نے کہا تھا: ''مجھے اپنے بنگلے کے لیے رقم کی ضرورت ہے، اپنے بیٹے کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے مجھے رقم چاہیے، مجھے اپنی مالی استحکام کے لیے رقم درکار ہے۔ اگر اس سے مراد ہر قسم کی مصنوعات کے اشتہار میں اداکاری کرنا ہے تو پھر یہی چیز میرے لیے مناسب ہے'' شاہ رخ کا خیال تھا کہ اس قسم کی کوئی بھی چیز غیر معمولی نہیں ہے۔

ہندوستانی فلمی صنعت میں یہ ایک حیرت انگیز اور غیر روایتی نظریہ تھا ''بڑا اور عظیم اداکار'' جو فلمی صنعت کے ابتدائی سالوں سے رائج تھا۔ 1929ء میں اداکارہ لیلا چٹنیس نے اپنے ناظرین کو یقین دلایا کہ اس کے سفید رنگ کی وجہ ''لکس'' کا استعمال ہے۔ اس صابن کو اس دور کی صف اول کی خواتین کی طرف سے تصدیق و توثیق حاصل رہی (2005ء میں شاہ رخ خان ہندوستان میں صنعت اشتہار بازی کے حوالے سے پہلا ''منفرد اور مستند اداکار'' بن گیا۔) لیکن لکس کے متعلق اشتہار بازی مستقل نوعیت کی نہیں تھی۔ اکثر اداکار ہر قسم کی مصنوعات کے لیے اشتہار بازی کے ضمن میں بہت محتاط تھے۔ اشتہاروں کو فلم کی نسبت بہت کم دیکھا جاتا تھا جس کے باعث اداکاروں کو بیروزگاری کا خدشہ درپیش ہوتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے بڑے پردہ سیمیں کے حوالے سے بڑا اور عظیم اداکار بننے کی طرف توجہ مرکوز کی۔ ہندوستانی فلمی صنعت کے بڑے بڑے ناموں نے تجارتی اور کاروباری اشتہاروں کی طرف اداکاری کرنے کی طرف قطعی دھیان نہیں دیا۔ جب ایک اشتہاری ادارے کے مالک پراسون جوشی عظیم اور دیومالائی حیثیت کے حامل اداکار دلیپ کمار کے پاس ایک نفع بخش پیشکش کے ساتھ پہنچا تو اس عظیم اداکار نے نہایت حقارت کے ساتھ اس پیشکش کو ٹھکراتے ہوئے کہا: ''ہم اشتہاروں کے لیے نہیں بنے ہیں۔'' امیتابھ بچن نے بیس سال سے زائد عرصے تک اشتہاروں میں کام نہیں کیا اور صرف 1996ء میں اس نے پہلی اشتہاری فلم میں اداکاری کی۔

1990ء کی دہائی تک ہندوستان کی اشتہاری صنعت مشہور اداکاروں کی طرف متوجہ نہ تھی اور مصنوعات کی فروخت کے لیے اشتہار بازی بھی ابھی مستحکم بنیادوں پر قائم نہیں تھی۔ ٹیلی ویژن کے دو نشریاتی ادارے اس وقت پیچیدہ اور مشکل پروگرام نشر کر رہے تھے کہ ناظرین ان پروگراموں کے درمیانی وقفوں میں دکھائے جانے والے اشتہاروں کی طرف متوجہ ہو رہے

تھے۔ اس وقت اشتہار ناظرین کے لیے تفریح کا باعث تھے۔ اشتہاروں کی تیاری کے لیے مخصوص رقم موجود تھی۔ اس زمانے میں پراسون جوشی نے کہا تھا: ''ایک اشتہاری فلم کی تیاری ہی بہت کافی ہے۔'' لیکن آزاد خیالی اور روشن خیالی کے باعث مصنوعات فروخت کرنے پر مبنی طور طریقوں میں تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ غیر ملکی ادارے بھاری رقوم کے ساتھ اشتہار بازی کی صنعت میں داخل ہو گئے اور انہوں نے اپنی موجودگی فوراً ہی ثابت کر دی۔ اس ملک میں جہاں ناظرین کو فلموں کا بے انتہا شوق ہو ایک منفرد اور مستند شخصیت کی قبولیت اور پہچان کا موثر طریقہ 159 بڑے اور عظیم اداکاروں کی حیثیت کے باعث تھی۔ پیپسی پہلا غیر ملکی بلکہ بین الاقوامی ادارہ تھا جو نہایت دھوم دھام اور بھاری رقم کے ساتھ اشتہاری صنعت میں کود پڑا تھا۔ پیپسی کے اشتہارات اس ادارے کی بین الاقوامی اشتہاری حیثیت کے مطابق اکثر ہندوستانی ماحول کے مطابق تیار کیے جاتے تھے۔ اکثر اشتہار بین الاقوامی اشتہاروں کی نقل ہوتے تھے جن میں غیر ملکی اداکاروں کے بجائے ملکی اداکار اداکاری کرتے تھے۔ 1993ء میں پیپسی نے ایک انتہائی کامیاب اشتہار تیار کیا جس میں مائیکل جے فاکس اپنے نئے ہمسائے کو پیپسی کولا دیتے ہوئے خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہندوستانی ماحول کے مطابق پیپسی کا اشتہار تیار کرنے کے لیے ہدایتکار پراہ لاڈ کاکڑ کے کہنے کے مطابق ''شاہ رخ خان کا معاوضہ کم ہے اور اس کا انداز بھی شوخ و چنچل ہے۔'' شاہ رخ خان کا مطالبہ پانچ لاکھ روپے تھا۔ پراہ لاڈ نے اس اشتہار میں اداکاری کرنے کے لیے عامر خان سے اصرار کیا جو اس وقت ایک بڑا اور فطری طور پر زیادہ مہنگا اداکار تھا۔ عامر نے ایک اعشاریہ پانچ ملین روپے کا مطالبہ کیا جو اشتہار کے مکمل اندازے سے بھی زیادہ تھا جب پراہ لاڈ نے اس اشتہار سے الگ ہونے کی دھمکی دی تو پیپسی نے اپنے موقف میں نرمی کر لی اور عامر خان کے ساتھ معاہدے پر دستخط کر دیے۔ یہ اشتہار اشتہار بازی کی صنعت میں ایک سنگ میل ثابت ہوا اور مستقبل کی ''عالمی حسینہ'' ایشوریہ رائے کی پیشہ وارانہ فلمی زندگی کی ابتداء ہوئی۔

لیکن شاہ رخ خان کی گستاخ، اکھڑ اور نوجوان شخصیت اور نقش پیپسی کولا کے مشہور ادارے کے اشتہار کے لیے قطعی طور پر مناسب اور موزوں تھے۔ آزاد معیشت اور روشن خیالی کے باعث نئے نئے مواقع پیدا ہو رہے تھے اور ایک اچھی زندگی کے خوابوں کو مزید تقویت حاصل ہو رہی تھی۔ راجندر نگر کا رہائشی شاہ رخ خان جس نے اپنی قسمت کی لکیر خود کندہ کی، نے

اس نئے ماحول کے مطابق خود کو ڈھال لیا۔ اس کی زندگی کی کہانی صارفین کے ساتھ منسلک ہوگئی۔ 1996ء میں شاہ رخ خان نے پیپسی کولا کے ساتھ معاہدے پر دستخط کیے۔ پیپسی کولا کے جس پہلے اشتہار میں شاہ رخ خان نے کام کیا، اس میں شاہ رخ خان نے اپنی بھرپور فہم و فراست استعمال کی۔ بہرحال عامر اور پیپسی کے درمیان راستے 1994ء میں جدا ہو گئے تھے لہٰذا 1999ء میں اس نے پیپسی کولا کے حریف ادارے کوکا کولا کے ساتھ معاہدے پر دستخط کیے لیکن پیپسی کولا نے شاہ رخ خان کے ساتھ اپنے معاہدوں کی مسلسل تجدید جاری رکھی اور شاہ رخ خان ہندوستان میں اس ادارے کے لیے سب سے زیادہ کام کرنے والی مشہور شخصیت کی حیثیت اختیار کر گیا۔

شاہ رخ خان کی انفرادی اور مستند شخصیت پر مشتمل بڑے اور عظیم اداکار نے سربمہر کھانوں سے لے کر ہنڈائی کار کے اشتہاروں میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔ 2002ء میں ''انڈیکا ریسرچ'' نے اشتہار بازی کے ضمن میں چار شہروں پر مشتمل ایک جائزہ تیار کیا۔ یہ کوئی حیران کن حقیقت نہیں تھی کہ شاہ رخ خان ایک کثیر الجہت مشہور شخصیت کی صورت میں ابھرا تھا جس نے بے شمار مختلف اشتہاری فلموں میں اداکاری کر کے ناظرین کو مختلف مصنوعات کی طرف متوجہ کیا۔ اس جائزے کے متعلقین نے شاہ رخ خان کی شخصیت کو ان مصنوعات کے ساتھ بھی منسلک کر دیا جن کی طرف اس نے اپنے ناظرین کو متوجہ کرنے کی طرف دھیان نہیں دیا تھا مثلاً مستند اداروں کی طرف سے تیار کردہ لباس وغیرہ۔ شاہ رخ خان پر اکثر اس لیے تنقید کی جاتی ہے کہ وہ ان مصنوعات کی تشہیر کے لیے بھی اداکاری کرتا ہے جو معیاری نہیں ہوتیں۔ ایک وقت تھا کہ وہ صرف معیاری مصنوعات کی تشہیری فلم میں کام کرنے کی حامی بھرتا تھا لیکن اکثر ادارے اسے اپنے ساتھ منسلک رکھنے کے لیے بھاری رقومات خرچ کرتے ہیں۔ 2003ء میں Tag Heur گھڑیاں تیار کرنے والے ادارے نے شاہ رخ خان کے ساتھ اپنی اشتہاری مہم کا آغاز کیا۔ 2005ء میں ایک جائزے کے ذریعے معلوم ہوا کہ اس کی مصنوعات کی فروخت میں سالانہ ساٹھ فیصد اضافہ ہو چکا ہے...... انتظامیہ کے کہنے کے مطابق انہوں نے اپنے مقررہ اہداف سے کہیں زیادہ اپنی مصنوعات فروخت کر لی ہیں۔

اشتہار بازی کے متعلق صف اول کے ایک تحقیقی ادارے ''ایجنسی سورس'' نے 1994ء اور 2006ء کے درمیان تیار کیے گئے اشتہارات کے بارے میں اعداد و شمار اکٹھے کیے جن سے

معلوم ہوا کہ شاہ رخ خان اخبارات میں شائع ہونے والے 281 اور ٹی وی پر نشر ہونے والے 172 اشتہارات میں موجود تھا۔ صرف 2005ء میں ہی اس نے تقریباً 34 مختلف مصنوعات کے اشتہارات میں اداکاری کی۔ شاہ رخ خان صارفین پر مشتمل ایک نئے معاشرے کا استعارہ بن چکا تھا۔

شاہ رخ خان اور عامر خان ان ابتدائی بڑے اداکاروں میں سے تھے جنہوں نے نہایت منظم انداز میں اشتہارات میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔ بعد کے سالوں میں اشتہارات سے حاصل ہونے والے بھاری معاوضوں نے اکثر دیگر اداکاروں کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ بین الاقوامی اداروں نے بڑے اور مشہور اداکاروں کو اس قدر بھاری رقوم کی نہایت فیاضی کے ساتھ پیشکش کی کہ صرف چند ہی اداکار انکار کر سکے۔ 1990ء کی دہائی کے اواخر تک صف اول کے مشہور اور بڑے اداکار ایک اشتہار کے ذریعے دس ملین روپے تک حاصل کر رہے تھے۔ اکثر اداکاروں کے لیے فلموں کے بجائے اشتہارات ان کی آمدن کا بنیادی ذریعہ بن گئے۔ یہ اعداد و شمار نہایت حیران کن تھے۔ اسی تحقیقی ادارے کی اطلاع کے مطابق ٹیلی ویژن پر نشر ہونے والے 1259 اشتہاروں میں سے صرف 15 اشتہاروں میں مشہور اداکاروں نے کام کیا تھا۔ 2005ء تک ٹیلی ویژن پر نشر ہونے والے اشتہارات میں چھ ہزار تک اضافہ ہو چکا تھا جن میں سے صرف 785 اشتہارات میں مشہور چہروں نے اداکاری کی تھی۔

مختلف اور بے شمار اشتہارات میں مسلسل کام کرنے کے باعث شاہ رخ خان ایک ایسی مشہور شخصیت میں ڈھل گیا تھا جس کی موجودگی ہر اشتہار میں لازمی تھی۔ عام طور پر ایک سال بعد اس کی دو یا تین فلمیں نمائش کے لیے پیش کی جاتی تھیں لیکن شاہ رخ خان کی مستند و معتبر شخصیت ٹیلیویژن اور اخبارات کے اشتہارات کے لیے ہر وقت دستیاب تھی۔ عظیم الجثہ اشتہاری تختے ہندوستان بھر میں سڑکوں کے کنارے قطار اندر قطار موجود تھے حتیٰ کہ ہمسایہ ملک پاکستان میں بھی اس سے مختلف صورتحال نہ تھی۔ شاہ رخ خان کا لب و لہجہ امیتابھ بچن کے مانند بہت زیادہ اونچا نہ تھا۔ پرنسٹن یونیورسٹی میں "Shelby Cellom Daris Centre for Historical studies" کے منتظم گیان پرکاش کے مطابق ''اس کی مثبت، مناسب اور مستعد شخصیت بہت زیادہ طور پر مصنوعات کی فروخت کے لیے مددگار ہے۔'' شاہ رخ خان کی شخصیت بہترین طریقے کے ذریعے تیزی سے جدیدیت کی راہ پر چلتے ہندوستان کے لیے ایک ''دیومالائی'' حیثیت رکھتی

ہے جہاں ذرائع ابلاغ خاص طور پر ٹیلیویژن بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ وہ اب محض ایک
اداکار نہیں بلکہ ایک انفرادی مستند شخصیت کا مالک ہے۔

شاہ رخ خان کی انفرادی مستند شخصیت جبلی طور پر شہری تھی۔ شاہ رخ خان نے اپنی شوخ و چنچل شخصیت کو کسی بھی قسم کی آلودگی میں ملوث نہیں کیا۔ فلم فیئر کے ساتھ ایک انٹرویو میں شاہ رخ خان نے کہا: ''1970ء کی دہائی میں ہیرو ایک سماج دشمن کردار کی حیثیت سے موجود تھا لیکن میں نے ایک بہتر دنیا کے لیے اپنے آپ سے وعدہ کیا۔ وہ غنڈوں کے ایک بھرے ہوئے ٹرک سے گھبراتا نہیں ہے بلکہ انہیں سرعام قتل کر دیتا ہے۔'' شہر کے ناظرین وسامعین نے جو نصف دہائی سے سیٹلائٹ ٹیلی ویژن کے عادی تھے، نہایت جوش وخروش کے ساتھ شاہ رخ خان کی مختلف النوع ہیرو پر مبنی شخصیت کو پسند اور قبول کیا لیکن قدرے چھوٹے قصبوں اور گاؤں میں یا تجارتی ماہرین کے مطابق اوسط درجے یا کم درجے کے تجارتی مراکز میں عوام بمشکل ہی ان امریکی نما ہندوستانی سحرانگیزیوں سے منسلک ہو سکتے تھے۔ ہندوستان کی آبادی میں سے تقریباً ایک بلین لوگ ان علاقوں میں رہتے ہیں لیکن اپنی اس کثیر تعداد کے باوجود وہ ہندوستانی فلمی صنعت کے مشہور اداکاروں سے واقف نہیں ہیں۔ شہری علاقوں کے ناظرین اپنے دیہاتی بھائیوں کی نسبت زیادہ قیمت کی ٹکٹ خریدتے ہیں، اسی لیے شہری علاقوں میں قائم سینما گھر فلمسازوں کو زیادہ آمدن مہیا کرتے ہیں خصوصاً یہ رجحان جون 1997ء کے بعد سے بین الاقوامی اداروں کی آمد کے باعث بہت زیادہ ہو گیا۔ اس ابھرتے ہوئے جدید شہر اور بیرون ملک منڈیوں پر ہندوستانی فلموں کی یلغار کے باعث چھوٹے شہروں کے ناظرین ایک خاص حلقے تک محدود ہو گئے۔ اب پردہ سیمیں کا تمام منظر نامہ ناگزیر طور پر شہری ماحول کے مطابق ڈھل چکا تھا۔ (شاہ رخ خان کا کہنا تھا کہ تقسیم کنندگان اب لباس خریدنے سے پہلے اس کی مرضی معلوم کرتے تھے۔ کاروباری لحاظ سے اب ہندوستانی دھوتی کرتہ کی نسبت شاہ رخ خان کی اہمیت مغربی لباس میں زیادہ ہو چکی تھی) ٹیلی ویژن اور بہتر ذرائع مواصلات کے پھیلاؤ کے باعث یہ شہر ایک عالمگیر، شناسا اور روشنیوں کا علاقہ بن چکا تھا۔ یہ شہر اب ایک جدید طرز زندگی کا مرقع بن چکا تھا اور واضح طور پر اسی شہر سے ہی ہندوستانی فلمی صنعت کے سوتے پھوٹتے تھے۔

پردہ سیمیں پر شہری ماحول کی چمک دمک ہندوستانی فلمی صنعت میں تبدیل ہوئے منظر نامے کی عکاس تھی۔ فلمسازوں کی ایک نئی نسل سامنے آ رہی تھی۔ یہ لوگ تعلیم یافتہ شہروں کے پروردہ، فنی مہارت سے آشنا اور ابتداء ہی سے ذہین اور ہوشیار تھے۔ ان کی پرورش تو ہالی وڈ

کی نرسری میں ہوئی تھی لیکن ان کی جڑیں مضبوطی سے بالی وڈ میں قائم تھیں اور ان میں سے بہت سوں کا تعلق فلمی خاندانوں سے تھا۔ سوراج، ادتیا اور کرن یہ تمام افراد اپنی عمر کے بیسویں سال کے لگ بھگ تھے جب انہوں نے نہایت کامیاب ترین فلمیں تخلیق کیں۔ ان کی کامیابی نے فلمی دنیا کا یہ اصول بدل دیا کہ ہدایتکار چالیس سال سے زائد کا ایک مرد ہونا چاہیے جس نے ایک مشہور ہدایتکار کے نائب کی حیثیت سے دہائیوں تک کام کرتے ہوئے کہانی کہنے کا فن سیکھا ہو۔ جلد ہی نوجوانوں نے بھی کامیابیاں سمیٹنا شروع کر دیں۔ چونکہ اب کامیابی کے اصول بدل چکے تھے لہٰذا اب ادھیڑ عمر اور بہت ہی کامیاب ہدایتکار بھی ''نوجوان'' فلم تخلیق کرنے کے خواہاں تھے۔ روایتی طور پر ہر فلمی چیز (بلند لب ولہجہ، دھوم دھام، بھڑکیلا پن اور ضرورت سے زیادہ جذباتی پن) کچرے کے مانند باہر پھینکی جا چکی تھی۔

نہایت تیزی سے جدیدیت کی طرف گامزن ماحول کے باعث ہندوستانی فلمی صنعت اپنے آپ کو بدلنے پر مجبور ہو گئی۔ یہ صنعت اس سے پہلے روایتی طور پر ایک مصروف اور گنجان بازار کے مانند کام کر رہی تھی جہاں انفرادی آجر اپنی اپنی دکانیں سجائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسا کاروبار تھا جو تعلقات کی بنیادوں پر استوار تھا۔ معاہدات کا نام کبھی کبھی سننے میں آتا تھا، وکیلوں کی کہیں شنوائی نہ تھی اور ہالی وڈ کے لحاظ سے ''درمیانی شخص'' کا کہیں وجود نہ تھا۔ 1940ء کی دہائی میں ناجائز اور پوشیدہ دولت ہندوستانی فلمی صنعت میں داخل ہوئی اور نہایت موثر انداز میں سٹوڈیو کا نظام ختم کر دیا گیا۔ فلمسازوں کی طرف سے بڑے اداکاروں اور تکنیک کاروں کو غیر معمولی بھاری معاوضوں کی پیشکش کی گئی۔ پچاس سال بعد بھی 'نقدی' ادائیگی کا قابل ترجیح ذریعہ تھی۔ اداکاروں سے لے کر نچلے عملے کو تنخواہیں زیادہ تر نقد ادا کی جاتی تھیں۔ ہر چند سال بعد محکمہ انکم ٹیکس بڑے اداکاروں کے گھروں پر اچانک چھاپے مارتا اور فلمی رسالے، خواب گاہ کی پوشیدہ چھت یا غسل خانے میں چھپائی ہوئی بے شمار دولت کی برآمدگی کی حیران کن کہانیاں سناتے۔

''نقدی میں لت پت'' معمول اور ماحول میں ''مالی اصول وضوابط'' ایک غلیظ تصور سمجھا جاتا تھا۔ اس نظام کے بجائے دیگر ''تراکیب'' رائج تھیں۔ ایک فلم کے لیے مالی وسائل کے حصول کی خاطر اتنی تخلیقیت درکار تھی جس قدر تخلیقیت اس فلم کو تیار کرنے کے ضمن میں درکار ہوتی۔ صف اول کے فلمساز اپنی شہرت کی بناء پر مالی وسائل اکٹھا کر لیتے لیکن دیگر فلمسازوں کو 36 سے 40 فیصد سالانہ پر مشتمل غیر معمولی شرح سود کے لحاظ سے رقم حاصل کرنا پڑتی یا پھر انہیں

رقم حاصل کرنے کے لیے ان مختلف ذرائع سے رابطہ کرنا پڑتا جو فلمی چمک دمک، کاروباری
افراد، ماہر تعمیرات، جوہری، سوداگر اور بیرون ملک مقیم ہندوستانیوں سے متاثر تھے۔
فلمی کاروبار عام طور پر طاقتور ترین طبقے کی مرضی کے مطابق چلایا جاتا جو "بڑے اداکار"
کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ کسی بھی مخصوص وقت میں تقریباً 200 ہندی فلمیں زیر تکمیل ہوتیں جبکہ بہت
سے مشہور اداکار جو فلم کی نمائش کے پہلے دن ناظرین کو سینما گھروں تک لا سکتے ان کی تعداد
بمشکل پانچ سے زائد تھی۔ بڑے اداکاروں کی مانگ میں اس قدر اضافہ ہو چکا تھا کہ جو فلمساز
ان فلمی دیوتاؤں کے ساتھ معاہدے کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے، ان کی ہر خواہش اور تمنا
کے آگے سر جھکانے پر مجبور تھے۔ مقررہ نظام الاوقات کے مطابق عکس بندی کا آغاز نہ ہوتا
لیکن جب ہیرو پہنچتا تو دن کا نصف، پہر گزر چکا ہوتا یہ ایک معمول تھا۔
لیکن جب ذہین، مستعد اور ہوشیار دوسری نسل نے کاروبار فلم سنبھالا تو فلمی صنعت کے
شعبے میں (حتیٰ کہ تقسیم کاری اور نمائش کاری میں بھی) انقلاب آفرین تبدیلیاں رونما ہو گئیں۔
ہندوستانی فلمی صنعت کا ڈھانچہ یکسر تبدیل ہو گیا۔ اقربا پروری پر مبنی فلمی صنعت کے ناخداؤں
کے ذریعے جاری نظام ختم ہو گیا۔ ہلکی پھلکی تفریح مہیا کرنے پر مبنی یہ ڈھانچہ ان افراد کے ہاتھ
میں آ گیا جنہوں نے اپنے کاندھوں سے لٹکنے والے بیگوں میں "لیپ ٹاپ" رکھے ہوتے تھے
اور وہ ایسے نظر آتے تھے جیسے وہ کسی تجارتی و کاروباری ادارے کے سربراہ اور افسران ہوں۔
"مالی اور تجارتی" اصول وضوابط 'طلسمی گر' قرار پایا تھا۔ اگرچہ ہالی وڈ کی طرز پر فلمی ڈھانچے کو
استوار ہونے کے لیے مزید کئی سال درکار تھے لیکن پھر بھی فلمی صنعت کا ڈھانچہ قدرے ایک
مربوط نظام کے تحت آ گیا تھا۔ اب ہدایتکار زیادہ تر "کہانی کے مسودے" کے مطابق کام
کرنے لگے تھے اور عکس بندی کے دوران مختلف کاغذات پر تحریر شدہ "ہدایات" کو نظر انداز
کرنے لگے تھے۔ بڑے اداکار اگرچہ اب بھی بدنام تھے لیکن اب وہ قدرے زیادہ "منضبط" ہو
گئے تھے اور عکس بندی کے لیے بہت کم تاخیر سے پہنچتے تھے۔ شاہ رخ خان سمیت بے شمار
اداکاروں نے اپنے ذاتی فلمی ادارے قائم کر لیے تھے۔

10 مئی 1998ء کو "انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ" کی وزیر سشما سوراج نے اعلان کیا کہ
بالی وڈ کو "صنعت" کا درجہ دے دیا جائے گا یعنی بالی وڈ کو مواصلات اور فولاد کی صنعتوں کے
مانند صنعت تصور کیا جائے گی۔ تقریباً گزشتہ دو دہائیوں سے ہندوستانی فلموں سے وابستہ افراد
بالی وڈ کو "صنعت" قرار دینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ہندوستانی فلمی دنیا کو "صنعت" کا درجہ

ملنے کے بعد اس صنعت میں بینکوں اور مالیاتی اداروں کے داخلے کی بھی راہیں ہموار ہو گئیں اور
انہوں نے فلمسازی کے میدان میں بھی اپنی پیشہ وارانہ خدمات مہیا کرنا شروع کر دیں۔ اس
سے پہلے بینک اور دیگر مالیاتی ادارے فلم سے وابستہ افراد کو مالی معاونت مہیا کرنے سے
انکاری تھے۔ فلمیں ایک ہوائی کاروبار تھا جس میں رقم کا شمار بہت ہی کم تھا اور نہ ہی کوئی ٹھوس
اور قابل فروخت اثاثے موجود تھے۔ ایک بہت ہی مشہور تقسیم کار نے اس کاروبار کو
"اندھیرے کا دھندہ" کا نام دیا یعنی یہ کاروبار اندھیرے میں انجام پاتا ہے۔ فلم کی نمائش بھی
اندھیرے میں کی جاتی ہے اور رقم کا شمار بھی اندھیرے ہی میں کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی فلموں
کی کامیابی اور ناکامی کی شرح 20:80 ہو گئی۔ ادھار مالی وسائل سے تیارہ کردہ فلم کا اس کے علاوہ
اور کوئی مطلب نہیں تھا کہ فلم کی کامیابی کے بعد آمدن وصول ہونے کا انتظار کیا جائے۔
ہندوستانی فلمی دنیا کو صنعت کا درجہ ملنے کے بعد فلموں کی کامیابی کی شرح میں کوئی فرق
رونما نہیں ہوا لیکن بینکوں کے اس صنعت میں داخلے کے باعث فلم کی تیاری کے تمام مراحل
منضبط صورت اختیار کر گئے۔ اب فلموں کی تیاری اور تکمیل کے لیے وقت کی پابندی ضروری ہو
گئی، عکس بندی کے اوقات کار منظم انداز میں مقرر کیے جانے لگے اور نقدی کے بجائے چیکوں
کے ذریعے ادائیگیاں اور وصولیاں ہونے لگیں۔ 2001ء میں محض چار فلموں کے لیے بینکوں کی
طرف سے مہیا کی گئی رقم 430 ملین روپے تھی۔ 2002ء تک بینکوں سے مالی معاونت حاصل
کرنے والی فلموں کی تعداد 33 تک پہنچ گئی اور بینکوں کی طرف سے مہیا کردہ رقم کی مالیت ایک
اعشاریہ چھہتر بلین روپے تک پہنچ گئی۔ صف اول کے کئی فلمی ادارے مثلاً سبھاش گئی کا "مکتا
آرٹس" اور من موہن سیٹھی کا "ایڈلیبز فلم" مستند کاروباری اداروں میں تبدیل ہو گئے اور سٹاک
ایکسچینج میں بھی ان کے حصص کی تجارت ہونے لگی۔ اس طریقے کے ذریعے فلمسازی کا عمل اور
مراحل زیادہ شفاف ہو گئے۔ بالی وڈ میں موجود غلیظ اور ابتر سٹوڈیو بھی صاف ستھرے ہو گئے،
بے شمار کاروباری مواقع پیدا ہو گئے۔ ہندوستانی فلمی صنعت کے سرکردہ افراد اس صورت حال کو
ایک مثالی اور عملی تبدیلی قرار دینے لگے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اب ہر چیز قابل رسائی ہے۔
ایک انٹرویو میں سبھاش گئی نے کہا: "بڑے کھلاڑی سٹوڈیو بھی قائم کر سکتے ہیں ـــــ اور "تھنک
ٹینک" بنا سکتے ہیں" لیکن اجلے اور استری شدہ لباسوں اور افسرانہ گفتگو میں ایک مایوس کن حوصلہ
شکن جذبہ پوشیدہ تھا۔

❀

چودھواں باب

جرائم پیشہ گروہ اور ہندوستانی فلمی صنعت

ہندوستانی فلمی صنعت کے لیے 1997ء ایک ایسا منحوس سال تھا جب انسانی زندگیاں تشدد اور قتل وغارت کی خوفناک لہروں کے گرداب میں گرفتار ہو چکی تھیں۔ دہشت گردی کا مظاہرہ اس وقت وسط سال میں ہوا جب نہایت تیزی سے ایک ظالمانہ قتل کا ارتکاب ہوا۔ 12 اگست کو گلشن کمار کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ گلشن ایک نہایت تگڑا اور جسیم تاجر تھا جو کسی زمانے میں دہلی کی سڑکوں کے کنارے پھلوں کا رس فروخت کیا کرتا تھا۔ اس نے ''ٹی سیریز'' کے نام کے تحت موسیقی کے ریکارڈ فروخت کرنے کا کاروبار شروع کر دیا تھا اس نے ''حقوق ملکیت'' کے بارے لچکدار قوانین کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے کاروبار کو وسیع کر لیا تھا اور اصل ریکارڈوں کے بجائے اپنے تیار کردہ ریکارڈ کم قیمت کے عوض فروخت کر دیا کرتا۔ گلشن کے حریفوں نے اس پر ''حقوق ملکیت'' قوانین کی خلاف ورزی حتیٰ کہ چربہ ریکارڈ تیار کرنے کے بھی الزامات عائد کیے لیکن اس کے تحت ہندوستانی فلموں کے جو ''صولی کھڑے'' خریدے اور فروخت کیے جاتے ان کا شمار ملک کے بڑے بڑے موسیقی کے اداروں میں ہوتا تھا۔ ''ٹی سیریز'' نے فلمسازی کے میدان میں بہت حد تک کامیابی حاصل کر لی تھی۔ گلشن کمار کو عام طور پر ہندوستان کا ''آڈیو کنگ Audio King'' کہا جاتا تھا۔

اس ''کنگ'' کو ممبئی کی مضافاتی سڑک پر اس وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا جب وہ صبح کی عبادت کے بعد واپس لوٹ رہا تھا۔ ہر صبح جھونپڑیوں سے قدرے دور ایک چھوٹے سے مندر میں گلشن پوجا کے لیے جاتا۔ گلشن نے یہ مندر چار سال قبل دریافت کیا تھا اور اپنی گرہ سے سنگ مرمر لگوا کر اسے خوبصورت اور دلکش بنایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تباہی و بربادی کا ہندو دیوتا اس کا سرپرست ہے لیکن اس صبح جب تین رائفل برداروں نے گولیاں چلائیں، کوئی معجزہ رونما نہ ہوا۔ حملہ آوروں نے نہایت بے رحمی سے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ خون میں لت پت گلشن

گھر گھر سے مدد طلب کرتا رہا لیکن اس غلیظ اور پسماندہ بستی کے خوفزدہ مکینوں میں سے کسی نے بھی دروازہ نہ کھولا۔ بالآخر وہ ایک مشترکہ غسل خانے کی دیوار کے ساتھ لگ کر ڈھیر ہو گیا۔ گلشن کو سولہ گولیاں لگی تھیں اور جب اسے ہسپتال لے جایا گیا تو اس مردہ قرار دے دیا گیا۔ ذرائع ابلاغ کے مطابق گزشتہ مئی سے سلیم اس سے سو ملین روپے کا تقاضا کر رہا تھا بصورت دیگر اسے ہلاک کر دیا جاتا جب گلشن نے انکار کر دیا تو سلیم نے یہ ثابت کرنے کا فیصلہ کر لیا کہ وہ خالی خولی دھمکیاں نہیں دے رہا تھا۔

اس قتل کے باعث ہندوستانی فلمی صنعت میں صدمے اور خوف کی سی لہر پیدا ہو گئی۔ ایک امیر کبیر کاروباری شخص کو آوارہ کتے کے مانند ایک سڑک پر قتل کر دیا گیا۔ ان واقعات سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ جرائم پیشہ افراد کسی کو کہیں بھی قتل کر سکتے ہیں۔ پولیس نے یہ شبہ ظاہر کیا کہ گلشن کے قاتل کرائے کے قاتل ہیں جن کی خدمات حال ہی میں حاصل کی گئی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو محض پانچ ہزار روپے ادا کیے گئے ہیں۔ ممبئی کی اس صورتحال میں ایک قاتل کا معاوضہ ایک فائیو سٹار ہوٹل میں کھانے کی قیمت سے بھی کم ہے۔ اس کے بعد آنے والے ہفتوں میں اخبارات یہ اندازہ لگانے کے ضمن میں آپس میں مقابلے کرتے رہے کہ اگلا شکار کون ہو گا جبکہ سیاستدانوں کا خیال تھا کہ فلمی صنعت اور قاتلوں و بدمعاشوں کے ٹولے کے درمیان کسی نہ کسی طرح رابطہ ضرور موجود ہے۔ ''ڈاکنہا ایسوسی ایٹس'' نامی ایک اشتہاری ادارے نے ''ایمول بٹر'' کے لیے ایک اشتہاری تختہ تیار کیا جس پر ''فلم شوٹنگ "Film shooting'' اور کلر ٹیسٹ Killer Test'' پر مبنی ایک ذومعنی پھبتی موجود تھی۔

لیکن فلمبندی اور عکس بندی کے اندرونی جائے مقامات پر اب افراتفری اور ابتری کا راج تھا۔ صف اول کے اکثر اداکاروں اور اداکاراؤں کو پولیس کا تحفظ فراہم کر دیا گیا تھا۔ دیگر متعلقہ افراد نے نجی طور پر اپنی حفاظت اور تحفظ کا اہتمام کیا تھا۔ راتوں رات دفتر اور گھر چھوٹے چھوٹے قلعوں میں تبدیل ہو چکے تھے جہاں نگرانی کے لیے جدید آلات نصب کیے گئے تھے۔ ہندوستانی فلمی صنعت کی روایتی چمک دمک اور زندہ دلی کے بجائے وہاں مایوسی اور افسردگی کی حکمرانی تھی۔ جلد ہی چمکتی دمکتی اور روشنیوں سے مزین ہندوستانی فلمی دنیا میں زیادہ تر روشنیاں اور چمک دمک ماند پڑ گئی۔ مختلف تقریبات اور فلموں کی افتتاحی نمائشیں منسوخ کر دی گئیں۔ فلموں کی کامیابی پر اخبارات میں ایک پورے صفحے پر مشتمل مبارکبادی پیغامات جو معمول بن

چکے تھے، بند ہو گئے۔ اداکار اور اداکارائیں جو نہایت شوق سے اخبارات و رسائل میں شائع
کروانے کے لیے تصویریں بنواتے تھے انہوں نے ذرائع ابلاغ کو فاصلے پر رکھنا شروع کر دیا۔
''ہم کو نظر نہیں آنا چاہیے'' یہ فقرہ فلم سے متعلق ہر فرد کا تکیہ کلام بن گیا۔ چونکہ جرائم پیشہ افراد عام
طور پر موبائل فون کے ذریعے لوگوں سے رابطہ کرتے تھے اس لیے لوگوں نے نہایت تیزی سے
اپنے موبائل نمبر تبدیل کرنا شروع کر دیے یا پھر لوگ اکثر اپنے فون بند ہی رکھتے۔ مالی شعبے
میں افراتفری کا سا عالم برپا ہو گیا۔ اب بیمہ کرنے والے ادارے ہندی فلموں کے لیے اپنی
خدمات پیش کرنے سے ہچکچانے لگے کیونکہ عکس بندی کے دوران کوئی بھی اداکار گولی کا نشانہ
بن سکتا تھا۔ ایک مشہور سرمایہ کار نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ''میں آئندہ پندرہ دن تک
صورتحال کا جائزہ لوں گا، اس دوران اگر کوئی شخص قتل نہ ہوا تو میں پھر اپنا کاروبار شروع کروں
گا۔'' ہندوستانی فلمی صنعت جس نے حال ہی میں ''صنعت'' کا درجہ حاصل کیا تھا اور عالمگیر سطح
پر اس کی پہچان کا آغاز ہوا تھا، ممبئی کے بدنام زمانہ جرائم پیشہ گروہوں کے ہاتھوں یرغمال بن
چکی تھی۔

اس شہر میں یہ صورت حال جرائم پیشہ گروہوں اور ہندوستانی فلم صنعت کی طویل اور رنگین
تاریخ کا ایک نیا باب تھا۔ اس تعلق کا آغاز 1970ء کی دہائی میں باہمی افسوں کے ذریعے ہوا۔
شروع شروع میں منظر عام پر آنے والے جرائم پیشہ گروہوں کے سرغنہ حاجی مستان اور کریم
لالہ ہندوستانی فلمی اداکاروں اور اداکاراؤں کی عظیم اور مشہور حیثیت سے بہت متاثر تھے۔
ہندوستانی فلمی صنعت بھی ان بدمعاشوں کے سحر میں گرفتار ہو چکی تھی۔ یہ لوگ جنہیں اپنی زندگی
کی قطعی پرواہ نہیں تھی۔ ان میں ایسی جرات و ہمت موجود تھی کہ انہوں نے بدعنوان نظام پر تابڑ
توڑ حملے شروع کر دیئے اور طاقت کے متوازی مراکز قائم کر لیے۔ انہیں ایک عام مجرم نہیں بلکہ
جدید ''رابن ہڈ'' سمجھا جانے لگا تھا۔ مستان اور لالہ کو ''مہورت'' اور دیگر فلمی تقریبات میں مدعو
کیا جاتا تھا جہاں اداکاروں کے ساتھ ان کی تصاویر بنائی جاتیں۔ انہیں ''بھائی'' کہا جاتا تھا۔

1980ء کی دہائی میں مختلف جرائم پیشہ گروہ ایک شخص داؤد ابراہیم کی سربراہی میں متحد ہو
گئے۔ ایک پولیس کانسٹیبل کا بیٹا داؤد کچھ ایسا خطرناک نہیں دکھائی دیتا تھا لیکن اس کی بے ضرر
اور شائستہ شخصیت کے پیچھے ایک ماہر مجرم کی شخصیت پوشیدہ تھی۔ 1984ء میں جب داؤد کو
ضمانت پر رہا کر دیا گیا تو وہ فرار ہو کر دوبئی چلا گیا لیکن فاصلے کی اس دوری کے باعث اس کی

طاقت میں کمی واقع نہ ہوئی۔ اس کے بھائی ممبئی میں زیر زمین کارروائیوں کی نگرانی کر رہے تھے
جبکہ داؤد نے دوبئی سے فون کے ذریعے اپنی خون ریز مشین کو متحرک رکھا ہوا تھا۔ چار سال کے
اندر ہی وہ ممبئی کا دولت مند ترین شخص بن چکا تھا اور اس نے پندرہ بلین روپے مالیت کی ایک
سلطنت قائم کر لی جس کے ذریعے تعمیراتی شعبے کے علاوہ منشیات، سونے کی غیر قانونی تجارت
اور بھتے کی وصولی کا سلسلہ قائم تھا۔ داؤد نے اس متحد جرائم پیشہ گروہ کی از سر نو تنظیم کی اور اسے
بین الاقوامی کاروباری اور تجارتی ادارے کی ایک بے رحم مجرمانہ شکل میں تبدیل کر دیا۔ اس کا
گروہ جس نے سیکڑوں بے روزگار اور مفلس نوجوانوں کو اپنے پاس بھرتی کیا ''ڈی کمپنی''
کہلانے لگا۔

جرائم پیشہ گروہوں کے ابتدائی سرغنوں کے مانند داؤد بھی فلمی ستاروں کی چمک دمک سے
بہت متاثر تھا۔ اس نے دوبئی آنے والے اداکاروں کی نہایت شاندار انداز میں خاطر مدارت
اور میزبانی کی۔ وہ نہایت فیاضی کے ساتھ فلمی ستاروں کو قیمتی تحفے دیتا اور انہیں مہنگی خریداری
کے لیے رقم مہیا کرتا۔ ممبئی کے گلی کوچوں میں داؤد کے شاندار گھروں، تقریبات اور فلمی ستاروں
کے ساتھ ملاقاتوں کا چرچا ہونے لگا۔ اس ضمن میں ہندوستانی فلمی صنعت نے بھی برابر کا حصہ
ڈالا۔ داؤد بھائی ایک طاقتور محسن سمجھا جانے لگا تھا۔ لوگ اس کا نام احترام سے لیتے تھے جو
لوگ اس سے واقف تھے اور جو لوگ اس سے آشنا نہیں تھے، ان کے دل میں داؤد کے لیے
نہایت عزت و احترام تھا۔ داؤد کے متعلق یہ افواہ بھی بڑے زور شور سے پھیلی تھی کہ وہ مندا کنی
نامی ایک اداکارہ کے عشق میں مبتلا ہے۔ اس کے بھائی نورا نے جو خود کو شاعر کہتا تھا، چند فلموں
کے لیے نغمے بھی لکھے تھے۔ بالآخر اور ناگزیر طور پر یہ معاشرتی میل ملاپ ایک کاروباری
حیثیت اختیار کر گیا۔ سب سے پہلے تو کیبل اور ویڈیو کے سرقے کی طرف توجہ مبذول کی گئی
اور پھر ہندوستانی فلمی صنعت کے مرکزی شعبے فلمسازی میں نقب لگائی گئی۔ 1990ء کی دہائی کے
اوائل میں یہ سرگوشیاں کی جاری تھیں کہ کم از کم پندرہ سے بیس فلموں میں دوبئی کے راستے سرمایہ
کاری کی جا رہی ہے۔

12 مارچ 1992ء کو ممبئی میں تیرہ طاقتور بموں کے دھماکے ہوئے۔ دو سو ستاون افراد ہلاک
اور سات سو تیرہ زخمی ہوئے اور 267 ملین مالیت کی املاک تباہ ہو گئیں۔ خفیہ اداروں کی اطلاع
کے مطابق تباہی کا یہ تمام منصوبہ داؤد کا تیار کردہ تھا۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے ممبئی میں ہونے

والے یہ دھماکے دائیں بازو کے ہندوؤں کی جانب سے ایودھیا میں بابری مسجد کے انہدام اور اس کے بعد ممبئی میں ہونے والے فسادات کے جواب میں تھے جن کے دوران سیکڑوں مسلمان ہلاک اور بے گھر ہو گئے تھے۔ داؤد کے دل میں سلگنے والی تخریبی چنگاری راتوں رات بھڑک اٹھی تھی۔ جرائم پیشہ گروہ کا یہ سرغنہ اب دہشت گرد بن چکا تھا۔

پھر پانچ ہفتے بعد ہندوستانی فلموں کے ایک بہت بڑے اداکار سنجے دت کو عدالتی تحویل میں دے دیا گیا۔ ممبئی پولیس نے اس کے پاس سے اے کے 56 بندوق اور دستی بم برآمد کر لیے تھے۔ یہ ہتھیار اسلحے کی اس کھیپ کا ایک حصہ تھے جو ان دھماکوں میں استعمال ہوئے تھے۔ سنجے دت پر اس سازش میں شریک ہونے اور غیر قانونی ہتھیار اپنے پاس رکھنے کا الزام عائد کیا گیا۔ 2006ء میں اسے اسلحہ ایکٹ کی خلاف ورزی کا مرتکب ٹھہرایا گیا لیکن سازش اور دہشت گردی کے الزامات سے بری قرار دے دیا گیا۔ اب ہندوستانی فلمی صنعت جرائم پیشہ گروہوں سے اس طرح خوف زدہ تھی جیسے ایک کوڑھ شدہ شخص اپنے اردگرد کے ماحول سے خوفزدہ ہوتا ہے لیکن اب دو دہائیوں پر مشتمل ''غیر قانونی رومان'' کے بعد اب دوبارہ اعلیٰ اقدار کا حصول بہت مشکل ہو گیا تھا۔

ممبئی میں ہونے والے ان دھماکوں کے باعث یہ جرائم پیشہ گروہ مذہبی بنیاد پر تقسیم ہو گیا۔ داؤد کا نہایت ہی قابل اعتماد ساتھی چھوٹا راجن گروہ سے علیحدہ ہو گیا اور اس نے ایک متوازی ''ہندو جرائم پیشہ گروہ'' کی بنیاد رکھی اور خود اس گروہ کا سرغنہ بن گیا۔ ہندوستانی حکام نے حکومت دوبئی پر انتہائی دباؤ ڈالا کہ داؤد کو ملک بدر کر دیا جائے۔ چونکہ اب داؤد بین الاقوامی سازشوں میں مصروف تھا لہٰذا اس نے اپنے ایک اور قابل اعتماد ساتھی ابو سلیم کو ممبئی میں اپنا قائم مقام مقرر کر دیا۔

ابو سلیم نے ''ڈی کمپنی'' کے ایک معمولی کارکن کی حیثیت سے کام شروع کیا لیکن بم دھماکوں کے بعد اس کا نام گھر گھر گونجنے لگا۔ پولیس کی تفتیش سے معلوم ہوا کہ ابو سلیم نے اہم ہتھیاروں کی کھیپ پہنچانے میں مدد کی تھی اور سنجے دت کو بھی اسی نے ہتھیار مہیا کیے تھے لیکن اس معاملے کے ایک اور بڑے مجرم کی حیثیت سے اس کی دہشت گردانہ کارروائیوں کا انکشاف ہونے سے قبل ہی وہ دوبئی فرار ہو گیا۔ (بالآخر 2001ء میں وہ پرتگال میں گرفتار ہو گیا اور اسے ہندوستانی حکومت کے حوالے کر دیا گیا) سلیم معاشی میل ملاپ اور بڑے اداکاروں

سے دوستی کا نہ تو قائل تھا اور نہ ہی یہ امر اس کے لیے باعث اطمینان تھا وہ تو مالی دھونس کا خواہاں تھا۔ لہٰذا سلیم نے ہندوستانی فلمی صنعت میں ڈرا دھمکا کر رقم وصول کرنے کی روایت کا آغاز کیا۔

7 جون 1997ء کو ایک ایسے فلمساز کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا جو ابھی ابھی فلمی دنیا میں داخل ہوا تھا۔ اس کا نام جاوید ریاض صدیقی تھا۔ یہ قتل مبینہ طور پر سلیم کا ہندوستانی فلمی صنعت کا پہلا شکار تھا۔ یہ اس امر کی پہلی علامت تھی کہ ہندوستانی فلمی صنعت کا مجرموں کے ساتھ رومان خوفناک حد تک غلط پہلو اختیار کر چکا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ صدیقی کو اس لیے ہلاک کیا گیا کہ اس نے سلیم کی خواہش کے خلاف اپنی فلم کی اداکارہ کو تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس فلم کا نام ''تووش میں کنہیا'' تھا۔ اس اداکارہ نے سلیم سے شکایت کی۔ تین سال بعد مکیش نامی ایک اور فلمساز کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا لیکن یہ لوگ فلمی صنعت کے معمولی فلمساز تھے اور ان کی شہرت کچھ اچھی نہ تھی اور فلمی صنعت کو ان کی کمی کبھی بھی محسوس نہ ہوئی۔

بہر حال ہندوستانی فلمی صنعت نے اس سنجیدہ اور گھمبیر صورتحال پر اس وقت توجہ مبذول کی جب 21 جولائی 1997ء کو پانچ مسلح غنڈے فلمساز راجیو رائے کے دفتر میں گھس آئے اور گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ اس کا باپ گلشن رائے ایک کامیاب اور مشہور فلمساز تھا۔ راجیو کی تیار کردہ ایک فلم Gupt: The Hidden Truth کی حال ہی میں نمائش ہوئی تھی اور اس فلم نے بہت زیادہ کامیابی حاصل کی تھی۔ فلم کی نمائش سے قبل راجیو کو ایک مخصوص رقم ادا کرنے کے لیے دھمکی آمیز فون موصول ہو رہے تھے۔ اس نے پولیس کے پاس شکایت بھی درج کرائی تھی اور اسے ایک محافظ مہیا کر دیا گیا تھا۔ محض اس محافظ اور دفتر کے عملے کی بروقت مداخلت کے سبب راجیو محفوظ رہا۔ اس نے فوراً اپنا صدر دفتر لندن منتقل کر لیا۔ گلشن کمار اس قدر خوش قسمت ثابت نہ ہوا۔

زبردستی اور ڈرا دھمکا کر رقم وصول کرنا ایک ایسا سادہ اور آسان ترین طریقہ ہے جس کے ذریعے دولت اکٹھا کی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے محض چند دھمکیوں کی ضرورت پیش آتی ہے جو فون کے ذریعے نہایت آسانی سے دی جا سکتی ہیں۔ عرف عام میں اسے ''ڈم دنا'' کہا جاتا تھا۔ یعنی شکار کو اس وقت خوفزدہ کر دیا جائے کہ وہ رقم ادا کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اس ضمن میں یہ طریقہ اپنایا جاتا تھا: ایک شخص فون کے ذریعے شکار سے رابطہ قائم کرتا اور خود کو ''بھائی کا آدمی''

کی حیثیت سے متعارف کراتا اور اسے ایک نمبر دے دیتا جس کے ذریعے وہ جوابی فون کر سکے جب شکار جوابی فون کرتا تو وہ خود کو سلیم سے بات کرتے ہوئے پاتا۔ جو ناگزیر وجوہات کی بناء پر خود کو ایک تیسرا شخص ''کپتان'' ظاہر کرتا۔ کپتان نے نقدی کا مطالبہ کیا تھا۔

اگر ''شکار'' کچھ پس و پیش کرتا تو سلیم اسے یاد دلاتا کہ ''مافیا'' کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ سلیم اسے یقین دلاتا کہ پولیس اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی کیونکہ ''ڈی کمپنی'' نے رام داس نامی ایک سیاستدان کو قتل کر دیا تھا جو اپنی کار میں اپنے محافظ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اخبارات کی اطلاعات کے مطابق محافظ کو حرکت کرنے کی بھی مہلت نہ مل سکی اور وہ اپنی بندوق بھی استعمال نہ کر سکا۔ گلشن کمار کے بہیمانہ قتل کے بعد اکثر ''شکاروں'' نے اپنی اپنی زندگیاں بخوشی سلیم کے پاس رہن رکھ دیں۔ حتیٰ کہ جن لوگوں نے پولیس کے پاس شکایات درج کروائی تھیں یا جن کو پولیس نے تحفظ فراہم کیا تھا انہوں نے بھی سلیم کو رقم ادا کر دی۔ یہ افواہ وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی تھی اور لوگ اسے سچ ہی سمجھتے تھے کہ سلیم دھمکیوں کے ذریعے رقم وصول کرنے کا کاروبار نیم خود مختاری کے عالم میں انجام دے رہا ہے اور گلشن کمار کے قتل سے داؤد لاعلم ہے۔ ممبئی پولیس کے مطابق سلیم نے ہندوستانی فلمی صنعت سے دھمکیوں کے ذریعے لاکھوں روپے بٹورے۔ بالآخر 1998ء میں سلیم اس جرائم پیشہ گروہ سے الگ ہو گیا اور اپنا ایک علیحدہ گروہ قائم کر لیا جس کا سرغنہ وہ خود تھا۔

سلیم بھی دھمکیوں کے ذریعے رقم اینٹھنے کا ماہر تھا۔ اس نے اداکاروں، اداکاراؤں، تکنیک کاروں حتیٰ کہ انتظام کاروں اور پھر فلم بنانے کی لیبارٹری کے مالکوں کو بھی دھمکیاں دیں اور انہیں بری طرح خوفزدہ کیا۔ جنوری 1997ء میں کسی وقت اس نے شاہ رخ کی جانب اپنی توجہ مبذول کی۔ ایک دن ہدایتکار مہیش بھٹ کو پولیس کے ایک اعلیٰ افسر راکیش ماریہ کا فون موصول ہوا: ''وہ لوگ شاہ رخ خان کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اسے تلاش کرو کہ وہ کہاں ہے اور اسے فوراً بیرونی عکس بندی پر جانے سے روک دو۔'' راکیش ایک بہت ہی ہوشیار اور ذہین شخص تھا اور اپنے ''مخبری'' کے قابل اعتبار نظام کے لیے بہت مشہور تھا۔ ایک مخبر نے اسے شاہ رخ خان کو قتل کرنے کے منصوبے سے آگاہ کر دیا۔ اسی وقت راکیش نے مہیش بھٹ سے رابطہ کیا جو شاہ رخ کے ساتھ دو فلمیں بنا رہا تھا۔ مہیش نے فوراً ہی شاہ رخ خان کو فون کر دیا جب مہیش نے شاہ رخ خان کو بتایا کہ کرائے کا ایک قاتل اسے تلاش کر رہا ہے اور اسے مزید ہدایت ملنے تک

خود کو محدود کر لینا چاہیے۔ شاہ رخ خان کے ہونٹوں پر ایک مختصر تلخ ہنسی نمودار ہو گئی۔ وہ حیران تھا کہ اسے کون اور کیوں قتل کرنا چاہتا ہے؟

بم دھماکوں کے معاملے میں راکیش تفتیشی عملے کا سربراہ تھا۔ اسی اثناء میں راکیش کو اطلاع ملی کہ سلیم نے شاہ رخ خان کو قتل کرنے کا حکم اس لیے دیا ہے کہ اس نے ایک ایسے فلمساز کی فلم میں کام کرنے سے انکار کر دیا جو سلیم کے بہت قریب ہے۔ سلیم کے دیگر شکاروں کے برعکس شاہ رخ خان کو سلیم یا اس کے کسی اہلکار کی طرف سے فون موصول نہیں ہوا تھا۔ درحقیقت راکیش کے مطلع کرنے سے قبل شاہ رخ خان کو قطعی علم نہیں تھا کہ وہ ''مافیا'' کی نظروں میں ہے۔ اب شاہ رخ خان پریشان اور مضطرب ہو گیا تھا۔ جب مہیش اور وہ اکٹھے کار میں بیٹھ کر جنوبی ممبئی میں واقع راکیش کے دفتر جا رہے تھے تو راستے میں شاہ رخ خان نے مذاق مذاق میں اپنے ہدایتکار سے پوچھا کہ کیا وہ اس کے ساتھ کار میں بیٹھے ہوئے خوفزدہ تو نہیں ہے کیونکہ سڑک پر آمدورفت کے انتظام کے لیے نصب کسی بھی اشارے پر رکنے کے دوران قاتل انہیں ہلاک کر سکتے ہیں۔ مہیش شاہ رخ خان کے اس مذاق پر ہنس دیا۔

بہر حال راکیش اب بہت زیادہ سنجیدہ تھا۔ بم دھماکوں کے متعلق تفتیش کے دوران اسے مافیا کے اعلیٰ سطحی افراد اور معاملات کے متعلق بھی اطلاعات حاصل ہوئی تھیں۔ یہ کوئی عام بدمعاش اور مجرم نہیں تھے۔ یہ وہ ظالم قاتل تھے جنہوں نے نہایت سنگدلی اور بے رحمی سے ہندوستان کے معاشی اور مالی دارالحکومت کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اس منصوبے پر عمل بھی کر ڈالا تھا۔ یہ لوگ نرمی کے مستحق نہیں تھے۔ دفتر میں راکیش اور شاہ رخ خان کے درمیان حال ہی میں واقع ہونے والے کسی معاملے کے متعلق گفتگو ہوئی جس کے باعث شاہ رخ خان کو قتل کیا جا سکتا تھا۔ کیا حال ہی میں شاہ رخ خان کا کسی سے جھگڑا ہوا؟ کیا اس کا کسی کے ساتھ مفادات کے معاملے پر کوئی تنازعہ ہے؟ کیا وہ کسی کے ساتھ رومانی تعلقات میں ملوث ہے؟ یا اس نے حال ہی میں کسی کی پیشکش مسترد کی ہے؟ کچھ اداکاراؤں کے متعلق معلوم ہوا تھا کہ ان کے ''ڈی کمپنی'' کے ساتھ تعلقات ہیں اور ان کے سامنے ''ناں'' کہنا بھی اسی قدر خطرناک ہے جس طرح ان کے سامنے ''ہاں'' کا اظہار خطرناک ہے۔ اس بات چیت کا کچھ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ شاہ رخ خان نے اندازہ لگایا کہ شاید کسی کو غلط فہمی ہوئی ہے شاید سلیم شاہ رخ مرزا کو قتل کرنا چاہتا ہے جو کسی زمانے میں فلمساز تھا لیکن راکیش نے اسے یقین دلایا کہ ''مافیا'' کو کبھی بھی غلط

بھی نہیں ہو سکتی۔

پھر اگلے ماہ انتظار کی ایک جاں گسل کیفیت نے شاہ رخ خان کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھا۔ شاہ رخ خان نے اپنی نقل و حرکت زیادہ سے زیادہ محدود کر دی۔ ہر روز فلمبندی کے لیے جاتے وقت وہ مختلف کاروں اور راستوں کے ذریعے سفر کرتا۔ اگرچہ جرائم پیشہ افراد نے کم ہی بیویوں اور بچوں کو اپنا نشانہ بنایا، گاؤری کو اپنے گھر میں محدود رہنے کی ہدایت کر دی گئی۔ مختلف دوست شام کو انہیں ملنے آتے تا کہ وہ تنہائی محسوس نہ کریں لیکن پھر بھی پریشانی اور اضطراب میں کمی واقع نہ ہوئی لیکن شاہ رخ خان بذات خود خوفزدہ نہیں تھا۔ "مجھے خود پر ایک عجیب سا اعتماد تھا کہ مجھے ہلاک نہیں کیا جائے گا۔" لیکن پریشانی اور اضطراب کے باعث گاؤری کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی۔ اسی دوران اس جوڑے نے کرکٹ کے ایک مشہور کھلاڑی کی شادی میں شرکت کی۔ جب ایک پرستار نے اس کے دستخط حاصل کرنے کے لیے قلم نکالا تو شاہ رخ خان نے اس قلم کو پستول سمجھتے ہوئے گاؤری کو پرے دھکیل دیا۔ واپسی پر جب بھی ان کی کار آمدورفت کے اشارے پر رکتی محافظ ہوشیار ہو جاتا اور اس کا پستول اچھل کر اس کے ہاتھ میں آ جاتا۔

موہن بھائیز ایک طویل القامت شخص تھا جس کے بال سخت اور نگاہیں اس قدر متجسس اور ہوشیار کہ کسی کا ان نظروں سے بچ نکلنا بہت مشکل تھا۔ "سپیشل" "آپریشنز سکواڈ" کے ایک کمانڈو کی حیثیت سے وہ مار دھاڑ اور قتل و غارت کے بہت سے مناظر کا گواہ تھا۔ اس نے ہندوستانی فلمی صنعت کے دیگر افراد کے ساتھ حفاظتی فرائض انجام دیے تھے لیکن اسے کبھی شاہ رخ جیسے مشہور شخص کے ساتھ اس قسم کے فرائض ادا نہیں کرنے پڑے تھے۔ موہن سادہ لباس میں ملبوس اور اپنا پستول پوشیدہ رکھتا تھا۔ جب بھی کسی فلم کی عکس بندی ہو رہی ہوتی تو وہاں عملے کے افراد، ملاقاتی، افراد خانہ اور دوست موجود ہوتے اور ان میں سے اکثر یہ سمجھتے تھے کہ یہ شخص ایک بڑے اور عظیم اداکار کا "دم چھلا" ہے لیکن موہن شاہ رخ خان سے کبھی بھی پانچ فٹ سے زیادہ دور نہیں ہوا۔ وہ بلاتکان ہر اس شخص کو اپنی نظروں میں رکھتا جس سے شاہ رخ خان کی ملاقات ہوتی۔ ابتداء میں تو موہن قدرے ہچکچاتا تھا اور اداکاروں سے قدرے پس و پیش کرتا تھا لیکن جب دن بغیر کسی مہم اور واقعے کے گزرنے لگے تو پھر وہ اپنے اس آرام دہ فرائض میں مست ہو کر کاہل ہو گیا۔ گھر سے سٹوڈیو جاتے ہوئے طویل سفر کے دوران شاہ رخ خان اور

موہن کے درمیان تعلیم، ادب اور ملکی حالات بارے تفصیلی گفتگو ہوتی۔

بہرحال جب شاہ رخ خان لیش چوپڑا کی فلم "دل تو پاگل ہے" کے لیے اپنا کردار عکس بند کروا رہا تھا۔ فلم کی کچھ عکس بندی "کھنڈالا" نامی ایک قریبی سیاحتی مقام پر بھی ہوئی تھی۔ ایک دن کار میں گھر واپس آتے ہوئے شاہ رخ خان کو سلیم کا پہلا فون موصول ہوا۔ ممبئی کی روایتی بازاری زبان میں سلیم پوچھ رہا تھا "ہاں، کیا چل رہا ہے؟" شاہ رخ خان نے پوچھا: "کون بات کر رہا ہے؟" یہ سوال سن کر دوسری طرف سے گالیوں کا طوفان سنائی دے رہا تھا۔ شاہ رخ خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر شاہ رخ نے نہایت شائستہ اور دانستہ طور پر فون کرنے والے سے مختلف الفاظ استعمال کرتے ہوئے انگریزی میں پوچھا: "جناب! کیا بات ہے؟" سلیم نے جواب دیا کہ وہ اس سے اس لیے ناراض ہے کہ اس نے ایک ایسی فلم میں کام کرنے سے انکار کر دیا جس کا فلمساز ایک مسلمان ہے اور مسلمان کی حیثیت سے اسے اپنی برادری کو کچھ نہ کچھ معاونت مہیا کرنی چاہیے۔"

ہندوستانی فلمی صنعت کی تاریخ گواہ ہے کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اس قسم کا خطرناک تناؤ موجود نہیں رہا جو کہ باقی ماندہ ہندوستان کا خاصا رہا ہے۔ امن و امان کے قدیم زمانے سے لے کر زمانہ جدید تک ہندو اور مسلمان بغیر کسی تنازعے اور اختلاف کے کام کر رہے تھے کیونکہ فلمیں ہی ان کا دین، ایمان اور خدا تھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت شاہ رخ خان کئی ایک مسلمان ہدایتکاروں کے ساتھ کام کر رہا تھا اور اس نے یہ بات سلیم کو بتا دی۔ مصور خان، عباس مستان، عزیز مرزا اور مہیش کی ماں بھی مسلمان تھی۔ سلیم نے بہرحال شاہ رخ خان کے اس استدلال کو قبول کر لیا اور فیصلہ کیا کہ وہ اس کی جان بخش دے: "لوگ بولتے ہیں کہ تو بہت پراوڈی (مغرور) ہے لیکن تو بندہ شریف ہے۔ ابھی پولیس کی ضرورت نہیں تیرے کو میں نہیں ماروں گا۔"

بہرحال پولیس کو سلیم کے اس وعدے پر اعتبار نہیں تھا۔ موہن بھائیز تقریباً ایک ماہ سے زائد عرصہ تک اس کے ساتھ رہا۔ اس کے بعد خودکار ہتھیاروں سے مسلح بہت سے سپاہی مختلف عرصوں کے لیے شاہ رخ خان کے محافظ کی حیثیت سے متعین کیے گئے۔ سلیم بھی شاہ رخ خان کو مسلسل فون کرتا رہا۔ اب وہ ایک ایسے پرانے دوست کی حیثیت سے اس کے ساتھ گپ شپ کرتا تھا جس کے پاس ملاقات کے لیے وقت نہیں۔ فون پر اس گفتگو کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ

شاہ رخ خان کو نظر میں رکھا جائے۔ سلیم شاہ رخ خان کے ساتھ ہلکی پھلکی گفتگو کرتا اور دوران گفتگو اس سے دیگر اداکاروں اور اداکاراؤں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ شاہ رخ کو یہ تفصیل بتا کر متاثر کرنے کی کوشش کرتا کہ کسی مخصوص وقت پر ایک مخصوص اداکار کہاں ہے، کس شخص سے ملاقات کر رہا ہے اور اس کے محافظ کہاں کھڑے ہیں۔ وہ پولیس کی طرف سے شاہ رخ خان کی حفاظت کی کوششوں کا مذاق اڑاتا۔ شاہ رخ نے ایک دفعہ بتایا: ''وہ مجھے بتاتا کہ وہ مجھے دیکھ سکتا ہے یہ تو ایسا ہی تھا کہ جیسے میں ایک دوربین کی نظروں میں ہوں۔ یہ بہت ہی مایوس کن اور خطرناک ہے۔'' شاہ رخ خان راکیش کی ہدایات پر عمل کرتا رہا: ''گفتگو کرتے وقت لہجہ مہذب اور شائستہ ہونا چاہیے نہ تو معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور نہ ہی اپنی طرف سے کوئی معلومات ظاہر کی جائے۔'' لیکن کافی دفعہ گفتگو کے بعد اس کے الفاظ کے باعث وہ طیش میں آ جاتا اور حیران ہوتا کہ اس نے جائز بات کہنے یا امن برقرار رکھنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ ''میں اس قدر بہادر نہیں ہوں کہ میں یہ کہوں کہ میں ان افراد سے خوفزدہ نہیں ہوں بہرحال مجھے خوف سے نفرت ہے!''

لیکن ان گھمبیر حالات کے باعث بھی شاہ رخ خان نے اپنا کام متاثر نہیں ہونے دیا۔ مکیش کی فلم "Duplicate" کے کئی مناظر ممبئی کی سڑکوں پر فلم بند کیے گئے، علاوہ ازیں کئی ایسے مناظر بھی فلمانا مقصود تھے جن میں مزاحیہ لڑائی بھڑائی کا تاثر موجود تھا۔ مکیش نے کہا: ''شاہ رخ خان نے ''موت سے رومان'' پر مبنی رویے کا مظاہرہ کیا۔ حالانکہ ایک تلخ حقیقت اس کے دروازے پر دستک دے رہی ہوتی تھی لیکن اس نے مزاحیہ مناظر بھی نہایت توجہ اور انہماک کے ساتھ فلم بند کروائے۔'' شاہ رخ خان نے میک اپ سے مزین نمایاں چھائیوں والی ایک عورت کا بھیس بدلنے میں یا مکمل لباس پہنے ہوئے ربڑ کی بطخ پکڑنے کے لیے پانی کے ٹب میں چھلانگ لگانے میں ذرہ بھر بھی توقف نہیں کیا جبکہ اس دوران خطرناک ہتھیار سے مسلح پولیس کا ایک سپاہی اس کے پاس ہی کھڑا تھا۔ شاہ رخ خان نے کہا کہ اس نے اپنی مہارت اور صلاحیت کے ذریعے یہ منظر نہایت عمدگی اور صراحت کے ساتھ فلمایا کیونکہ ایک اداکار کی حیثیت سے اس کی ذہنی حالت درست نہ تھی اور وہ دہری شخصیت کا مالک تھا۔ اداکاری ہی میری شخصیت کی حقیقی پہچان ہے۔ کیمرے کے سامنے وہ بیس سیکنڈ میری شخصیت کی بنیاد تھے اور ہر چیز پہلی سے ہی ابھرتی ہے۔ جب میں یہ منظر عکس بند کروا رہا ہوتا ہوں تو پھر مجھے اپنے

گرد و پیش کا کوئی ہوش نہیں ہوتا کیونکہ ہر چیز سطحی اور غیر حقیقی ہوتی ہے۔''

سلیم نے کبھی بھی شاہ رخ خان سے رقم کا مطالبہ نہیں کیا۔ ایک دو دفعہ اس نے شاہ رخ خان سے ایک مخصوص فلم میں کام کرنے کا مطالبہ کیا لیکن شاہ رخ خان نے نہایت شائستہ اور نفیس انداز میں جواب دیا کہ چونکہ وہ سلیم کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا، اس لیے اسے بھی اس کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہیے۔ ''میں نے اس سے کہا چونکہ میں تو تمہیں نہیں کہتا کہ فلاں شخص کو گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے، اس لیے تم مجھے بھی نہ بتاؤ کہ میں کس فلم میں کام کروں۔'' حیرت انگیز طور پر سلیم کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور اس نے شاہ رخ خان کے اس جواب سے انکار نہیں کیا۔ بعض اوقات سلیم یہ شیخی بھگارتا کہ اس نے کتنے ہی افراد قتل کروائے ہیں اور کتنے ہی طاقتور افراد کو اذیت پہنچانے کے بعد ان سے رقم وصول کی ہے۔ شاہ رخ خان محض سنتا رہتا اور صرف ''ہاں'' کہنے پر اکتفا کرتا۔

ایک دفعہ شاہ رخ خان اپنی کار میں ایک فلمی تقریب میں شرکت کے لیے جا رہا تھا۔ راستے میں سلیم نے اسے فون کیا اور اسے فون پر ان دونوں فلمی افراد کی گفتگو سنوانے کا اہتمام کیا جنہیں سلیم ڈرا دھمکا رہا تھا جب سلیم ان کے ساتھ گالی گلوچ کر رہا تھا تو شاہ رخ خان فون کے ذریعے یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ گالی گلوچ اور لعنت ملامت کے دوران سلیم ڈرامائی انداز میں ایک لمحے کے لیے رک جاتا اور شاہ رخ خان کو فون پر رہنے کے لیے کہتا۔ سلیم یہ امر یقینی بناتا کہ اسکے دونوں شکار یہ سمجھ لیں کہ اس نے ہندوستان کے ایک بہت بڑے اداکار کو بھی اپنے زیردست رکھا ہے۔ جب تک کار چلتی رہی، یہ گفتگو بھی جاری رہی جب شاہ رخ خان تقریب میں شرکت کے لیے اندر داخل ہوا تو اس نے ان دونوں کو بھی وہیں موجود پایا۔ ان تینوں نے آپس میں شناسائی کے عالم میں دیکھا لیکن انہیں ایک دوسرے سے یہ پوچھنے کا حوصلہ تک نہ ہوا کہ فون پر وہی شخص موجود تھا۔

پھر جلد ہی ایسے بے شمار چھوٹے چھوٹے جرائم پیشہ گروہ وجود میں آ گئے جو سلیم کے مانند کم از کم سرمایہ کاری کے ذریعے زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کے ہنر سے واقف ہو گئے تھے۔ علیحدہ ہونے والے جرائم پیشہ گروہ کے سرغنہ چھوٹا راجن کی طرف سے شاہ رخ خان کو مخصوص فلموں میں کام کرنے کے لیے کہا گیا لیکن جب شاہ رخ خان نے انکار کر دیا تو حیران کن شائستگی کے ساتھ یہ لوگ اپنے مطالبے سے دستبردار ہو گئے۔ ایک اور جرائم پیشہ گروہ جو مختصر

عرصے کے لیے ہی موجود رہا، اس کے سرغنہ ''گونگا بھائی'' نے بھی اپنی گونجدار اور بھاری آواز میں شاہ رخ خان کو اس کی اپنی (گونگا بھائی) زندگی پر تیار کی جانے والی فلم میں مرکزی کردار ادا کرنے کی پیشکش کی۔ شاہ رخ خان سمجھ گیا کہ یہ افسردہ صورت شخص اپنے آپ کو مظلوم ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے، اس لیے اس نے نہیں چاہا کہ اس کے ساتھ تلخ آمیز رویہ اپنایا جائے۔ لہٰذا شاہ رخ خان نے انگریزی (زبان) کے ذریعے اسے پریشان کرنے کی کوشش کی۔ ''میں جس قسم کی جذباتی صورتحال پیدا کرنا چاہتا ہوں، میں اس کا تصور کرنے سے بھی قاصر ہوں۔ یہ جذباتی فضا پیدا کرنے کے لیے ماحول سازگار نہیں ہے۔'' ایک سال پر محیط وقفے کے بعد جب گونگا بھائی کو یہ سمجھ آ گئی کہ شاہ رخ خان پردہ سیمیں پر اس کا کوئی کردار ادا نہیں کرنا چاہتا تو اس کا دل ٹوٹ گیا اور اس نے کہا: ''لیکن میں نے تو تمہارا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ تمہاری آنکھوں میں بھی وہی جنونیت اور وحشت موجود تھی جو میری آنکھوں میں ہے!''

یہ جرائم پیشہ گروہ ہندوستانی فلمی صنعت کے لیے بہت خطرناک حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ فلمی صنعت میں یہ لطیفہ مشہور ہو گیا تھا کہ فلم تیار کرنے کے لیے اخراجات میں جرائم پیشہ گروہوں کو دی جانے والی رقوم بھی شامل کی جائیں۔ بلاشبہ اس قسم کے باہمی تعلقات کچھ دیگر تعلقات کی نسبت زیادہ خوفناک تھے۔ 1998ء میں داؤد کے ایک اور دست راست چھوٹا شکیل نے شاہ رخ خان سے رابطہ کیا۔ بم دھماکوں کے معاملے میں شکیل کا ایک بہت ہی اہم کردار تھا۔ شکیل شاہ رخ خان کی ایک حال ہی میں نمائش پذیر ہونے والی فلم ''دل سے'' کے ایک نغمے سے سخت متنفر تھا یہ نغمہ شاہ رخ خان نے ایک ریل گاڑی کی چھت پر رقص کرتے ہوئے عکس بند کروایا تھا۔ ''چھیاں، چھیاں، پاؤں جنت تلے'' یا ''جنت میرے پاؤں کے نیچے ہے۔''

تقریباً چار سال تک شاہ رخ خان کو مختلف جرائم پیشہ گروہوں کی جانب سے مختلف قسم کے مطالبات منظور کرنے کے لیے دھمکی آمیز فون موصول ہوتے رہے۔ اس نے ان جرائم پیشہ قاتلوں سے نہایت مہذب اور شائستہ انداز میں گفتگو کے ذریعے اپنی مخالفت سے باز کروایا اور اپنے لیے امن و سکون حاصل کر لیا۔ اس کا مقصد نہ تو ان کی مخالفت اور نہ ہی ان کے اس مطالبے کے آگے ہتھیار ڈال دینا تھا کہ جرائم پیشہ گروہوں کے مالی تعاون سے تیار کردہ فلموں میں کام کیا جائے۔ اس نے یہ کہتے ہوئے ان کے مطالبات نامنظور کر دیے کہ اس کے پاس وقت نہیں ہے یا فلموں کی کہانیاں اس قابل نہیں ہیں کہ انہیں فلمایا جائے۔ اس نے اپنے انکار

کے لیے نہایت مہذبانہ اور آبرومندانہ طریقہ اختیار کیا اور انہیں ''مسٹر چھوٹا شکیل'' یا ''مسٹر ابوسلیم'' کہہ کر پکارتا رہا۔ اس نے جرائم پیشہ گروہوں کے سرغنوں سے ایسے بات کی جیسے معزز اور مشہور فلمسازوں سے گفتگو کی جاتی ہے اور اس نے اپنی ہر گفتگو سے پولیس کو مطلع کیے رکھا۔

شاہ رخ خان کے اس مہذب اور شائستہ رویے اور طرز عمل کے باعث بعض جرائم پیشہ گروہوں کے سرغنے بھی اس شائستگی اور تہذیب کا مظاہرہ کرتے وہ محض شاہ رخ خان سے یہ مطالبہ کرتے کہ فلاں شخص سے ملاقات کر لی جائے یا کسی شخص سے فلم کے متعلق کہانی سن لی جائے لیکن انہوں نے کبھی بھی اسے جسمانی تشدد یا نقصان کے لیے دھمکی نہیں دی۔ ایک مسلمان اور عظیم اداکار ہونے کی حیثیت سے جرائم پیشہ گروہ اس کے لیے بہت زیادہ رحم دلی اور نرم دلی کا مظاہرہ کرتے۔ اپنی مکروہ اور خوفناک چالوں کے باوجود انہوں نے ایک مسلمان مستند اور معتبر شخصیت کو قتل کرنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ انہوں نے فلمی صنعت کی اہم شخصیات راجیو رائے، گلشن کمار اور بعد ازاں راکیش روشن کی زندگیوں کے چراغ گل کر دیے تھے۔ ایک دفعہ سلیم نے شاہ رخ کو بتایا کہ اس کی والدہ اور بہن شاہ رخ خان کی زبردست پرستار ہیں۔ بالآخر جب پستول اور پستول بردار محافظوں کے باعث شاہ رخ خان کے اعصاب چٹخنے لگے تو شاہ رخ خان نے انہیں وہاں سے جانے کے لیے کہہ دیا: ''میں بہت پریشان ہو گیا ہوں، ہمارا گھر بہت چھوٹا ہے، میرا بیٹا بھی نو عمر ہے، اس کے موزوں سے بو آتی ہے۔ یہ سب کچھ بہت ہی پریشان کن اور اعصاب شکن ہے۔'' بالآخر شاہ رخ خان نے ایک نجی محافظ ملازم رکھ لیا اور بلٹ پروف بی ایم ڈبلیو کار خرید لی۔ ایک دفعہ وہ مزاحیہ انداز میں کہنے لگا: ''اب میں ایک عالمی شخصیت اور اثاثہ ہوں مجھے کوئی قتل نہیں کرے گا۔'' فلمی صنعت کے بے شمار دیگر افراد کے برعکس شاہ رخ خان ان خوفناک ماہ و سال میں سے نسبتاً محفوظ طریقے سے بچ نکلا لیکن ابھی بھی یہ پریشان کن حالات مکمل طور پر ختم نہیں ہوئے تھے۔

❀

پندرہواں باب

”بے عزتی“

جب ایک فلم ناکامی سے دوچار ہو جاتی ہے تو اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی افسردگی اور مایوسی کا احساس وہی شخص کر سکتا ہے جس کا اس تمام معاملے سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔ کسی بھی فلم کی تیاری میں مہینوں کی محنت و مشقت صرف ہوتی ہے حتیٰ کہ ناکام ہو جانے والی فلموں کے لیے بھی شدید محنت درکار ہوتی ہے لیکن ایک صبح یہ سب کچھ ایک لمحے کے اندر تحلیل ہو جاتا ہے۔

ہندوستان میں عام طور پر ایک نئی فلم کی نمائش کا آغاز جمعے کے دن سہ پہر کے وقت ہوتا ہے اور پھر تقریباً شام کے وقت فلمی صنعت میں اس نئی نمائش پذیر فلم کے متعلق اطلاعات موصول ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ پیغامات نہایت تیزی کے ساتھ سفر کرتے ہیں اور تلخ و شدید ہوتے ہیں: ”قطعی طور پر ناکام“، ”فلم پٹ گئی“، ”سینما گھر میں کوے بول رہے ہیں“۔ اس اثناء میں فلم کا عملہ اپنا حوصلہ برقرار رکھتا ہے اور ذرائع ابلاغ کو بتاتا ہے کہ جلد ہی شائقین اس فلم کو دیکھنے کے لیے دوڑے چلے آئیں گے لیکن ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا ہے۔ ہالی وڈ کا ”فارمولا“ ہندوستانی فلمی صنعت پر بھی لاگو ہوتا ہے: یعنی ایک فلم ”پیراشوٹ کے مانند ہوتی ہے اگر پیراشوٹ نہ کھلے تو آپ ہلاک ہو جاتے ہیں“۔

سوموار تک فلم کے متعلق واضح فیصلہ سامنے آ جاتا ہے۔ ناظرین کا تجسس ماند پڑ جاتا ہے اور آمدن کی صورت کٹی پتنگ کے مانند ہو جاتی ہے۔ ایک فلمساز کے لیے یہ اس کے تصور، شہرت، منصب اور اکثر مالیات کے لحاظ سے ایک شکست وریخت کا منظر ہوتا ہے۔ لوگ اس سے نظریں بھی نہیں ملاتے لیکن جب کسی بھی وجہ سے وہ اس فلمساز سے نظریں ملانے پر مجبور ہو جاتے ہیں تو یہ نگاہیں اس ہمدردی کا مظہر ہوتی ہیں جو خاندان میں کسی فرد کی موت کے باعث وجود میں آئی ہو لیکن اس ہمدردی میں ایک خوشی پوشیدہ ہوتی ہے۔ فلموں میں کامیابی اس قدر کم

واقع ہوتی ہے کہ اس کے باعث ناگزیر طور پر شدید حسد کا احساس جنم لیتا ہے۔ ناکامی زیادہ سے زیادہ طمانیت بخش ثابت ہوتی ہے۔ جب ناکامی ایک مستقل اور متواتر معمول اختیار کر لیتی ہے تو پھر کیمرے کے بلب دور ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور پھولوں کی آمد رک جاتی ہے۔

جنوری 2000ء میں شاہ رخ خان کے لیے بھی پھولوں کی آمد رک گئی۔ یہ نہیں تھا کہ اس سے پہلے اس کی فلمیں ناکام نہیں ہوئی تھیں بلکہ اس وقت تک اس کی اٹھائیس فلمیں نمائش کے لیے پیش کی گئیں تھیں جن میں سے کافی معمولی فلمیں تھیں جن سے معمولی آمدن حاصل ہوئی۔ 1995ء میں نمائش کے لیے پیش کی جانے والی فلم ”تری موورتی“ اور پھر 1998ء میں پیش کی جانی والی فلم ”دل سے“ ایسی ہی بری طرح ناکام ہونے والی فلمیں تھیں جن کی توجیہہ پیش کرنے سے ہر کوئی خوفزدہ تھا لیکن شاہ رخ خان ہندوستانی فلمی صنعت کا "TEFLON MAN" تھا یعنی ناکامی اس کے لیے قطعی طور پر بے اثر ہوتی۔ درحقیقت ”تری موورتی“ کے بعد شاہ رخ خان اور فلمساز سبھاش گئی نے اپنی خوش قسمتی کو دھندلانے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی ناکامیوں پر انہوں نے جشن منایا۔ نیویارک میں اپنی فلم کی نمائش کے موقع پر وہ دونوں نشے میں دھت ہنستے ہوئے مین ہٹن کی سڑکوں پر دوڑے جا رہے تھے اور سڑک پر موجود معصوم لوگوں کو اکسا رہے تھے کہ وہ ان کی فلم نہ دیکھیں۔ علاوہ ازیں ہر دوسرے سال شاہ رخ خان اس قدر عظیم ترین کامیاب فلم پیش کرتا کہ اس کی ناکامیاں معمولی درجہ اختیار کر جاتیں۔ ”دل ہے پھر بھی ہندوستانی“ کی غیر متوقع ناکامی کے لیے وہ قطعی طور پر تیار نہ تھا۔

یہ شاہ رخ خان کی پہلی فلم تھی جس میں اس نے اپنی روایتی کردار سے مختلف کردار پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا رومانوی کردار فلمی شائقین میں اس قدر مقبول ہو چکا تھا کہ اکثر فلمساز اسی کردار کو ہی بار بار اپنی فلموں میں پیش کر رہے تھے تاکہ انہیں آمدن میں کسی بھی قسم کی کمی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لہٰذا شاہ رخ خان نے اپنے اس روایتی کردار سے کچھ ”مختلف“ کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ”پھر بھی دل ہے ہندوستانی“ کا بیک وقت فلمساز اور مرکزی کردار بھی تھا۔ اس فلم کے لیے شاہ رخ خان نے ہندوستانی فلم کے بہترین تکنیک کاروں سے کام لیا۔ کرن اور ادتیا مشیر تھے۔ (ان میں سے کسی نے بھی اپنی دوسری فلم کی نمائش نہیں کی لیکن فلمی صنعت ان کا اس لحاظ سے احترام کرتی تھی یہ لڑکے بہترین صلاحیتوں کے مالک تھے) لہٰذا

جب یہ فلم ناکام ہوئی تو یہ محض ایک اور ناکامی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ فلم کی ہیروئن اور شریک فلمساز جوہی چاولہ نے اسے "بے عزتی" یعنی "عزت کا سوال" قرار دیا۔ شاہ رخ خان کی فلمی زندگی میں یہ "بے عزتی" ایک ایسا کمزور لمحہ تھا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ 1999ء میں شاہ رخ خان، جوہی اور عزیز مرزا نے فلم تیار کرنے کے ضمن میں ایک ادارہ قائم کر لیا۔ اس وقت یہ ایک بہت اچھی تجویز معلوم ہو رہی تھی۔ ان تینوں کے درمیان ایک طاقتور، ذاتی اور پیشہ وارانہ بندھن استوار تھا۔ جب شاہ رخ خان پہلی دفعہ ممبئی منتقل ہوا تھا تو عزیز اور اس کی بیوی نرملا نے شاہ رخ خان کو والدین جیسی محبت و شفقت سے نوازا تھا۔ عزیز نے شاہ رخ خان کے ساتھ مل کر اس کی پیشہ وارانہ زندگی کے اوائل میں فلم "سرکس" تیار کی تھی۔ پھر دونوں نے اپنی پہلی پہلی فلم "راجو بن گیا جنٹلمین" تیار کی جس میں جوہی ہیروئن تھی۔ ایک ایسے کاروبار میں جہاں دولت کی آمد، تعلقات اور دوستیوں کی بنیاد ہو وہاں شاہ رخ، عزیز اور جوہی کی دوستی اور تعلقات، مستقل اور پائیدار ثابت ہوئے۔ ان تینوں میں فلم تیار کرنے کی صلاحیت، مہارت اور بصیرت بدرجہ اتم موجود تھی۔ یہ تینوں ہی ایسی واضح، صاف اور سادہ فلمی کہانیاں بیان کرنے کے خواہاں تھے جن میں ایک مخصوص معاشرتی پیغام اور سبق موجود ہو۔ یہ انداز "فرینک کیپلر" جیسا تھا جسے شاہ رخ خان غریب شخص کا راج لپور کہتا تھا۔ ان تینوں کی مشترکہ تیار کی ہوئی دوسری فلم 1997ء میں نمائش پذیر ہوئی جس کی کہانی معمولی لیکن پر پیچ تھی اور اس کا نام "Yes Boss" تھا۔ اس فلم میں شاہ رخ خان نے "ضرورت سے زائد وفادار ملازم" کا کردار ادا کیا جو اپنے مالک کے لیے عورتوں کی جاسوسی کرتا ہے۔ یہ ایک نہایت معمولی فلم تھی جس سے آمدن بھی بہت معمولی حاصل ہوئی لیکن ان تینوں کو یہ احساس حاصل ہو گیا اس طرح کی عجیب و غریب فلمیں کاروبار میں مالی نقصان کا باعث ہیں اور فلمسازوں کے لیے نیک شگون نہیں ہیں۔

لہٰذا ان تینوں کے درمیان کاروباری امور پر بات چیت ہوئی۔ عزیز شاہ رخ خان کے ساتھ ایک فلم بنانے کا خواہش مند تھا لیکن وہ اسے کم معاوضہ دے کر ان تینوں کی مشترکہ دوستی کی قربانی نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے اصرار کیا کہ شاہ رخ خان مروجہ شرح معاوضہ کے مطابق اپنے معاوضہ اور ان کے منافع میں سے کچھ حصہ وصول کرے۔ شاہ رخ خان نے عزیز کی اس بات کو منظور کرنے کے بجائے یہ تجویز پیش کی کہ انہیں باہمی طور پر شراکت دار بن جانا چاہیے۔ فلمیں تیار کرنے کے لیے یہ ایک بہت ہی مناسب اور بہترین وقت تھا اور مواقع بھی بہت

تھے۔ فلموں کے علاوہ موسیقی، سیٹلائٹ اور بیرون ملک فلموں کی نمائش بھی آمدن کا بہت بڑا ذریعہ تھے۔ دوسرے اداکار بھی فلمسازی کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔ اگرچہ ایتابھ بچن کی "ایتابھ بچن کارپوریشن لمیٹڈ" بند ہو چکی تھی اور پھر اس وقت اجے دیوگن اور عامر خان اپنے اپنے اداروں کا آغاز کر رہے تھے...... شاہ رخ خان، عزیز اور جوہی کا استدلال یہ تھا کہ فلم بنانے کے لیے ان کا اپنا ادارہ انہیں تخلیقی آزادی کا موجب ثابت ہوتا۔ وہ کسی بھی معذرت خواہانہ رویے کے بغیر اپنی مرضی کے مطابق فلمیں بنا سکتے تھے پھر انہوں نے اپنے ادارے کے لیے مختلف ناموں پر غور کرنا شروع کر دیا۔ ایک نام "Dreams" یعنی "خواب" سامنے آیا لیکن اس نام کو ایک مختلف، علیحدہ اور انفرادی رنگ دینے کے لیے اس کے انگریزی ہجوں میں تبدیل کر کے "ایس (S)" کے بجائے "زیڈ (Z)" لگا دیا گیا۔ اس طرح اس ادارے کا نام "Dreamz Unlimited" رکھ دیا گیا۔

ایک چار منزلہ عمارت خریدی گئی اور یہاں پرتکلف دفاتر قائم کیے گئے۔ شاہ رخ کے دفتر کے دروازے پر "Superstar" کے الفاظ پر مشتمل تختی آویزاں کی گئی۔ یہ ادارہ نہ صرف فلمیں تیار کرنے بلکہ ٹی وی کے پروگرام اور تجارتی و کاروباری اشتہار تیار کرنے کے ضمن میں لاکھوں تمنائیں اپنے دل میں سمیٹے ہوئے تھا۔ چونکہ شاہ رخ خان مختلف آلات اور تکنیکوں سے مکمل طور پر واقف تھا، چاہتا تھا کہ ان کے عملے کے پاس بہترین آلات ہوں۔ اس کا خیال بلکہ یقین تھا کہ بہتر آلات کے ذریعے بالآخر اچھی فلمیں وجود میں آتی ہیں۔ لہٰذا ایک ذیلی ادارہ "Arclightz and Films Pvt Ltd" قائم کیا گیا اور جدید و معیاری آلات درآمد کیے گئے۔ اس ضمن میں Arriflex کیمرے، Kino Flo عدسے، Jimmy Jib کرینیں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نومبر 2000ء میں ایک اور ذیلی ادارہ "Aryan Informatics" (شاہ رخ کے بیٹے کے نام پر) قائم کیا گیا جس کے ذریعے ایک تفریحی نشریاتی ادارہ Srkworld.com قیام پذیر ہوا۔ اس ضمن میں عظیم خواب اور خواہش یہ تھی کہ بالآخر یہ تینوں منصوبہ جاتی ادارے ایک کثیر المقاصد سٹوڈیو کی شکل اختیار کر جائیں جہاں فلمبندی کے بعد کی سہولیات، آلات کے لیے گودام، تخلیقی دفاتر...... اور شاہ رخ خان کی پسند کے عین مطابق ایک فائیو سٹار ہوٹل اور دیگر آسائشات موجود ہوں۔ یہ "نہیں ناں" اشتہاری ادارے کی طرز پر ایک بڑا اور وسیع النظر تصور و تخیل تھا۔

جب ایک زمانے میں شاہ رخ خان اور جینی نے اپنے فلمی دور میں جس قسم کا خواب دیکھا

تھا۔ منصوبہ اس کے قریب تر تھا لیکن اس ضمن میں عملی تجربہ موجود [illegible] تھا کہ شراکت دار کو
کاروبار کا آغاز کرنے کے متعلقہ امور سے شناسائی نہیں تھی۔ جوہی کا شوہر جائے مہتا جو ایک
کاروباری شخص تھا نے ادارے کو متعلقہ حکومتی محکمے کے پاس باقاعدہ قانونی شکل دینے کے لیے
انہیں معاونت مہیا کی اور ان کے ادارے کی مطلوبہ سرگرمیوں اور کارروائیوں کے ضمن میں
تفصیلی گوشوارہ اور دیگر معلومات اکٹھی کر کے دیں۔ چونکہ لیش چوپڑا کو فلم تیار کرنے کے ضمن
میں پچاس سالہ تخلیقی تجربہ حاصل تھا لہٰذا اسے ''فلم پروڈکشن'' کی ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔
جوہی کے بھائی سنجیو کو ''پروڈکشن ایگزیکٹو'' کی حیثیت سے بھرتی کیا گیا اور اسے کام سیکھنے کے
لیے لیش سے منسلک کر دیا گیا جب بھی سنجیو لیش سے کسی مسئلے کے متعلق پوچھتا لیش اس سے
ٹھیٹ پنجابی لہجے میں کہتا: ''بھائی فکر مت کرو میں یہ سب کچھ سنبھال لوں گا۔'' شاہ رخ خان،
جوہی، عزیز اور ان کے بیس مختلف ملازمین میں سے اکثر ''فلم پروڈکشن'' کے ضمن میں نو آموز
تھے لیکن ان کی ناتجربہ کاری شاہ رخ کے ''بڑے اداکار'' کی حیثیت اور فلمی صنعت میں ان کی
مشترکہ ساکھ کے سامنے بے وقعت ہو گئی۔

عزیز کے ذہن میں ان کے ادارے کی طرف سے تیار کی جانے فلم کا تخیل بلی وائلڈر''
کے شاہکار "The Front Page" سے مستعار لیا گیا تھا۔ ''پھر بھی دل ہے ہندوستانی'' ٹیلی
ویژن کے ان دو صحافیوں کی کہانی ہے جو حریف ٹی وی نشریاتی اداروں کے لیے کام کرتے ہیں
اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فضول تگ و دو میں مصروف رہتے ہیں۔ اپنی پیشہ وارانہ
زندگیوں اور ذمہ داریوں کے لحاظ سے یہ دونوں بے حد جنونی اور ان تھک محنت و کوشش کے
عادی ہوتے ہیں لیکن ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ آزمانے کی
ان کی اس عادت کو اس وقت دھچکا پہنچتا ہے جب وہ ''حقیقی زندگی میں ایک قتل'' کے حوالے
سے ملوث ہو جاتے ہیں چونکہ یہ دونوں صحافی اپنے لالچی آجروں، بدعنوان سیاستدانوں اور
پولیس کے آلہ کار بنے ہوتے ہیں۔ لہٰذا دولت اور طاقت کے حصول کے ضمن میں انہیں اپنی
غلطی کا احساس ہو جاتا ہے پھر سچائی کو آشکار کرنے کے لیے ذرائع ابلاغ کو استعمال کرتے
ہیں۔ 1990ء کی دہائی میں سیٹلائٹ نے ہندوستانی ٹیلی ویژن کے تمام منظر نامے کو تبدیل کر دیا
تھا۔ 1999ء تک ناظرین جوان دونوں بیزار کن اور عدم دلچسپی پر مبنی نشریاتی اداروں / رابطوں
سے اکتا چکے تھے، انہیں پچاس سے زیادہ دلچسپ اور معلوماتی نشریاتی رابطے اور ادارے حاصل

ہو چکے تھے۔ عزیز کا خیال بلکہ اسے یقین تھا کہ ہندوستان میں روشن خیالی کے بعد ذرائع ابلاغ
کے زیادہ سے زیادہ مادہ پرست ہو جانے پر ان کی فلم ایک بصیرت افروز تبصرہ ثابت ہو گی۔

اس ضمن میں کرن اور ادتیا قائل نہیں ہوئے تھے۔ فلموں کے حوالے سے ان کی فطرت
اور جبلت زیادہ سے زیادہ تجارتی بنیادوں پر ایستادہ تھی۔ یہ دونوں ایک عالمگیر موضوع پر کام
کرنے کی افادیت کو سمجھ چکے تھے اور ''پھر بھی دل ہے ہندوستانی'' کے مرکزی خیال سے متفق
نہیں تھے۔ انہوں نے شاہ رخ خان کو بتایا کہ 1990ء کی دہائی کا ایک مشہور ہدایتکار سوراج
بھار جاتیہ اس وقت ''ہم ساتھ ساتھ ہیں'' بنا رہا تھا جس میں ''رامائن'' کو جدید کہانی کے انداز
میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ کہانی ہر ایک کے لیے قابل فہم تھی حتیٰ کہ گاؤری کی دادی کو بھی یہ کہانی
سمجھنے میں مشکل پیش نہیں آئی تھی جو اس وقت ممبئی آئی ہوئی تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا
اسے ذرائع ابلاغ کے مادہ پرستی کے رجحان کے متعلق کچھ فہم حاصل ہوئی؟

اب یہ تینوں شراکت دار باہمی طور پر قدرے رضامند نظر آ رہے تھے۔ عزیز اور جوہی
اخراجات کے معاملے میں بہت محتاط تھے لیکن شاہ رخ خان بہت ہی شاہ خرچ، مہربان اور شفیق
فلمساز تھا۔ اسے سب سے زیادہ خدشہ اور فکر اس بات کی تھی کہ ان کی تیار کردہ فلم اس طرح
ڈھیلی ڈھالی نہ ہو جس طرح عمومی ہندوستانی فلموں کی روش ہے۔ بطور فلمساز اس کی پہلی فلم
ایسی ہونی چاہیے جو ہر لحاظ سے بہترین ہو۔ لہٰذا اس نے سنجیو کو ہدایت کی کہ اسے جس چیز اور
جس شخص کی ضرورت ہو وہ بلا روک ٹوک فراہم ہونا چاہیے۔ فلم کے اخراجات کے لیے 150
ملین روپے مخصوص کیے گئے۔ اعلیٰ مہارت یافتہ تکنیک کار ملازم رکھے گئے۔ ''ہندوستانی فلم کا
صف اول کا عکس کار سنتوش سیون بھی بلا لیا گیا۔ اسی طرح رقص کی ہدایت کاری کے لیے مشہور
نام فرح خان کا انتخاب کیا گیا۔ یہ شخص شاہ رخ خان کا پسندیدہ اور اس کا قریبی دوست تھا۔
فرح خان شاہ رخ خان کی ابتدائی فلموں میں اس کے ساتھ کام کر چکا تھا اور اس نے شاہ رخ
خان کی شخصیت کا ایک انداز (وہ اپنے ہاتھ اپنے بالوں میں پھیرتا ہے) متعارف کروایا تھا جس
کو دیکھتے ہوئے خواتین بے حال ہوئے جاتی تھیں۔ عکس بندی کے لیے چوبیس ''جائے مقام''
تیار کیے گئے۔ مزید براں شاہ رخ خان کے گھر کا اندرونی حصہ بھی منتخب کیا گیا لیکن اسے
استعمال کرنے کی نوبت نہیں آ سکی۔

''پھر بھی دل ہے ہندوستانی'' کی نمائش کا آغاز 21 جنوری 2000ء کو ہوا۔ افتتاحی نمائش

میں فلمی صنعت کے بڑے بڑے نام بطور مہمان شریک تھے۔حتیٰ کہ ماضی کے دیو مالائی کردار دلیپ کمار، ریکھا اور جیہ بچن بھی شاہ رخ کی تخلیق دیکھنے کے لیے موجود تھے۔فلم کے متعلق تقریب نمائش کے بعد "Fire & Ice" نامی ایک جدید شبینہ کلب میں منعقد ہوئی۔ ''انڈین ایکسپریس'' نامی اخبار کی اطلاع کے مطابق شاہ رخ اپنی حاملہ بیوی گاوری کے ساتھ رقص گاہ میں کود پڑا اور جوہی نے ہر مہمان کا ''ہیلو'' کہتے ہوئے خیر مقدم کیا جس کے باعث ہدایتکار عزیز مرزا کو بھی ناراض اور مایوس ناظرین کے طعنے سہنے پڑے جنہیں فلم دیکھ کر بہت صدمہ ہوا تھا۔

ماہ و سال گزرنے کے ساتھ ساتھ گاوری کا ماموں تجندر فلموں کے ضمن میں شاہ رخ خان کا اندرون خانہ ''ماہر اور مشیر'' کی حیثیت سے سامنے آیا۔فلم کی نمائش کے بعد وہ شاہ رخ خان کے ساتھ فلم کی خوبیوں اور کامیاب ہونے کے امکانات کے متعلق گفتگو کرتا لیکن ''پھر بھی دل ہے ہندوستانی'' دیکھنے کے بعد وہ منظر نامے سے غائب ہو گیا اس نے ملاقات کے لیے آنے سے بھی انکار کر دیا۔بالآخر گاوری تجندر کے گھر پہنچی اور اس سے پوچھا کہ وہ شاہ رخ خان کے ساتھ ملاقات سے احتراز کیوں کر رہا ہے۔تجندر نے جواب دیا: ''میں اسے کیا بتاؤں یہ فلم اچھی نہیں ہے۔''

تنقید نگاروں نے تجندر کے موقف کی تصدیق کر دی۔انہوں نے فلم کی عجیب کہانی کا تیا پانچہ کر کے رکھ دیا اور سیاسی بیانات سے لے کر جذباتی مکالمے بازی کو نہایت احمقانہ قرار دیا۔''ٹائمز آف انڈیا'' نے فلم پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ سرخی جمائی: ''انتہائی احمقانہ''۔ تنقید نگار نکہت کاظمی جس نے شاہ رخ خان کے متعلق فلم ''دیوانہ'' کے حوالے سے ''نیا جوہر'' کے طور پر پیش گوئی کی تھی نے بھی اپنا چاقو تیز کر لیا تھا: ''آپ کے خوابوں کی کوئی انتہا نہیں اور یہ کوئی بری بات بھی نہیں لیکن جب آپ ان خوابوں کو فلم کے فیتے پر منتقل کرتے ہیں تو پھر آپ انتہائی احمقانہ پن کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔اس طریقے کے ذریعے بے شمار مسائل پیدا ہوتے ہیں۔''

ایک بڑے اور عظیم اداکار کے متعلق بلند توقعات اور اس کی شخصیت کے تاثر کے باعث یہ امر یقینی تھا کہ پہلے دن سینما گھر شائقین سے کھچا کھچ بھرے ہوں گے لیکن سوموار تک آمدن میں مزید کی واقع ہو چکی تھی اور احمد آباد جیسے چھوٹے شہروں میں بھی پہلے ہی ہفتے کے دوران سینما گھر ناظرین سے خالی ہو گئے۔

14 جنوری 2000ء کو ''پھر بھی دل ہے ہندوستانی'' کی نمائش سے ٹھیک ایک ہفتہ پہلے ایک معمولی سی فلم ''کہوں نا...... پیار ہے'' نمائش پذیر ہوئی۔یہ فلم ایک نئے اداکار اور اداکارہ کے ساتھ روایتی طور پر بنائی گئی تھی۔اس کی عکس بندی نہایت ہی حسین اور دلکش اندرون و بیرون ملک مقامات پر کی گئی تھی، لب و لہجہ نہایت ہی دھمک آمیز اور کہانی کا ڈھانچہ ایسا تھا کہ مرکزی کردار کو جذباتی مکالمے بھی بولنے پڑے، رقص بھی کرنا پڑا اور مار دھاڑ پر مبنی مناظر بھی عکس بند کروانے پڑے۔بذات خود فلم روایتی ''فارمولہ'' کے مطابق تھی لیکن ''ہیرو'' بہت ہی شاندار تھا۔اس کا رنگ گورا، خوابیدہ آنکھیں اور چہرہ دلکش تھا، اس کا بدن ''وی V'' کی شکل کا تھا جسے نہایت محنت سے جسمانی ورزش کے مرکز میں تیار کیا گیا تھا لیکن ہریتک روشن کسی کے وہم و گمان سے بھی زیادہ اچھی اداکاری کر سکتا تھا۔ایک فنکار کی حیثیت سے اس میں جذبہ و شوق بہت زیادہ تھا لیکن نوآموزوں کے برعکس اس میں سنجیدگی موجود تھی۔رقص کے دوران اس کی حرکات بھی بہت متاثر کن تھیں۔ایک نغمے کے دوران اس کی اداکاری اس قدر خوبصورت اور دلکش تھی کہ ناظرین نے چیخ و پکار کر کے اسے داد دی۔

ہریتک نے سونامی کے مانند اپنے ناظرین پر حملہ کر دیا۔اس کے راستے میں آنے والی ہر چیز کچرے میں تبدیل ہو گئی جس میں عامر خان کی نئی فلم ''میلہ'' بھی شامل تھی جس کی نمائش ایک ہفتہ قبل ہوئی تھی اور ''پھر بھی دل ہے ہندوستانی'' بھی اسی ''سونامی'' کی نذر ہو گئی جو اس سے ایک ہفتہ بعد نمائش پذیر ہوئی۔''کہوناں...... پیار ہے'' کی آمدن نے کم ہونے سے انکار کر دیا۔تیسرے ہفتے بھی سینما گھر اسی طرح ناظرین سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے جس طرح پہلے ہفتے سینما گھر ناظرین سے ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے تھے۔لڑکیاں اور لڑکے ہریتک کو پردہ سکرین پر آتے دیکھ کر چیخیں مارتے اور رقص کرنے لگتے۔اس فلم کے ذریعے غیر قانونی طور پر ٹکٹ کی زیادہ قیمت وصول کرنے والے افراد کی چاندی ہو گئی۔حتیٰ کہ درمیانی عمر کے ناظرین بھی اسی جوش و جذبے میں مبتلا ہو چکے تھے۔مارچ میں ''انڈیا ٹوڈے'' نامی رسالے نے ہریتک کی تصویر سرورق پر شائع کی اور سرخی جمائی: ''دل کی دھڑکن...... ہریتک'' رسالے نے مزید بتایا کہ ہریتک کی آمد کے باعث دیگر تمام اداکار ''تھکے ماندے اور پژمردہ'' معلوم ہو رہے ہیں۔اس مضمون کے ایک حصے میں یوں سرخی جمائی گئی تھی: ''ہریتک بمقابلہ خان۔'' جس کے باعث ہریتک ''خانوں'' (شاہ رخ خان، عامر خان، سلمان خان) کے مقابلے میں

فتح مند معلوم ہو رہا تھا...... اور ان تمام "خانوں" کو کم تر قرار دے دیا گیا تھا۔ اس مضمون میں بطور خاص شاہ رخ خان کے لیے لکھا گیا: "جبلی طور پر باصلاحیت اداکار جس میں بھرپور توانائی وامنگ کے علاوہ شائستہ انداز واطوار کی جھلک بھی موجود ہے لیکن ہریتک اس سے کہیں زیادہ نفیس، باصلاحیت اور توانا ہے۔ لہٰذا ہریتک ایک ایسا اداکار ہے جو "بڑے اور عظیم اداکاروں" کی صف میں شامل ہو چکا ہے۔"

جب "انڈیا ٹوڈے" نے یہ مضمون شائع کیا تو شاہ رخ اس وقت لندن میں اپنے گھٹنے کے آپریشن کے سلسلے میں مصروف تھا۔ گاوری نے تو واقعی اس رسالے کو شاہ رخ خان سے چھپانے کی کوشش کی۔ شاہ رخ خان نے کہا: "یہ تمام کچھ انتہائی لغو ہے آپ دس سال کی محنت کو نظر انداز نہیں کر سکتے...... آپ اچانک ایک صبح یہ نہیں کہہ سکتے تم تو نکلے ہو، تم تو بہت بوڑھے ہو، تم اس قدر اچھے اداکار نہیں ہو۔ میں کسی شخص سے یہ پوچھے بغیر اپنے گھر سے باہر نہیں آ سکتا کہ ہریتک روشن کے متعلق میری کیا رائے ہے، یہ سب کچھ کس قدر بے شرمی ہے۔" شاہ رخ خان نے اپنے غصے اور مایوسی کو چھپا لیا، اس نے عمومی طور پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ حسب معمول اپنے گھر کے کام کاج میں مصروف رہا، اپنے گھر کے باغیچے میں اپنے بیٹے "آریان" کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتا رہا۔ شاہ رخ پوچھتا: "کون بہترین ہے؟" آریان جواب دیتا: "پاپا آپ سب سے بہترین ہیں۔" اس کی عمر صرف تین سال تھی اور اسے یہ سمجھ نہیں تھی کہ اس کا باپ کیا پوچھ رہا ہے اور اسے اس حوصلہ افزائی کی ضرورت کیوں محسوس ہو رہی ہے لیکن شاہ رخ خان کو یہ کامل یقین تھا کہ کم از کم ایک شخص کا بغیر کسی پس وپیش اور ہچکچاہٹ کے ابھی بھی یہ موقف ہے کہ شاہ رخ خان ناقابل تسخیر ہے۔

اگرچہ عامر کی فلم بھی شاہ رخ کی فلم کے مانند بری طرح پٹ گئی تھی لیکن عامر کو کسی بھی قسم کی تنقید کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ خاص طور پر ہریتک کی حیثیت اس انداز سے متعین کی گئی تھی کہ جیسے وہ اس دہائی کا پہلا بڑا اداکار ہے جس نے "کنگ خان" کی شہنشائیت چھین لی ہے۔ شاہ رخ خان کے خلاف یہ مخالفانہ مہم اور "پھر بھی دل ہے ہندوستانی" پر ذرائع ابلاغ کی طرف سے شدید تنقید دونوں کے باعث ایک نہایت ہی کراہت اور نفرت انگیز ماحول تشکیل پا گیا۔ فلمی رسائل وجرائد خصوصاً "سٹار ڈسٹ" نے شاہ رخ خان کی اہمیت کم کرنے کے لیے کاغذوں کے ڈھیر کے ڈھیر مختص کر دیے۔ یہ شور وغوغا اس قدر بڑھا کہ گاوری جس نے اخبارات و

رسائل کو انٹرویو دینے کا سلسلہ موقوف کر دیا ہوا تھا، خواتین کے ایک رسالے "Savvy" کے لیے سرورق پر اپنی تصویر دینے کے لیے رضامند ہو گئی۔ وہ انٹرویو کے درمیان اپنے خاوند پر تنقید کرنے والوں پر یوں برس پڑی: "تمہیں لوگ اس لیے نیچا دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ تمہاری کامیابی سے بیزار ہو چکے ہیں لیکن یہ حقیقت طے ہے کہ اخبارات اور رسائل اس قابل نہیں کہ تمہاری قسمت اور مستقبل کا فیصلہ کر سکیں۔ یہ سب لوگ جو کچھ لکھ رہے ہیں شاہ رخ خان کے مقابلے میں کبھی بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔" شاہ رخ خان کی اس توہین وتحقیر کے باعث خاص طور پر گاوری کی والدہ سویتا کو سخت صدمہ پہنچا۔ شاہ رخ نے اسے یقین دلایا کہ یہ ایک عارضی دور ہے اور جس طرح "پھر بھی دل ہے ہندوستانی" میں مرکزی کردار گاتا ہے وہ سب سے بہترین ہے اور اس کا کوئی مقابل نہیں۔

ذرائع ابلاغ نے مئی میں شاہ رخ خان کے خلاف اس وقت دوبارہ طوفان اٹھایا جب اس نے پیپسی کے ایک اشتہار میں اداکاری کی جس میں "رخسار" کا منظر دکھایا گیا تھا۔ ٹیلیویژن پر نشر ہونے والے اس اشتہار میں ایک خوبصورت لڑکی ایک بوتل کو گھما رہی ہوتی ہے اور شاہ رخ خان کو "ہریتک جیسی نظروں" سے دیکھنے کے بجائے اس کا بوسہ لینا چاہتی ہے۔ ہریتک نے حال ہی میں کوکا کولا کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کیے تھے۔ دونوں اداکاروں کے درمیان حریفانہ مسابقت ہندوستان میں ایک ملین ڈالر پر مشتمل "سافٹ ڈرنک بزنس" کے حوالے سے دونوں بین الاقوامی اداروں کے درمیان چپقلش کا ایک باقاعدہ حصہ بن چکی تھی۔ ہریتک اور اس کا باپ فلمساز راکیش روشن اس کھلے عام تضحیکی منظر میں شاہ رخ خان کی شرکت کے باعث بہت افسردہ اور ناراض ہوئے۔ پیپسی کی انتظامیہ نے بھی اس امر سے انکار کیا کہ اشتہار میں اداکاری کرنے والی لڑکی نے "ہریتک جیسی نظروں" سے دیکھا اور پھر اس اشتہار کے ہدایتکار نے روشن کو مشورہ دیا کہ وہ اس قسم کے معمولی اور غیر اہم معاملات کے حوالے سے برہمی اور بدمزاجی کا مظاہرہ نہ کرے۔ جون کے اواخر میں یہ تنازعہ اس وقت مزید گھمبیر صورت اختیار کر گیا جب دائیں بازو کی ہندو تنظیم راشٹریہ سیلوم سیلوک کے ترجمان رسالے "Panchjanya" نے اپنے سرورق کے حوالے سے ایک مضمون شائع کیا جس میں اس امر پر اصرار کیا گیا تھا کہ ہندوستانی فلمی صنعت میں ہریتک کی آمد مسلمان شاہ رخ خان کی عظمت اور برتری کا جواب ہے۔ اس مضمون میں یہ بھی بتایا گیا کہ پیپسی کا اشتہار ہریتک کی مقبولیت اور ساکھ کو تباہ کرنے

کی ایک کوشش ہے کیونکہ وہ شاہ رخ خان اور عامر خان وغیرہ کے لیے خطرے کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

اس ہنگامے اور تلخ و تند ماحول میں یہ حقیقت بدستور ناقابل انکار رہی کہ ”پھر بھی دل ہے ہندوستانی“ ایک ناکام فلم تھی۔ نمائش کے ہفتوں بعد بھی تینوں شراکت دار اپنی بہترین کوشش کے ذریعے فلم کی ساکھ بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے اخبارات میں اپنے تعلقات کے ذریعے فلم کے متعلق مثبت نقش ابھارنے کی کوشش کی۔ ایک رات وہ صبح تین بجے تک اپنے دفتر میں چھ صفحات پر مشتمل ایک خط تیار کرتے رہے جس میں دہلی کی وزیر اعلیٰ شیلا ڈکشٹ سے درخواست کی گئی تھی کہ اس فلم کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ اس طریقے کے ذریعے ٹکٹوں کی قیمت کم ہو جاتی اور شاید زیادہ ناظرین سینما گھروں کی طرف رخ کرتے۔ جوہی کا خیال تھا کہ جب شاہ رخ خان اپنے مخصوص انداز میں اپنے معاملے کی وکالت کرے گا تو کامیابی حاصل ہو جائے گی لیکن یہ سب کچھ بے سود ثابت ہوا۔

مزید براں دیگر کاروباری معاملات اس بنیاد پر طے کیے گئے تھے کہ اس فلم سے کافی آمدن حاصل ہوگی لیکن یہ توقع عبث رہی۔ جن ادائیگیوں کے لیے وعدے کیے گئے تھے، ان کے لیے رقم میسر نہ ہو سکی۔ کم از کم صرف ایک تقسیم کار نے شاہ رخ خان کو تجویز پیش کی کہ اس کے نقصان کا ازالہ کرنے کے لیے شاہ رخ خان اس کے دوست کی شادی کی تقریب میں رقص کرے۔ مہینوں تک یہ تینوں ذمہ دار اپنی فلم کے متعلق روزانہ اطلاعات کا جائزہ لیتے۔ وہ پہلی منزل پر واقع ”کمرۂ اجلاس“ میں بیٹھ جاتے اور فلم کی مایوس کن آمدن کے متعلق اطلاعات سنتے اور منفی جائزوں اور تبصروں کے متعلق اظہار خیال کرتے۔ اس دوران اکثر ان میں سے ایک شخص یا بعض اوقات تینوں افراد آنسو بہانے لگتے۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر روتے اور ایک دوسرے کو دلاسہ دیتے۔ عزیز ذاتی طور پر خود کو اس تباہی کا ذمہ دار سمجھتا۔ شاہ رخ خان اور جوہی اس کے بچوں کے مانند تھے۔ اس نے ان دونوں کی پیشہ وارانہ اور تشخص کے لحاظ سے نشوونما کی تھی۔ ان کے ساتھ طویل عرصے سے قائم رفاقت کے دوران پہلی دفعہ اس نے محسوس کیا کہ اس نے ان دونوں کو ناکام کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب یہ شدید غم ان کی برداشت سے باہر ہو گیا تو انہوں نے ممبئی کو الوداع کہہ دیا۔ شاہ رخ کہنے لگا: ”ہم ناکام ہو گئے، شاید ہم اپنی ناکامی کے لیے یہ استدلال اور بہانہ سوچیں کہ یہ فلم اپنے زمانے سے کہیں آگے کی فلم ہے

یا اس کا موضوع عالمگیر نوعیت کا حامل نہیں ہے لیکن ممکن ہے کہ یہ محض ایک بری فلم ہو۔ ہم اس قدر احمق نہیں ہیں کہ یہ حقیقت بھی تسلیم نہ کر سکیں۔“

اس ناکامی اور نقصان کے باوجود شاہ رخ خان، جوہی اور عزیز نہ تو اپنے موقف سے پیچھے ہٹے اور نہ ہی انہوں نے روایتی فلم (وہ رومانی کردار جو شاہ رخ خان کے لیے مخصوص ہو چکا تھا) میں اپنے لیے اطمینان و سکون ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ تینوں شراکت دار سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب ان کے پاس جو متبادل حل موجود ہیں: یا تو اپنا یہ کاروبار بند کر دیں یا پھر اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق ایک اور فلم تیار کریں۔ اس لیے اب انہوں نے فیصلہ کیا کہ رومان سے بھرپور فلم تیار کرنے کے بجائے وہ ایک افسانوی کردار کی حامل تیسری صدی قبل از مسیح کے ایک پر امن شہنشاہ اشوکا کے سنہری دور کے متعلق واقعات پردۂ سیمیں پر منتقل کریں۔

اس فلم کا ہدایتکار سنتوش سیون تھا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ بکھری رہتی تھی، اس کے بال ہوا میں لہراتے رہتے اور اس کی ہنسی بہت گونجدار تھی۔ شاہ رخ خان اسے ”سانتا“ کے نام سے پکارتا تھا۔ سنتوش اپنے سکول کے زمانے سے اس حیرت انگیز اور افسانوی کردار کے حامل شہنشاہ اشوکا سے بہت متاثر تھا اور وہ ایک عرصے سے یہ خواہش اپنے دل میں رکھے ہوا تھا کہ وہ اشوکا کے متعلق فلم تیار کرے۔ سنتوش اور شاہ رخ خان ”دل سے“ کی تیاری کے دوران 1997ء میں باہم دوست بن گئے تھے اور سنتوش نے ہی اس فلم کی عکس کاری کی تھی۔ فلم کا ایک حصہ ہمالیہ کی وادی میں واقع خوبصورت لیکن انتہائی بنجر علاقے لداخ میں عکس بند کیا گیا جب کہ زیادہ تر عملہ اس بلند و بالا مقام پر موسمی بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ سنتوش اور شاہ رخ خان چونکہ بہت زیادہ سگریٹ نوش تھے لہٰذا یہ دونوں قدرے تندرست رہے۔ یہ دونوں ہاکی کے عمدہ اور ذہین کھلاڑی بھی تھے۔

سنتوش شاہ رخ خان میں موجود توانائی اور حوصلے و ولولے سے بہت متاثر تھا اور اس کے اس جذبے اور جوش کا بھی قدردان تھا کہ جس کے ذریعے وہ تخلیقی اور مادی خطرات مول لینے سے نہیں گھبراتا تھا۔ ممکن تھا کہ دیگر اداکار ایک متحرک ریل گاڑی کی چھت پر رقص کرنے سے خوفزدہ ہوتے لیکن شاہ رخ خان نے ایک ثانیے کی ہچکچاہٹ کے بغیر ”چھیاں چھیاں“ گانے کی حامی بھر لی۔ اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ وہ رقص کے دوران بہت ہی غیر معمولی

کارکردگی کا مظاہرہ کرے اور اس کی جسمانی حرکات اس قدر انوکھی اور استعجاب آمیز ہوں کہ ناظرین دنگ رہ جائیں۔ اس نے ریل گاڑی کی چمنی پر بھی رقص کرنے کی پیشکش کی رقص کے لیے نامزد ہدایتکار فرح نے ''چھیاں چھیاں'' کے لیے مخصوص رقص کی ہدایتکاری کی تھی۔ اس نے کہا: ''شاہ رخ خان یہ امر یقینی بنانا چاہتا تھا کہ ''چھیاں چھیاں'' اس قدر شاندار ہو کہ آئندہ کوئی بھی اداکار ریل گاڑی پر رقص کرنے کی ہمت نہ کر سکے اور آج تک کوئی دوسرا اداکار یہ خطرہ مول لینے کی ہمت نہیں کر سکا۔ شاہ رخ خان نے اس سے پہلے کسی تاریخی فلم میں اداکاری نہیں کی تھی لیکن سنتوش کا خیال تھا یہ کردار لازمی طور پر شاہ رخ خان کو ادا کرنا چاہیے جب وہ ریل گاڑی کی چھت پر بیٹھے تھے تو سنتوش نے شاہ رخ سے پوچھا: ''کیا تم اشوکا کا کردار ادا کرو گے؟'' تو شاہ رخ نے جواب دیا: ''میں ہی کیوں کیا میری شکل اشوکا جیسی ہے؟'' اس ضمن میں بہت کم مستند تاریخی روایتیں موجود ہیں کہ اشوکا کی شکل و شباہت کیسی تھی لیکن سنتوش کی کہانی میں کچھ تاریخ، کچھ افسانوی کردار اور کچھ تخیلاتی عناصر موجود تھے جو اس امر کو یقینی بنانے کے لیے کافی تھے کہ شاہ رخ خان اس فلم کے لیے مرکزی کردار کے علاوہ فلمساز کی ذمہ داریاں بھی نبھائے۔

اشوکا ایک ایسی فلم تھی جس کے ذریعے ہمیں یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ جنگ ایک بے کار اور فضول شے ہے۔ سنتوش نے اپنی کہانی میں اشوکا کی ڈرامائی زندگی کا پہلو اجاگر کیا تھا۔ فلم کی کہانی کا آغاز ایک رومانی ہیرو کے ساتھ ہوتا ہے جو ایک شہزادی کے ساتھ کھیتوں کھلیانوں میں اچھلتا کودتا ہے لیکن یہ خوبصورت اور حسین منظر نامہ مار دھاڑ اور قتل و غارت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اشوکا اپنے دھوکے باز سوتیلے بھائیوں کو قتل کر دیتا ہے تاکہ اس کے شہنشاہ بننے کا راستہ ہموار ہو جائے اور پھر وہ نہایت بے رحمی کے ساتھ ہندوستان بھر میں فتوحات کا سلسلہ شروع کر دیتا ہے۔ اقتدار کے لیے اس کی خواہش اس قدر شدید اور جنونی ہو جاتی ہے کہ اس کی بیوی بھی اسے چھوڑ جاتی ہے۔ فلم کے آخر میں ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کا منظر دکھایا جاتا ہے جب شہنشاہ میدان جنگ میں لاشوں کے درمیان لڑکھڑاتا ہوا چلتا آتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی یہ فتح تو بہت ہی افسوسناک اور غمگین ہے۔ جنگ میں کوئی بھی فاتح نہیں ہوتا۔ اشوکا اپنی سلطنت سے دستبردار ہو جاتا ہے اور اپنی باقی ماندہ تمام زندگی امن پر مبنی بدھ تعلیمات کی تبلیغ پر صرف کر دیتا ہے۔

سنتوش کے ذہن میں اس امر کے متعلق قطعی کوئی خیال نہیں تھا کہ ناظرین کا ایک ایسی فلم کے متعلق ردعمل کیا ہوگا جس میں کسی فریق کو بھی فتح حاصل نہیں ہوتی لہٰذا اس نے اپنے منصوبے کے مطابق فلم کو ہر لحاظ سے کم از کم حد تک رکھنے کا فیصلہ کیا۔ سنتوش کو معنوی کہانیاں بیان کرنے کا اس لحاظ سے سلیقہ آتا تھا کہ اخراجات کم سے کم ہوں لیکن معیار کم نہ ہو۔ اس کی دوسری فلم "The Terrorist" صرف پچیس ہزار ڈالر خرچ کر کے تیار کی گئی لیکن اس قدر زبردست تھی کہ امریکہ میں اس کی نمائش کرنے کے لیے جان مالکووچ نے اس میں کام کرنے کی حامی بھر لی لیکن ایک اداکار اور عظیم اداکار کی حیثیت سے شاہ رخ خان کی حیثیت مایوسی اور ناامیدی کا مظہر نہیں تھی۔ ''پھر بھی دل ہے ہندوستانی'' کی ناکامی نے اس کی جبلت میں کوئی رخنہ نہیں ڈالا تھا لہٰذا اشوکا کے لیے رقم تو دگنی کر دی گئی لیکن اس میں چکا چوند اور چمک بھڑک پر مبنی مناظر بھی مزید شامل کیے گئے۔

حالانکہ اس فلم کا مرکزی خیال دلکش نہ تھا لیکن پھر بھی یہ ایک نظری شہوانی فلم تھی۔ سنتوش نے سرسبز وسیع جنگل اور آبشاریں فلمی مناظر میں شامل کیں۔ کرینہ کپور بھی اپنے خوبصورت لباس میں انتہائی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ فلم کے پہلے نصف حصے میں زیادہ تر شاہ رخ خان اپنے رومانوی کردار میں موجود رہا اور اس بار اس نے دھوتی اور زیورات پہنے ہوئے تھے۔ لڑائی کے ایک منظر کے لیے شاہ رخ خان نے کیرالہ سے مارشل آرٹ کا ایک قدیم فن سیکھا۔ یہ تمام مناظر جے پور کے بیرونی اطراف میں چوبیس میل دور دریا کے کنارے فلمائے گئے۔ اس فلم کی عکس بندی کے لیے چھ کیمرے، آٹھ ہزار افراد، پانچ سو گھوڑے اور عملے کے 728 لوگ درکار تھے۔ شہنشاہ کی زندگی کی آخری جنگ کے مناظر چار دن میں فلمائے گئے۔ جنگ کے اس قدر بڑے اور وسیع مناظر پہلی بار کسی ہندی فلم میں پیش کیے گئے تھے۔

اشوکا کی نمائش کا آغاز 26 اکتوبر 2001ء کو ہوا۔ اس سے تین ماہ قبل ایک اور موضوعاتی اور تاریخی فلم ''لگان'' نمائش کے لیے پیش ہو چکی تھی۔ اشوکا کے مانند ''لگان'' بھی تاریخی اور موضوعاتی فلم تھی۔ یہ پہلی فلم تھی جس کا فلمساز عامر خان تھا۔ عجب بات یہ ہے کہ اس فلم میں عامر نے جو مرکزی کردار ادا کیا تھا اس کی پیشکش اس سے قبل شاہ رخ خان کو کی گئی تھی۔۔۔۔ ''لگان'' کا ہدایتکار ایشوتوش اس سے قبل شاہ رخ خان کے ساتھ ''سرکس'' میں کام کر چکا تھا۔ ایشوتوش کے لیے عامر اولین ترجیح تھا لیکن عامر کے انکار کے بعد ہدایتکار نے شاہ رخ خان

کے ساتھ کام کرنے کا ارادہ کیا جو اسے پسند کرتا تھا۔ چھ ماہ تک شاہ رخ خان اور ایشوتوش فلمسازوں کو اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' نے ابھی حال ہی میں زبردست کامیابی حاصل کی تھی اور شاہ رخ خان کی مانگ بہت زیادہ تھی۔ جب کسی فلمساز نے بھی انہیں گھاس نہیں ڈالی تو شاہ رخ خان اس منصوبے سے دستبردار ہو گیا پھر ایشوتوش نے اپنے اس مسودے کی مزید تراش خراش کی اسے مزید نکھارا اور اس نے اپنی سابقہ ترجیح عامر کے ساتھ رابطہ کیا اس بار عامر رضامند ہو گیا۔ وہ اداکار کے علاوہ فلمساز کے فرائض بھی سرانجام دینا چاہتا تھا۔

''لگان'' ان اجڈ اور گنوار دیہاتیوں کی کہانی ہے جو مقامی انگریز فوجی افسروں کو کرکٹ کے کھیل میں مگن کر کے اپنی زمینوں پر عائد سرکاری محصول ختم کروانا چاہتے ہیں۔ عامر اس فلم کے لیے زیادہ مناسب نہ تھا لیکن اس وقت وہی ایک اداکار دستیاب تھا۔ ہندی فلموں کی طوالت کے اعتبار سے یہ فلم غیر معمولی حد تک طویل تھی کیونکہ اس کا دورانیہ تین گھنٹے چوالیس منٹ تھا۔ جس دور میں جدید انداز واطوار، لباس اور غیر ملکی خوبصورت اور دلکش مقامات ہی کامیابی کی ضمانت سمجھے جاتے ہیں وہاں اس فلم کے دیہاتی پس منظر اور دھوتی کرتے کے استعمال کے باعث یہ فلم خطرناک حد تک مروجہ معمول کے خلاف تھی لیکن یہ فلم جو بے تصنع، حب الوطنی اور کرکٹ کے لیے ہندوستانیوں کی بے تحاشا محبت کا غماز تھی اپنی کامیابی کے سیلاب میں سب کچھ بہا کر لے گئی۔ یہ تیسری ہندوستانی فلم تھی جس نے غیر ملکی زبان میں بننے والی بہترین فلم کے لیے آسکر ایوارڈ کی نامزدگی حاصل کی۔ اسی طرح شاہ رخ خان کو امید تھی چونکہ ''اشوکا'' بھی ایک غیر روایتی، بدیسی اور خوبصورت فلم ہے، اسی کامیابی کی مستحق ٹھہرے گی۔

اشوکا کی نمائش کے بعد ابتدائی اشارے حوصلہ افزا تھے۔ اشوکا کو وینس اور ٹورنٹو کے مشہور عالم فلمی میلوں میں بھی مدعو کیا گیا تھا۔ ایک جرات مند بلکہ خطرے سے بھرپور قدم کے طور پر شاہ رخ، عزیز اور جوہی نے بذات خود تقسیم کنندگان بننے اور اپنے نجی اداروں کے ذریعے بیرون ملک اس کی نمائش کرنے کا فیصلہ کیا۔ ''اشوکا'' پہلی ہندی فلم تھی جسے بیرون ملک نمائش کے لیے بھرپور طور پر پیش کیا گیا تھا۔ انگلستان کے زیر زمین چلنے والی ریل گاڑیوں میں اس کے اشتہار آویزاں تھے اور اخبارات میں بھی اس کی بھرپور تشہیر کی گئی تھی اور شاہ رخ خان کو

''ہندی فلموں کے ٹام کروز'' کا خطاب دیا گیا تھا۔ اکثر تبصرے اور جائزے مثبت نوعیت کے تھے۔ ''ٹائمنز'' کے جیمز کرسٹوفر نے تبصرہ کرتے ہوئے یوں اظہار خیال کیا: ''خوبصورت اور دلکش رنگوں، طوالت اور چمکتے دمکتے دھڑ کیلے مناظر کے لحاظ سے برطانوی فلمیں اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ اس فلم کو جو چیز خوبصورت اور دلکش بناتا ہے وہ اس فلم کا غنائیہ قدیمی انداز ہے۔ امریکہ اپنی دلکش اور خوبصورتی سے اس وقت محروم ہو گیا جب 'کاؤ بوائز'' متروک ہو گئے۔

لیکن سینما گھروں میں اس کی بھرپور کامیابی کے آثار واضح نہیں تھے۔ انگلستان میں یہ فلم صف اول کی پہلی دس فلموں میں شامل تھی لیکن جلد ہی یہ اپنا مقام کھو بیٹھی ...... ہندوستان میں بھی شائقین نے شاہ رخ خان کو اس کے روایتی رومانوی کرداروں ''راج اور راہول'' ہی میں دیکھنا زیادہ پسند کیا۔ ''اشوکا'' کی کارکردگی ممبئی اور جنوبی ہندوستان میں اچھی رہی لیکن ملک کے باقی ماندہ حصوں دہلی، راجھستان، اتر پردیش میں اسے نمایاں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ''اشوکا'' کی شرح آمدنی شاہ رخ خان کی ایک باقاعدہ فلم سے بھی کم رہی لہٰذا فلم کے تقسیم کنندگان کو تو نقصان نہیں پہنچا لیکن شاہ رخ خان، عزیز اور جوہی کے ادارے کو چالیس ملین روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ خاص طور پر بیرون ملک تقسیم کنندگان بننے پر مبنی ان کا فیصلہ نہایت غلط ثابت ہوا اور پھر دوبارہ شاہ رخ، عزیز اور جوہی کمرہ اجلاس میں سر جوڑ کر بیٹھے اور آہ و بکا کرنے لگے۔ اور یہ بھی نہایت عجیب بات تھی کہ شاہ رخ، عزیز اور جوہی کے مشترکہ ادارے Dreamz Unlimited کو اس وقت کامیابی نصیب ہوئی جب انہوں نے کوئی خطرہ مول لیے بغیر فلم تیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ 2003ء میں اس ادارے نے ''چلتے چلتے'' نامی فلم تیار کی جس کی ہدایتکاری عزیز نے کی اور شاہ رخ خان نے وہ تمام امور سرانجام دیے جس میں اسے بہترین دسترس حاصل تھی۔ مثلاً ایک شوخ و چنچل لڑکی سے عشق، کچھ ڈرامائی مناظر کے بعد ہیروئن کے باپ کی گمشدگی، رونا دھونا اور بالآخر عشق میں کامیابی۔ بہرحال یہ وہ کہانی نہیں تھی جو ان شراکت داروں کے تصورات میں موجود تھی۔ (شاہ رخ خان اسے ''سمجھوتہ اور مصلحت'' قرار دینے سے ہچکچا رہا تھا) لیکن یہ فلم کامیاب رہی۔ بہرحال اس فلم کے باعث ان کے ادارے میں ناموافقت پیدا ہو گئی۔ اس وقت جوہی ماں بننے والی تھی لہٰذا ''چلتے چلتے'' میں ہیروئن کا کردار ایک نوجوان اور مشہور اداکارہ رانی مکرجی نے ادا کیا۔ اس وجہ سے جوہی پریشان

ہوگئی کہ اسے بحیثیت اداکارہ نظرانداز کیا جارہا ہے لہٰذا اس نے شراکت داری سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے بعد "Dreamz Unlimited" نے کبھی کوئی فلم تیار نہیں کی۔

شاہ رخ خان کا کہنا تھا: ''ہم نے اپنی فلموں سے کامیابی سے کہیں بڑھ کر لطف حاصل کیا کیونکہ میرے خیال کے مطابق ہم ایک دوسرے کو ناراض کرنے میں کامیاب ہوگئے۔'' یہ ادارہ کاغذی طور پر قائم رہا اور شاہ رخ خان کا خیال تھا کہ جب ہم تینوں شراکت دار ایک اچھے اور ولولہ انگیز کہانی پر متفق ہوگئے تو پھر اکٹھے ہوجائیں گے۔ ان کے ادارے کے دفاتر میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ شاہ رخ خان کے کمرے کے دروازے پر نصب نام کی تختی کے بجائے اب وہاں "Red Chillies Entertainment" کا تختہ آویزاں تھا جو شاہ رخ خان کے قائم کردہ فلمسازی کے نئے ادارے کا نام ہے۔ شاہ رخ خان نے ایک مختلف قسم کی فلم تیار کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ ادتیا اور کرن کی فلموں میں اس کی پائیدار اور مستقل کامیابی نے اسے زیادہ سے زیادہ تجربے سے مالا مال کردیا۔ فرح کی ہدایتکاری کے تحت تیار ہونے والی فلم ''میں ہوں ناں'' (2004ء) کے مانند اس کی چند فلمیں کامیاب رہیں جبکہ پہلے جیسی فلمیں جس میں اس نے ایک اجڈ گنوار دیہاتی کا کردار ادا کیا مکمل ناکامی سے دوچار ہوئیں۔ شاہ رخ خان نے ایک دفعہ کہا: ''فلم میں کام کرتے ہوئے میں نے کبھی کاروباری مفاد پیش نظر نہیں رکھا۔ فلم، دولت اور علم کا امتزاج ہے۔ میں نے ہمیشہ علم کو ترجیح دی ہے اور دولت ہمیشہ میرے پیچھے پیچھے رہی ہے۔ ممکن ہے کہ میں ضدی اور احمق ہوں لیکن یہی سب کچھ میرے لیے کارآمد اور مفید ثابت ہوا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ فلم ایک کاروبار ہے لیکن میں نے ہمیشہ علم اور فن بانٹا ہے۔''

❁

سولہواں باب

دیوداس

فرانسیسی تنقید نگار میخائل مورلے کا یہ قول اور تبصرہ بہت مشہور ہے: ''شارلٹن ہیسٹن ایک مسلمہ اور مستند حقیقت ہے، وہ تن تنہا المیہ بھی تخلیق کرسکتا ہے اور اس کی کسی فلم میں موجودگی خوبصورتی اور غنائیت کی غماز اور علامت ہے۔'' 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں کے دوران صف اول کے اداکار دلیپ کمار نے بھی اسی قسم کی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ ناظرین، تجزیہ نگاروں، اداکاروں اور فلمسازوں کی ایک مکمل نسل کے لیے دلیپ کمار جیسی مستند مسلمہ شخصیت کی موجودگی اس امر کا ثبوت تھی کہ ہندوستانی فلمیں فن کا شاہکار ہوتی تھیں۔ اس نے ہندوستانی فلموں میں اپنی اداکاری کے ذریعے نکھار پیدا کردیا۔ دلیپ کمار فلمی صنعت کی ایک کھری، سچی اور پرخلوص شخصیت تھی۔

شاہ رخ خان میں اس کہنہ مشق اور تجربے کار، عظیم اداکار کی جھلک کم کم ہی موجود تھی۔ اس میں موجود مضطرب توانائی و جوش دلیپ کمار کی پروقار مدبر شخصیت کے بالکل متضاد تھا۔ فلمسازوں نے شاہ رخ خان میں راجیش کھنہ کی جھلک محسوس کی جس نے اپنے نفیس انداز واطوار کے باعث ہیجان برپا کردیا یا پھر مردانہ وجاہت وترنگ کا نمونہ شمی کپور جس نے پہاڑوں سے نیچے بھاگتے ہوئے ہیروئنوں سے رومان کیا یا پھر غیر معمولی ذہین کشور کمار جس میں موجود جذباتی توانائی نے فلم کی کہانی کو اپنے حصار میں لیے رکھا۔ فاطمہ شاید وہ پہلی ہستی تھی جس نے شاہ رخ خان کی دلیپ کمار کے ساتھ مشابہت محسوس کی۔

لہٰذا جب فلمساز سنجے لیلا بھنسالی نے یہ کہا کہ ماضی کی شاہکار المیہ فلم دیوداس کو دوبارہ بنانے کے لیے مناسب یہی ہے کہ دلیپ کمار کا کردار شاہ رخ خان ادا کرے تو فلمی ناخداؤں نے اسے دلیپ کمار کی توہین قرار دیا۔ شاہ رخ خان کا ناظرین کے ساتھ ایک مضبوط تعلق قائم تھا لیکن ایک اداکار کی حیثیت سے اس کی اہمیت کم تھی۔ وہ ایک ان تھک رومانی ہیرو تھا جس کی

دلفریب دلکشی رومانویت کے لیے بالکل مناسب اور موزوں تھی۔ وہ ایک لاثانی اداکار تھا لیکن اس کے متعلق سنجے کا نقطہ نظر زیادہ بصیرت افروز تھا۔ اس نے کہا: ''اس نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کی آنکھیں اداسی سے لبریز تھیں جس نے اپنی اندرونی افسردگی کو اپنی متحرک توانائی و ترنگ اور بے ساختہ و برجستہ گفتگو میں چھپا لیا تھا۔'' سنجے کی نظر میں شاہ رخ خان میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کی شخصیت مستقل طور پر زخم خوردہ معلوم ہوتی تھی۔ اسے یقین کامل تھا کہ صرف شاہ رخ خان ہی دیوداس ہو سکتا ہے۔

یہ تصور شاہ رخ خان کی شخصیت کا ادراک کرتے ہوئے شاید سنجے کی اپنی فطرت و جبلت کا شاخسانہ تھا۔ سنجے ایک ذہین اور متحرک شخص تھا جس نے سخت محنت کے ذریعے کامیابی حاصل کی تھی۔ کرن اور ادتیا کے مانند اس کا تعلق بھی ایک فلمی خاندان سے تھا، کرن اور ادتیا کے باپوں کے برعکس اس کا باپ صف اول کے فنکاروں میں شامل نہیں تھا۔ نوین بھنسالی نہایت مختصر مدت کے لیے فلمسازی کے میدان میں رہا اور کثرت شراب نوشی کے باعث فوت ہو گیا اور اپنے گھرانے کو اس قدر بری حالت میں چھوڑ گیا کہ سنجے کی ماں لیلا جس کا نام سنجے نے اپنے نام کے ساتھ شامل کیا گھر گھر صابن فروخت کرنے پر مجبور ہو گئی۔ مشکلات و مسائل سے بھرپور اپنے بچپن کی ایک یاد ابھی تک اس کے ذہن میں موجود تھی کہ قرض خواہ نہایت طیش کے عالم میں گھر کے دروازے پر زوردار دستک دیتے تو وہ پلنگ کے نیچے چھپ جاتا۔ سنجے نے تدوین کا ہنر ''فلم اینڈ ٹیلیویژن انسٹیٹیوٹ آف انڈیا'' سے سیکھا تھا لیکن اسے فلموں میں زیادہ تجربہ حاصل نہ ہوا تھا۔ بہرحال اسے ''نغمہ اور رقص'' جیسے مناظر پر ملکہ حاصل تھا اور جذباتیت و رنگوں سے کھیلنے کا ماہر تھا۔ اگرچہ اس کی پہلی فلم "Khamoshi- The Musical"(1996) بری طرح ناکام ہوئی تھی لیکن 1999ء میں اس نے ''ہم دل دے چکے صنم'' تیار کی جو بہت ہی کامیاب رومانی فلم تھی۔ تیسری فلم تیار کرنے کے لیے سنجے دیوداس کو جدید انداز میں ڈھالنا چاہتا تھا۔ یہ ایک نہایت ہی مناسب اور معقول صورت حال تھی۔ دیوداس ہندوستانی ادب میں ایک علامتی اور افسانوی المیہ کردار ہے۔ یہ ناول پہلی بار 1917ء میں شائع ہوا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کی تصنیف کہیں پہلے 1901ء میں ہوئی تھی لیکن اس کا مصنف شرت چندر چٹرجی اس بناء پر اسے شائع کرنے سے ہچکچا رہا تھا کہ وہ اپنے اس ناول کو اس بناء پر معیاری نہیں سمجھتا تھا کہ اس کی تصنیف اس وقت ہوئی تھی جب اس کا ذہن شراب کے نشے کے

باعث اپنے حواس میں نہ تھا۔ مصنف کا ذہن نشے کے باعث چکرا رہا تھا اور یہ ''کردار'' تخلیق ہو گیا۔ ''دیوداس'' ایک مغرور لیکن متذبذب شخص کی کہانی ہے جو والدین کی مرضی کی مخالفت نہیں کر سکتا اور نہ ہی اپنے بچپن کی محبت پارو کے ساتھ شادی کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ پارو کی شادی ایک عمر رسیدہ رنڈوے کے ساتھ ہو جاتی ہے پھر دیوداس اپنے ہی احمقانہ پن اور دل کی تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ چندرمکھی نامی ایک مہربان طوائف کے چنگل میں گرفتار ہو کر اپنی زندگی کو گھن لگا لیتا ہے اور بالآخر کثرت شراب نوشی اور بیماریوں کے باعث وہ پارو کے گھر کے دروازے کے باہر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ دیوداس ایک بزدل اور متذبذب شخص ہے جس میں حیرت انگیز طور پر اپنی محبت حاصل کرنے کی ہمت تو نہیں ہے لیکن اپنی محبت کی خاطر اپنی جان قربان کرنے کا حوصلہ ضرور موجود ہے۔ محبت کی تکون پر مشتمل یہ ناول اپنی اشاعت کے وقت تو مقبولیت نہ حاصل کر سکا لیکن جب اس ناول کو پردہ سیمیں پر منتقل کیا گیا تو یہ جذباتی منظرنامہ ایک دیومالائی حیثیت اختیار کر گیا۔

اس ناول کو سب سے پہلے 1928ء میں فلمایا گیا۔ بعد میں کئی دیگر زبانوں میں اس کے مزید دس نمونے تیار کیے گئے۔ 1925ء میں ہدایتکار پی۔ سی باروا نے عظیم گلوکار کے ایل سہگل کو دیوداس کا کردار دیا اور نشے میں دھت مرتے ہوئے عاشق کو ایک عوامی نام دے دیا۔ بیس سال بعد باروا کی ''دیوداس'' کے عکس کار بمل رائے نے اس فلم کو دوبارہ بنایا۔ اگرچہ یہ ''دیوداس'' سینما گھروں میں کامیابی نہ حاصل کر سکی لیکن اس فلم کو پردہ سیمیں کی تکنیک کے مطابق قطعی طور پر درست قرار دیا گیا۔ دلیپ کمار کی بردبار اور پروقار کارکردگی ہندی فلموں میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ نام ایک روزمرہ محاورے کی حیثیت سے مشہور ہو گیا تھا۔ یہ کردار ایک ''مخصوص حالت'' کی علامت کے طور پر ابھرا تھا جہاں کہیں بھی کوئی شخص غم کے مارے دبلا پتلا ہو جاتا یا پھر کسی کے لیے طیش میں آ جاتا تو اس کے لیے کہا جاتا کہ وہ ہو بہو دیوداس ہے۔

ہندوستانی فلمی صنعت اس شاہکار کے ساتھ ''چھیڑ چھاڑ'' کرنے کے سنجے کے فیصلے کے باعث معقول طور پر اضطراب اور پریشانی کا شکار ہو چکی تھی۔ بمل رائے اور دلیپ کمار نے کارکردگی کا ایسا بلند مقام متعین کر دیا تھا کہ ان کے بعد ''دیوداس'' کے مانند اس کا کوئی بھی چربہ مستقبل میں کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا تھا۔ موجودہ دور کے تیز رفتار اور جدید ہندوستان

کے حوالے سے جہاں عاشق نشے میں دھت ہو کر افسوسناک انداز میں اپنی جان قربان کرنے کے بجائے ایک نئے جذبے اور ولولے سے سرشار ہو جاتے ہیں، دیوداس کا حوالہ نہایت غیر ضروری اور بے وقعت معلوم ہوتا تھا۔ فلمی دنیا کے ماہرین کے استدلال کے مطابق مختلف النوع ناظرین ایک دوسری صدی کے قدیم قسم کے ناکام عاشق کو بمشکل ہی برداشت کر سکتے تھے لیکن سنجے جس نے اس ناول کا مطالعہ پہلی دفعہ اپنی نوعمری میں کیا تھا، اس کی خواہش تھی کہ وہ اس ناول کو موجودہ نسل کے لیے پردہ سیمیں پر منتقل کرے۔ بمل رائے کی شخصیت کا تاثر قطعی طور پر فطری تھا۔ اس کی تیار کردہ ''دیوداس'' میں دیہی بنگال کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ اجاگر کیا گیا تھا۔ اس ضمن میں سنجے کا تخیل جذباتی اور فطری طور پر شوخ و چنچل تھا۔ اس کے دل نے صدا دی ''آگے بڑھو کامیابی تمہاری ہے!''

تو پھر سنجے نے اب تک تیار ہونے والی ہندی فلموں میں سے سب سے مہنگی فلم کا خاکہ متشکل کر لیا۔ اس کی فلمبندی کے لیے عظیم الشان ''عارضی مقامات'' تیار کروائے گئے۔ چندرمکھی کا کوٹھا جہاں وہ رقص کرتی ہے اور دیوداس کی دیکھ بھال کرتی ہے ایک آراستہ پیراستہ مقام تھا جس کے لیے 120 ملین روپے خرچ کیے گئے۔ پارو کا گھر جو ایک لاکھ ستاون ہزار کندہ کیے ہوئے شیشے کے ٹکڑوں سے جگمگا رہا تھا۔ اس کے نفس حسن کا استعارہ تھا اور اس مکان پر ہزاروں روپے خرچ کیے گئے تھے۔ فلم کا ہر نغمہ چمکدار اور شوخ انداز میں فلمایا گیا تھا جس کے لیے کثیر تعداد میں مشق کی گئی تھی اور درجنوں رقاص اور رقاصائیں شریک ہوئی تھیں۔ بالآخر فلم کے اخراجات پانچ سو ملین روپے تک پہنچ گئے۔

اس شاندار اور عظیم الشان فلم کے لیے فلمی صنعت کی ایک نہایت ہی طاقتور شخصیت بھرت شاہ سرمایہ مہیا کر رہا تھا۔ اس کے پاس موجود نقدی کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ وہ ''بھرت بھائی'' کے نام سے مشہور تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ بیس بلین روپے کی ایک سلطنت کا مالک ہے اور اس کا کاروبار ہیرے جواہرات، تعمیرات اور فلموں پر محیط ہے۔ وہ نہایت قیمتی قمیصوں اور ہیرے جواہرات سے جڑی کلائی گھڑیوں کا شوقین ہے اور جنوبی ممبئی میں واقعی اس کا گھر نہایت ہی شاندار اور عظیم الشان ہے اور فیشن کی دنیا کے اخبارات و رسائل اس کے جدید اور چکا چوند انداز زندگی کے تذکروں سے بھرپور ہوتے ہیں۔ اسے بچپن ہی سے فلمیں پسند تھیں۔ سب سے بڑھ کر وہ ہندوستانی فلمی صنعت میں ''بادشاہ گر'' کی حیثیت کا مالک تھا۔ 1995ء میں اس

نے تعمیراتی کاروبار میں اپنے تعلقات کے ذریعے شاہ رخ خان کو اپنا گھر خریدنے میں معاونت مہیا کی تھی۔ 1968ء میں بھرت کے خاندان نے فلموں کے تقسیم کار کی حیثیت سے اپنا ادارہ قائم کیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے تقریباً دو سو مختلف فلموں کے لیے تقسیم کار اور فلمساز کی حیثیت سے پیشہ وارانہ خدمات مہیا کیں۔ بھرت نے تمام مشہور افراد کے ساتھ کام کیا اور کئی ایک چھوٹے سرمایہ کاروں کو ان کے ان منصوبوں کے لیے سرمایہ مہیا کیا جو سرمائے کی کمی کے باعث عرصہ دراز سے رکے ہوئے تھے۔ مختلف قسم کی صنعتیں صرف اسی کے دم قدم سے قائم تھیں۔

شاہ رخ کے ساتھ سنجے کی ملاقات فروری 2000ء میں اس وقت ہوئی جب وہ ابھی تک ''پھر بھی دل ہے ہندوستانی'' کی ناکامی کے غم میں مبتلا تھا۔ اس کے ''دیوداس'' میں کام کرنے کے امکانات زیادہ واضح نہیں تھے۔ گزشتہ کئی سالوں سے اس کی شخصیت ''دیش راج انداز فکر'' میں ڈھل چکی تھی۔ اس کے کامیاب ترین کردار ایک ہی جیسے معلوم ہوتے تھے۔ اپنے آپ کو ''دیومالائی'' حیثیت سے ان کرنے کی اس کی کوششیں عام طور پر نہ تو زیادہ واضح تھیں اور نہ ہی کامیاب ثابت ہوئی تھیں۔ اس وقت تک شاہ رخ خان نے نہ تو کوئی واقعاتی یا تاریخی فلم میں کام کیا تھا اور نہ ہی دیوداس جیسا پیچیدہ اور اذیت ناک کردار ادا کیا تھا۔ شاہ رخ خان خاص طور پر اس منصوبے کے لیے پرجوش نہیں تھا لیکن جب سنجے نے اسے کہا کہ وہ صرف اس وقت یہ فلم بنائے گا جب شاہ رخ ''دیوداس'' کا کردار ادا کرنے کی حامی بھر لے گا۔ لہٰذا سنجے کے کہنے کے مطابق وہ اس فلم میں کام کرنے پر رضامند ہو گیا۔

فلم کے مسودے کے بیان کے دوران شاہ رخ کے چہرے پر بمشکل تمام جذباتی علامات نمودار ہوتی تھیں۔ وہ اپنے کردار اپنی جبلت کی حیثیت سے منتخب کرتا کیونکہ اکثر ایک منظر ہی اس پر اپنا نقش مرتب کر دیتا۔ جب شاہ رخ خان نے ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' کی تو وہ اس کی جذباتی قدر و قیمت کا قائل نہ ہو سکا لیکن اسے اس فلم کا وہ آخری منظر بہت پسند تھا جس میں سمرن کا باپ اپنی بیٹی کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہے اور اسے راج کے ساتھ جانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ اسے ''دیوداس'' اس لیے دلچسپ محسوس ہوئی تھی کہ اس میں رومان کے ساتھ ساتھ اضافی بربریت بھی موجود تھی...... ایک منظر میں دیوداس پارو کے گرد منڈلاتی ہوئی ایک مکھی کو محض اس لیے کچل دیتا ہے کہ وہ یہ امر برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی بھی اسے چھوئے۔ شاہ

رخ خان دیوداس کے خود تحقیری رویے کے ساتھ اپنا تعلق قائم نہیں کر سکتا تھا لہٰذا اس نے اس کردار کو مروجہ استدلال کے مطابق ڈھال لیا یعنی ایک ایسا شخص جو وعدہ نہیں کر سکتا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک ایسے گستاخ اور تنک مزاج بچے کا کردار ادا کرے گا جب اس کی ماں اس سے بسکٹ چھین لیتی ہے تو وہ اس بسکٹ کے حصول پر مصر ہوتا ہے۔ اس نے کہا: ''دیوداس ہر شخص پر نوے فیصد لاگو ہوتا ہے۔ لوگ وعدہ کرنے سے گھبراتے ہیں جس خاتون سے وہ محبت کرتے ہیں وہ اس کے دل کو ٹھیس پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ مردانہ وجاہت ہے۔ میں بھی دیوداس ہوں لیکن شراب نہیں پیتا۔''

پارو اور چندر مکھی نے اپنے اپنے کردار کے لحاظ سے ایک کنواری دوشیزہ اور بدکار عورت کی اداکاری خوب کی اور اپنے انداز واطوار سے اپنے اپنے کرداروں کے ساتھ مکمل انصاف کیا۔ ایک معصوم، مغرور اور بے داغ خوبصورتی اور حسن کی مالک تھی جبکہ دوسری عورت روایتی اخلاقی معیار کے مطابق ایک مہربان اور شہوانی ساتھی تھی۔ شاہ رخ خان اس فلم میں اپنے اس نظریے کی منظر نگاری چاہتا تھا کہ ''مرد کبھی ایک عورت سے محبت نہیں کرتا اور اپنی پسند کے ضمن میں وہ متذبذب ہو جاتا ہے۔ وہ عورت کو اپنی ملکیت بنانا چاہتا ہے لیکن وہ اس سے اکتا بھی جاتا ہے۔'' شاہ رخ خان کا ''دیوداس'' اس کے پہلے کرداروں کی نسبت زیادہ گھٹیا اور زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ شاہ رخ خان نے دلیپ کمار کی ''دیوداس'' نہیں دیکھی تھی۔ وہ اس پر اطمینان اور کامل آگہی اور یقین کے ساتھ اداکاری کے لیے تیار ہو گیا کہ ہندوستان کے کسی عظیم ترین اداکار کی نقالی نہیں کر رہا ہے بلکہ وہ اپنی شخصیت کو اس کردار میں سمو رہا ہے۔ ''اگر آپ کارل لیوس کے مدمقابل کام کر رہے ہیں تو آپ اطمینان وسکون کے ساتھ کام کرتے ہیں کیونکہ آپ اسے شکست نہیں دے سکتے اس کا کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔''

''دیوداس'' کی فلم بندی 7 نومبر 2000ء کو شروع ہوئی۔ ذرائع ابلاغ میں اس فلم کے متعلق مخالفت اور تنقید کا طوفان انتہائی درجے تک پہنچ گیا۔ اداکاروں میں بھی بڑے بڑے نام شامل تھے۔ ایشوریہ رائے پارو تھی، مادھوری ڈکشٹ نے چندر مکھی کا کردار ادا کیا اور جیکی شیروف نے دیوداس کے عیاش اور اوباش دوست چونی لال کے کردار کے لیے اداکاری کی۔ دیوداس کا یہی دوست اسے ''کوٹھے'' اور ''شراب'' کی طرف لے جاتا ہے۔ ''فلم سٹی سٹوڈیو'' جہاں فلم کی عکسی بندی کے لیے نہایت ہی عظیم الشان ''عارضی مقامات'' بنائے گئے تھے، کثیر

تعداد میں اخبارات کے تذکروں کی زینت بن چکے تھے۔ 8 دسمبر کو جب پارو کی حویلی میں ایک نغمہ فلم بند ہو رہا تھا تو ایک تکنیک کار ایک بڑے پنکھے کی زد میں آ کر نہایت ہی بہیمانہ طور پر ہلاک ہو گیا۔ ایک ماہ بعد ''دیوداس'' کو ایک زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔ بھرت شاہ کو ممبئی پولیس نے اس الزام کے تحت گرفتار کر لیا کہ وہ ایک جرائم پیشہ گروہ کے سرغنہ چھوٹا شکیل کے ساتھ متعدد جرائم میں ملوث ہے۔

اس وقت بھرت شاہ ایک فلم ''چوری چوری چپکے چپکے'' کی مالی اعانت کر رہا تھا۔ اس کا فلمساز ناظم رضوی نامی ایک شخص تھا۔ ناظم کو داؤد کے دست راست کی حیثیت سے شناخت کر لیا گیا تھا اور پھر اسے 13 دسمبر 2000ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ پھر اس نے پولیس کو بھرت کی نشاندہی کی۔ پولیس کو ایک ایسی ٹیپ دستیاب ہو گئی تھی جس میں ایک شخص داؤد کے نائب چھوٹا شکیل سے گفتگو کر رہا تھا۔ پولیس کے مطابق یہ شخص بھرت شاہ تھا جس وقت بھرت شاہ گرفتار ہوا اس وقت اس نے ایک اعشاریہ پچیس بلین روپے مالیت کی سرمایہ کاری دیوداس سمیت گیارہ فلموں میں کر رکھی تھی ...... اور ان میں سے سب سے بڑی فلم ''دیوداس'' تھی۔

دیوداس کی عکس بندی پر روزانہ سات لاکھ روپے سے زائد مالیت کی رقم صرف ہو رہی تھی۔ بعض اوقات روشنی کی دستیابی کے لیے کم از کم بیالیس جنریٹر درکار ہوتے۔ تکنیکی عملہ سیکڑوں افراد پر مشتمل تھا۔ بھرت شاہ کی گرفتاری کے سبب یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں یہ ''ٹائی ٹینک'' اپنے سفر پر روانہ ہونے سے قبل ہی ڈوب نہ جائے۔ پندرہ دن پر مشتمل فلم بندی کا منصوبہ فی الفور منسوخ کر دیا گیا۔ اب آسان حل یہ رہ گیا تھا کہ اخراجات کم کر دیے جائیں اور اس منصوبے کو کسی نقصان سے محفوظ کر لیا جائے لیکن بھرت اور سنجے دونوں پرعزم تھے کہ وہ اس منصوبے کو مکمل کیے بنا اس سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ بھرت شاہ نے اپنی بے گناہی پر مسلسل احتجاج جاری رکھا اور ممبئی قید خانے کی دہشت وہیبت سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کرتا رہا اور ساتھ ہی اس نے اپنے بچوں کو یہ ہدایات جاری کیں کہ ''دیوداس'' ہر قیمت پر مکمل ہونی چاہیے۔

یہ عجیب اور ناموافق صورت حال ایسے ہی ڈرامائی تھی جیسے بذات خود یہ فلم ڈرامائی تھی۔ اس وقت جب بھرت قید خانے کی ہوا کھا رہا تھا، فلم کی عکس بندی آن بان کے ساتھ جاری تھی۔ سنجے رقص کے نہایت شاندار مناظر فلما رہا تھا۔ رقص کے ایک منظر میں مادھوری ڈکشٹ نے جو

گھا گھرا پہنا تھا اس کا وزن پینسٹھ پاؤنڈ تھا...... اور رقص ختم ہونے کے بعد بھی اس کی قمیض کچھ دیر کو چکر کھاتی رہی۔ مزید براں شاعرانہ رومانی مناظر اور شدید اختلافی مکالمہ بازی بھی اس فلم میں شامل تھی۔ بھرت شاہ کا بیٹا راشیش کبھی ممبئی میں فلم کی عکس بندی کا جائزہ لے رہا ہوتا اور کبھی دہلی میں ہوتا جہاں قید خانے میں بند اپنے والد کے لیے درخواست ضمانت کے لیے کوششوں میں مصروف تھا۔ اس نے سنجے پر اخراجات کم کرنے کے لیے دباؤ ڈالنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے تصور اور نظریے پر کسی بھی قسم کا سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ راشیش کے کہنے کے مطابق: ''سنجے ایک بہت ہی مختلف شخص ہے انتہائی جذباتی جسے اخراجات کم کرنے کے متعلق خیال بھی نہیں۔''

لہٰذا دیوداس آہستہ آہستہ تکمیل کے مراحل طے کرتی رہی۔ فلم کی زیادہ تر عکس بندی رات کے وقت ہوتی تھی، اس لیے وسیع وعریض مقامات عکس بندی کو روشن کرنے کے لیے گھنٹوں صرف ہو جاتے۔ اداکارائیں جو نفیس پارچات، زیورات اور بناؤ سنگھار سے مزین ہوتی تھیں وہ بھی تیار ہونے میں غیر معمولی وقت صرف کرتیں...... بعض اوقات ایشوریہ کا بناؤ سنگھار چھ سے سات گھنٹے تک جاری رہتا۔ وہ ایام بھی آتے تھے جب تکنیک کار روشنیاں بجھا دیتے اور معاوضے کی ادائیگی کا مطالبہ کرتے اور بصورت دیگر کام کرنے سے انکار کر دیتے۔ سنجے ہاتھ باندھے ان سے التجا کرتا کہ وہ اپنا کام جاری رکھیں اور انہیں یقین دلاتا کہ بھرت شاہ جلد ہی رہا ہو جائے گا اور ان کے معاوضوں کی ادائیگی کر دی جائے گی لیکن عدالتوں میں بھرت شاہ کی ضمانت کی درخواستیں مسترد ہو رہی تھیں۔ اگست 2001ء میں ایک اور تکنیک کار بلندی سے گرا اور وہیں ہلاک ہو گیا۔ اب ماحول بہت ہی زیادہ کشیدہ ہو چکا تھا اور مایوسی، افسردگی اور پریشانی تمام منظر نامے کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔

اس فلم کا ''لب ولہجہ'' شاہ رخ خان کی زندگی کے ماہ وسال کے عین مطابق تھا۔ اس کے مطابق اس کی زندگی کے یہ ماہ وسال، غمگین اور افسوسناک مدت پر مشتمل تھے۔ بہر حال پیشہ وارانہ طور پر اس نے اڈتیا کی دوسری فلم ''محبتیں'' کے ذریعے ہریتک کے باعث اپنی گرتی ہوئی ساکھ بحال کر لی تھی۔ اس فلم کی کہانی سکول کے ایک مغرور قسم کے پرنسپل اور موسیقی کے استاد کے درمیان اختلاف پر مبنی تھی۔ موسیقی کے استاد کے روپ میں شاہ رخ خان نے اپنے رومانی مخصوص کردار راج کا اعادہ کیا تھا جس کا لہجہ انتہائی دھیما، گھمبیر اور سوگوار ہوتا ہے۔ راج کی

خاتون دوست خودکشی کر لیتی ہے لہٰذا وہ اپنے شاگردوں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ موقع سے فائدہ اٹھائیں اور آپس میں پیار ومحبت کا اظہار کریں لیکن سکول کا پرنسپل بغیر کسی وجہ کے رومانی زندگی کا انتہائی مخالف ہوتا ہے اور موسیقی کے استاد سے ناراض ہو جاتا ہے۔ ''محبتیں'' کی کہانی میں اتار چڑھاؤ کچھ خاص نہ تھا لیکن شاندار اور معیاری اداکاری نے فلم کو بانس پر چڑھا دیا تھا۔ شاہ رخ خان پہلی دفعہ اس اداکار امیتابھ بچن کے مقابل آیا تھا جس کی وہ حد سے زیادہ پوجا کرتا تھا۔ فلم کے آخر میں دونوں کے درمیان اختلاف پر مشتمل مکالمہ بازی اور مناظر پیش کیے جاتے ہیں۔ شاہ رخ خان نے قابل تعریف انداز میں اس اداکار کے سامنے اداکاری کی جس کی نقالی کرتے کرتے وہ جوان ہوا تھا۔

''محبتیں'' اور ''دیوداس'' کے کام کے دوران شاہ رخ خان کو بہت زیادہ محنت ومشقت کرنا پڑی جس کے باعث ان کا بدن مضمحل ہو گیا۔ مشکل ترین رقص، مار دھاڑ کے خطرناک مناظر اور پھر غیر صحت مند خوراک کے معمول...... چائے، مرغی کے گوشت کا برگر اور سگریٹ کے باعث اسکا بدن انتہائی لاغر ہو گیا۔ آئندہ دو سالوں میں اس کی کمر درد اور پھر گردن میں تکلیف کی شرح میں تغیر وتبدل رونما ہوتا رہا۔ 2004ء میں اسے آپریشن بھی کروانا پڑا۔ اسی دوران شاہ رخ خان کو اپنے گھریلو معاملات پر بھی توجہ مرکوز کرنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ اگرچہ شاہ رخ خان اور گاؤری اپنے گھر ''منت'' میں منتقل ہو چکے تھے لیکن یہ جائیداد متعدد قانونی تحفظات سے محروم تھی۔ عرصہ دراز سے میونسپل ٹیکس ادا نہیں کیے گئے تھے اور اس امر کا قوی امکان موجود تھا کہ حکومت اسے ضبط کر کے نیلام کر دیتی لیکن شاہ رخ خان جس کی سابقہ زندگی کرائے کے ایک گھر سے کرائے کے دوسرے گھر میں بسر کرتے گزری تھی اب اس معاملے میں پر عزم تھا کہ وہ اپنے اس شاندار گھر کو ہاتھ سے نہیں جانے دے گا۔ ''منت'' اس کے بچوں کے لیے ایک عظیم الشان ترکے کی حیثیت رکھتا تھا۔ حتیٰ کہ جب اس گھر کو اپنے قبضے میں رکھنے پر اٹھنے والے اخراجات اس کی اصل قیمت سے لاکھوں روپے متجاوز کر گئے تو پھر بھی شاہ رخ خان نے اس گھر سے دستبردار ہونے سے انکار کر دیا۔ اس نے گھر کے اخراجات کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لیے سر توڑ محنت کی، اشتہاروں میں اداکاری کی حتیٰ کہ نجی تقریبات میں رقص کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔

لیکن شاید اس کی انتہائی بدقسمتی یہ رہی کہ اس کا ذاتی ادارہ Shah Rukh's dot-com بند

ہوگیا۔ یہ ادارہ اس وقت قائم کیا گیا تھا جب شاہ رخ خان ”پھر بھی دل ہے ہندوستانی“ کے باعث مایوس اور دل گرفتہ تھا اور اس نے ایک ولولے اور امنگ کے ساتھ اپنا ذاتی کاروبار شروع کرنا چاہا تھا۔ شاہ رخ خان نئی اور جدید فنی مہارتوں کا بہت دلدادہ اور شائق تھا اور اس کا دفتر جو شاہ رخ خان کے پرانے گھر میں واقع تھا وہاں جدید فنی مہارتیں بھی موجود تھیں اور پھر کثیر تعداد میں باصلاحیت ذہین نوجوان اپنے تخلیقی خیالات کے ساتھ وہیں موجود تھے۔ شاہ رخ خان فلمی صنعت کے لیے ایک ایسا ادارہ بنانا چاہتا تھا جہاں صف اول کے اداکار ”آن لائن“ اپنے اپنے مخصوص شعبے قائم کر سکیں، فلموں کی ویب سائٹیں تیار کی جا سکیں اور پھر مصنوعات فروخت کی جا سکیں۔ (قابل فروخت مصنوعات میں شاہ رخ خان اور جوہی ٹی شرٹس کی پیشکش شامل تھیں) لیکن شاہ رخ خان کا یہ ادارہ جزوی طور پر ایک اور ادارے ”بی فار یو B4U“ کی ملکیت تھا جس میں بھرت شاہ کا بھی حصہ موجود تھا۔ بھرت شاہ کی گرفتاری کے بعد رقم کی دستیابی کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ مارچ 2001ء تک خسارہ لاکھوں تک پہنچ چکا تھا اور شاہ رخ خان کو اپنا یہ کاروبار بند کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس نے یہ خبر اپنے بتیس ملازمین کو سنائی اور رو دیا۔ وہ کہنے لگا: ”آپ میں سے کچھ افراد کا ابھی تک میرے ساتھ تعارف بھی نہیں ہوا۔ (وہ بھی رو دیئے) میں کبھی بھی اس قدر افراد کے سامنے دل گرفتہ نہیں ہوا۔“ فروخت کرنے کے لیے خاص طور پر تیار کی گئی مصنوعات، ٹی شرٹس، فائلیں، اشتہارات، سٹیشنری کا سامان سب کچھ گودام میں رکھ دی گئیں۔

یہ چھوٹی بڑی ناکامیاں، پریشانیاں اور افسردگیاں ”دیوداس“ کے اداکار کے لیے ”خوراک“ ثابت ہوئیں۔ شاہ رخ خان نے جب اپنے اندر پوشیدہ غم کو باہر نکالا تو وہ ”دیوداس“ بن گیا..... سب سے پہلی یہی چیز تھی جو سنجے چاہتا تھا۔ کچھ مناظر میں اس نے اپنے باپ کی پرچھائیں دیکھی۔ ایک اور منظر میں وہ نشے میں دھت ایک کشتی میں اوندھے منہ پڑا تھا۔ ادھر ادھر بکھرے دیے آسمان پر روشن تھے۔ اس کا خادم جو آخر تک اس کا وفادار رہا، مسلسل اس سے التجا کرتا رہا کہ وہ اپنے آپ کو تباہ نہ کرے۔ میر شراب نہیں پیتے تھے لیکن شاہ رخ خان کی نظر میں ایک اندھیری جھیل میں موجود کشتی میں ایک دل گرفتہ شخص کے نقش اور تصور نے اسے اپنے باپ کی یاد دلا دی جو خود بھی بے کسی اور دل گرفتگی کی حالت میں مر گیا تھا۔

جب شاہ رخ خان نے پہلی بار ٹیلیویژن پر کام شروع کیا تو پھر ہدایتکار لیکھ ٹنڈن نے

اسے بتایا کہ المیہ کردار کیسے ادا کیا جاتا ہے اور ٹیلیویژن پر ناظرین کے سامنے ناقابل فراموش انداز میں کیسے اپنی موت کا ڈرامہ کھیلا جاتا ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ ”مرنے کا یہ عمل“ قابل رحم محسوس نہ ہو۔ ایک کردار کو ”مرنے کے کردار میں بھی“ ناظرین سے کسی بھی قیمت پر ہمدردی طلب نہیں کرنا چاہیے۔ شاہ رخ خان نے یہ سب کچھ یاد رکھا اور ”دیوداس“ کے انتہائی غمگین لمحات کو بھی ایک قسم کے غصے کے ساتھ ناظرین کے سامنے پیش کیا۔ فلم کے آخر میں جب اس کی سواری پارو کے گھر کی طرف تیزی سے بھاگتی ہے تو وہ موت سے چند لمحات دور ہوتا ہے۔ اس نے پارو سے وعدہ کیا ہوتا ہے کہ وہ موت سے قبل اس کے پاس آئے گا۔ فلم کے آخری منظر میں وہ پارو کے گھر کے دروازے پر موت کے عالم میں ہوتا ہے اور بمشکل سانس لے رہا ہوتا ہے۔ اس کا افسردہ اور دل گرفتہ چہرہ تقریباً قابل نفرت و کراہت محسوس ہوتا ہے لیکن اس موقع پر بھی شاہ رخ خان نے ”دیوداس“ کا جبلی اور فطری ”فخر“ برقرار رکھا..... وہ بلا خوف و خطر موت کا سامنا کرتا ہے بالآخر جب وہ اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے پارو کو اپنی طرف دوڑ کر آتے دیکھتا ہے تو اس کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔

فلم کے دوسرے حصے میں زیادہ تر دیوداس کی تباہی کی داستان بیان کی گئی ہے جبکہ فلم کا پہلا حصہ اس کی بہتر حالت بیان کرنے کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ شاہ رخ خان نے اپنے کردار میں جان پیدا کرنے کے لیے عملی طور پر شراب نوشی کا مظاہرہ کیا۔ اکثر شاموں کو شاہ رخ آتا اور اپنے ”مکالمے“ یاد کرتا۔ وہ اس وقت تک اپنے مناظر کی مشق کرتا جب تک وہ خود مکمل طور پر مطمئن نہیں ہو جاتا اور پھر وہ الکحل پینے میں مصروف ہو جاتا۔ شاہ رخ خان الکحل کی محض اس قدر مقدار استعمال کرتا کہ اس کی آنکھیں نشیلی ہو جاتیں لیکن وہ الکحل کی اس قدر زیادہ مقدار استعمال نہ کرتا کہ اسے اپنے ”مکالمے“ یاد کرنے یا جسمانی طور پر حرکت کرنے میں مشکل پیش آتی۔ سورج طلوع ہوتے ہی وہ گھر پہنچتا تو تھکا ماندہ اور بھوکا ہوتا۔ اس تمام عمل کے باعث شاہ رخ کی توانائی ضائع ہو رہی تھی۔ اس کے دوست اس ضمن میں متفکر تھے کہ ایک سال پر مشتمل دیوداس کی تیاری کے دوران وہ کہیں عادی شراب نوش نہ بن جائے۔

اس دوران ایشوریہ رائے اپنی ذاتی زندگی میں متعدد مسائل کا شکار ہو چکی تھی۔ یہ اداکارہ سابق ”مس ورلڈ“ بھی رہ چکی تھی اور اس نے سنجے کی دوسری فلم ”ہم دل دے چکے صنم“ میں بھی کام کیا تھا۔ فلم کی تیاری کے دوران وہ اپنے ساتھی اداکار سلمان خان کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔

دوسال تک تو یہ عشق معاشقہ خوب ہنگامہ خیز رہا لیکن جب دیوداس کی فلم بندی شروع ہوئی تو یہ تعلق ناخوشگوار انداز میں ختم ہوگیا۔ سلمان واقعتاً ''دیوداس'' بن گیا، ساتھ ہی ساتھ وہ خود کو بھی تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ''محبت'' کو بچانے میں مصروف ہوگیا۔ وہ ''دیوداس'' کے عملے سے کہیں زیادہ ''دیوداس'' بن چکا تھا۔

اب سلمان خان کی راتیں ایشوریہ رائے کے ٹریلر کے فرش پر نشے میں دھت اوندھے منہ لیٹے ہوئے بسر ہوتیں۔ ایک رات شاہ رخ خان اور ایشوریہ ایک رومانی منظر عکس بند کروا رہے تھے جس کے دوران شاہ رخ نے اس کے پاؤں سے ایک کانٹا نکالنا تھا۔ سلمان بھی وہیں موجود تھا اور اس نے اپنے طور پر عملی مظاہرہ کر کے دکھایا کہ یہ عمل کس طرح انجام دیا جانا چاہیے۔ شاہ رخ خان رضامند ہوگیا اور سلمان نے اداکاری کر کے دکھایا لیکن سنجے نے کیمرے بند کردیے تھے یہ ایک بہت ہی دلدوز لمحہ تھا، ایک افسردہ اور دل گرفتہ عاشق فلم کے لیے اپنی زندگی کی اداکاری کر رہا تھا۔ ایشوریہ رونے لگی۔ یہ آخری مرتبہ تھا کہ دونوں ایک فلم کے موقع پر اکٹھے ہوئے تھے اور سب لوگ انہیں دیکھ رہے تھے۔ بالآخر 29 اپریل 2002ء کو 260 دفعہ عکس بندی کے بعد صبح پانچ بجے سنجے نے اعلان کیا کہ فلمبندی اختتام پذیر ہو چکی ہے۔ جنریٹروں کی گھر گھر بند ہوگئی۔ سنجے نے عملے کو رخصت ہو جانے کے لیے کہا لیکن کسی نے بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ انہیں بمشکل تمام یقین ہوسکا کہ ''دیوداس'' کی فلمبندی ختم ہو چکی ہے۔

تین ہفتے پہلے 3 اپریل کو ہندوستان کی سپریم کورٹ نے بھرت شاہ کی طرف سے ضمانت کے لیے پیش کی گئی نو درخواستوں کو منظور کرلیا۔ قید کے دوران بھرت شاہ کو مختلف امراض لاحق ہوگئے تھے اور پھر عدالت کے احکامات کے تحت اسے ممبئی کے پرتعیش ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ گرفتار ہونے کے پندرہ ماہ بعد وہ انتہائی لاغر ہو چکا تھا، اس کے رخسار اندر دھنس چکے تھے، اس کا وزن بائیس پاؤنڈ کم ہو چکا تھا اور وہ دل و دماغ کے امراض میں مبتلا ہو چکا تھا۔ جب اس کی بیوی نے اسے اطلاع دی کہ اس کی ضمانت ہو چکی ہے تو وہ رو دیا۔ اسی دوران ''کینز فلم فیسٹیول'' نے بغیر کسی مقابلے کے دیوداس کو نمائش کے لیے منتخب کرلیا۔ یہ تو تقریباً ایسا ہی تھا کہ جیسے فلمی دنیا کے ناخدا ''دیوداس'' کے عملے کی اس کوشش سے متاثر ہو گئے تھے کہ یہ فلم مکمل ہونی چاہیے اور لہٰذا اس نے دوبارہ مسکرانے کا فیصلہ کرلیا۔

''دیوداس'' تیار ہونے تک کوئی ہندوستانی مشہور فلم ایسی نہ تھی جو کسی فلمی میلے میں شریک ہوئی ہو۔ ہندوستانی فلموں میں موجود نغمے اور رقص مغربی جمالیاتی حس اور حسن کے قطعی مطابق نہ تھے۔ ہندوستانی فلموں کو بلند آہنگ اور جذباتی مناظر کا مرقع سمجھا جاتا تھا اور بین الاقوامی طور پر ان کی کبھی کبھار ہی نمائش ہوتی تھی۔ 1950ء کی دہائی میں یہ صورت حال موجود نہ تھی جب راج کپور کی ''آوارہ'' اور بمل رائے کی شاہکار فلم ''دو بیگھے زمین'' جیسی فلموں کی کینز (Cannes) میں نمائش کی گئی تھی لیکن 1956ء میں ستیاجیت رائے کی ''پتھر پنچالی'' نے وہ معیار اختیار کرلیا جو مغربی فلمی دنیا کے معیار کے مطابق تھا۔ مغربی تنقید نگار ''نغمے کے بغیر'' ہندوستانی فلم کو ایک ''حقیقی'' فلم تصور کرتے تھے اور اسے قابل قدر سمجھتے تھے اور اسے مقبولیت کا درجہ خیال کرتے تھے۔

کئی دہائیوں تک ہندوستانی فلمی صنعت کو ''پسماندہ تیسری دنیا'' کا درجہ حاصل رہا لیکن کینز (Cannes) میں پچپیسویں فلمی میلے میں ہندوستانی فلمی صنعت نے عالمگیر سطح پر انگڑائی لی۔ اس سے پہلے سال میں عامر خان کی ''لگان'' آسکر ایوارڈ کے لیے نامزدگی حاصل کر چکی تھی۔ اگرچہ یہ فلم انعام حاصل نہ کرسکی لیکن اس کے باعث ہندی فلموں میں آگے بڑھنے کی ایک تحریک پیدا ہوگئی جسے ''دیوداس'' نے مزید آگے بڑھایا۔ 23 مئی کو ''دیوداس'' کی عالمی سطح پر نمائش Salle Lumiere میں ہوئی۔ شاہ رخ، ایشوریہ اور سنجے نے گھوڑوں سے چلنے والی بگھی میں بیٹھ کر جائے نمائش پر پہنچ کر درکار فلمی ماحول مہیا کردیا۔ مرد روایتی نہرو جیکٹوں اور ایشوریہ ساڑھی میں ملبوس تھی۔ انہوں نے ساحل سمندر اور باغات میں تصاویر اتروائیں۔ ایشوریہ میں اس قدر کشش موجود تھی کہ ذرائع ابلاغ اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ سرکاری افسران، فلمسازوں اور کاروباری افراد سمیت سو افراد پر مشتمل ہندوستانی وفد فلم کے ناظرین میں اضافے کا باعث ثابت ہوا۔ اس ضمن میں شاندار تقریبات منعقد ہوئیں، پرتکلف ٹھہرائے دیے گئے اور ہر طرف یہ چرچا ہوگیا کہ اب ہندوستانی فلمی صنعت کا زمانہ آن پہنچا ہے۔ شاہ رخ خان نے بعد میں بتایا: ''ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو لیکن معلوم ایسا ہوتا تھا کہ کینز (Cannes) کا فلمی میلہ صرف ''دیوداس'' کے لیے ہی سجایا گیا تھا۔''

''دیوداس'' کی نمائش ایک سو پینسٹھ منٹ تک جاری رہی۔ اگرچہ ''کینز Cannes'' کے ناظرین نے فلم کو واضح پذیرائی بخشی، اکثر بین الاقوامی تنقید کار تین گھنٹوں پر مشتمل چمکتے دمکتے

رنگوں اور جذباتی مناظر کے ختم ہونے سے پہلے ہی اٹھ کر چلے گئے۔ فلم کے متعلق جائزے اور تبصرے تعریف سے لے کر تنقید پر مشتمل تھے۔ گارڈین Guardian کے تبصرہ نگار ڈیرک میلکم نے کہا: ''رومان، نغمے اور رقص پر مشتمل قطعی احمقانہ تین گھنٹے اور بالکل ہی بے مزہ۔ صرف اس کی پیشکش ہی قابل تعریف تھی۔'' لیکن ''ٹائمز'' کے رچرڈ کارلس نے سنجے کو ''فلم کا نوجوان ماہر'' قرار دیا۔ سال کے آخر پر ''ٹائمز'' کے مطابق دس سرفہرست فلموں میں ''دیوداس'' کو چوتھا درجہ عطا کیا گیا۔ مزید براں کارلس نے یہ بھی لکھا: ''دیوداس ایک ایسی فلم ہے جو اپنے شاندار مصنوعی مناظر، دلکش لباس اور خوبصورت حسن کے ذریعے آنکھوں کو تراوت اور تازگی بخشتی ہے۔ اس فلم میں ایک ایسی شان وشوکت اور عظمت موجود ہے جسے ہالی وڈ کے ناخدا پسند کریں گے۔''

کینز (Cannes) میں ہندوستانی وفد نے جو ''دیوداس'' دیکھ رہا تھا، فلم کے متعلق کسی خاص تعریف کا اظہار نہیں کیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وفد میں شامل افراد جان بوجھ کر خاموش رہے۔ شاہ رخ خان کی اداکاری کی تعریف وتوصیف کی گئی لیکن محسوس یہ ہوا کہ فلم کی طوالت زیادہ ہے اور اس میں چمکتے وشوخ مناظر ضرورت سے زیادہ شامل کیے گئے ہیں صرف ایک شخص ایسا تھا جس کو یقین تھا کہ یہ فلم کامیاب ہوگی، یہ گاوری تھی۔ اس کا یقین بالکل درست تھا۔ اس کی نمائش کا آغاز 12 جولائی کو ہوا۔ ہندوستانی تنقید نگاروں نے سنجے پر الزام لگایا کہ اس نے فلم کی اصل کہانی کی نسبت کچھ تبدیلیاں کی ہیں اور شرت چندر کے اصل ناول کو فلم کی ضرورت کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ سنجے کی کہانی کے مطابق پارو اور چندرمکھی اکٹھے بیٹھ کر اپنے محبوب ''دیوداس'' کے متعلق گفتگو کرتی ہیں جبکہ ناول کے مطابق وہ ایک دوسرے کا راستہ کاٹتی ہیں لیکن آپس میں ملاقات نہیں کرتیں لیکن ہندوستان اور بیرون ہندوستان دونوں قسم کے ناظرین نے اس فلم کو پذیرائی بخشی۔ فلمبندی کے مقامات اور اداکاروں/ اداکاراؤں کے لباس نظروں سے بھٹکانے والے نہیں بلکہ نگاہوں کے لیے باعث کشش تھے۔ اداکاراؤں نے جو ساڑھیاں پہنی ہوئی تھیں ان کو بھی ایسے ہی پسند کیا گیا جس طرح کہانی کو ناظرین نے پسند کیا۔ ''دیوداس'' نے مالی لحاظ سے شاندار اور عظیم کامیابی حاصل کی اور دنیا بھر سے بارہ ملین ڈالر سے زائد کی آمدن حاصل کی۔ اس فلم کو حکومت ہند کی جانب سے سرکاری طور پر آسکر ایوارڈ میں نامزدگی کے لیے بھیجا گیا اور ''غیر ملکی زبان'' پر مبنی فلم کے اعتبار سے ''دیوداس''

نے بہترین فلم کے طور پر BAFTA کی نامزدگی حاصل کی۔

3 دسمبر 2002ء کو شاہ رخ خان کو بھرت شاہ کے خلاف الزامات کے ضمن میں ایک ''مخصوص عدالت'' میں گواہ کے طور پر طلب کیا گیا۔ پولیس کا خیال تھا کہ شاہ رخ خان ان بہت سے اداکاروں میں شامل تھا جنہیں ناظم رضوی ڈرایا دھمکایا کرتا تھا۔ وکیل استغاثہ نے کہا کہ شاہ رخ خان سے ناظم رضوی کا مطالبہ جرائم پیشہ گروہ کے مالی تعاون سے تیار ہونے والی ایک فلم میں اداکاری کرنے کا تھا اور اسی نے ہی شاہ رخ کو شکیل سے بات کرنے پر مجبور کیا تھا۔ شاہ رخ نے بھی دیگر اداکاروں کے مانند الزامات کی صحت سے انکار کیا۔ فلمی صنعت سے منسلک دیگر گواہوں کے مانند اسے بھی ''جارح'' قرار دیا گیا۔ اس مقدمے میں وکیل استغاثہ روہنی سیلن نے فلمی صنعت کے خلاف بزدلی کے الزامات عائد کیے۔ اس کا خیال تھا کہ شاید کسی دباؤ کے تحت انہوں نے آسان راستہ اختیار کیا ہے۔ اس نے کہا ''شاہ رخ خان کو اس لیے جارحانہ رویہ اختیار کرنا پڑا کیونکہ وہ بھرت شاہ کا ممنون تھا۔'' وہ ''دیوداس'' تھا لیکن عدالت میں سچ ظاہر نہ کر کے فلمی صنعت نے بلاواسطہ طور پر ''جرائم پیشہ گروہوں'' کی معاونت کی۔ شاہ رخ خان کا موقف تھا کہ اس نے مصلحت کا راستہ نہیں اپنایا۔ ''ان لوگوں نے نہ تو مجھے کبھی ڈرایا دھمکایا اور نہ ہی میرے ساتھ برا سلوک کیا لہٰذا مجھے کچھ علم نہیں کہ وکیل استغاثہ مجھ سے کیا اگلوانا چاہتی ہے۔''

30 ستمبر 2003ء کو بھرت شاہ کو شک کی بنیاد پر رہا کر دیا گیا اور اسے ''جرم کی امداد و معاونت'' کرنے کے الزام سے بری تو کیا گیا لیکن ناظم رضوی اور شکیل کے کاروبار اور دولت ہتھیانے کے متعلق دانستہ معلومات چھپانے پر مبنی کم نوعیت کے الزامات کا مرتکب قرار دیا گیا۔ اسے ایک سال قید کی سزا سنائی گئی لیکن اسے رہا کر دیا گیا کیونکہ وہ پہلے ہی قید خانے میں پندرہ ماہ بسر کر چکا تھا۔ ملک کے قانونی حلقوں میں یہ سرگوشی عام سنائی دیتی تھی کہ اس نے ''دیوداس'' کو مالی اعانت مہیا کرنے کے علاوہ ملک کے چوٹی کے وکیلوں کو اپنے دفاع کے لیے پانچ سو ملین روپے کی خطیر رقم ادا کی۔ ناظم رضوی کے متعلق یہ خیال کر کے اس کی صوابدید پر بہت کم رقم دستیاب تھی اسے چھ سال قید کی سزا دی گئی۔

اس نے اپنی سزا کے خلاف درخواست گزاری اور دسمبر 2003ء میں اس کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ وہ پہلے ہی تین سال قید میں بسر کر چکا تھا۔

2003ء شاہ رخ خان کے لیے ایسا سال تھا جب ہر قسم کا ایوارڈ اس کے نام لکھ دیا گیا تھا۔ اس نے ''بہترین اداکار'' کے تمام صف اول کے انعامات جیتے جن میں فلم فیئر، سکرین اور زی سائن ایوارڈ شامل تھے۔ حتیٰ کہ ''ڈزنی کڈز چینل ایوارڈ'' نے بھی اسے ''دیوداس'' میں بہترین اداکاری کے انعام کا حقدار قرار دیا۔ ''دیوداس'' ایک مشکل کردار تھا اور جن مشکل حالات میں فلم بنی یہ مزید مشکل ہو گیا تھا۔ دلیپ کمار کے مقابلے میں شاہ رخ خان کی اداکاری کو نہایت سنجیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور اسے بہترین قرار دیا گیا۔ شاہ رخ خان نے ہندوستانی فلمی دنیا کے کارل لیوس کے خلاف دوڑ لگائی تھی اور نہایت آبرومندانہ انداز میں خود کو دستبردار کروالیا تھا۔ ''دیوداس'' کے ذریعے شاہ رخ نے اپنی ''دیومالائی'' حیثیت دوبارہ حاصل کر لی تھی۔ اس نے رومانی ہیرو سے ماورا بہت سا تجربہ حاصل کر لیا تھا اور ثابت کر دیا تھا کہ وہ محض راہول یا راج سے کہیں اعلیٰ وارفع ہو سکتا ہے۔ بے شمار مشکلات کے باوجود اس نے کامیابی کے ساتھ ''نئی صدی کا دیوداس'' تخلیق کیا تھا۔ اب راوی ہر طرف چین وسکون لکھتا تھا کیونکہ شاہ رخ خان اب دوبارہ ''کنگ خان'' کے مرتبے پر فائز ہو گیا تھا۔

❁

سترہواں باب

''کنگ آف بالی وڈ''

''کنگ خان KING KHAN'' چار فٹ کی طوالت کے الفاظ چمکتے دمکتے تیز روشنی کے قمقموں سے جگمگا رہے تھے اور شاہ رخ خان کے نام کے الفاظ سرخ گدی سے مزین تخت کے اردگرد حلقے کی صورت میں اپنی بہار دکھا رہے تھے اور پھر ناظرین نے اس کی انتہائی کامیاب فلم ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' کے مرکزی خیال پر مبنی نغمہ ''تجھے دیکھا تو یہ جانا صنم'' کو پہلی دفعہ سنا اور پھر وہ تخت پر بیٹھے ہوئے ایک دیوتا کے مانند سٹیج پر نمودار ہوا اس دوران وہاں موجود تین ہزار مختلف قسم کے افراد نے شور و غل، چیخ و پکار اور اس کے لیے تعریفی الفاظ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ اس دن مارچ 2006ء کی چار تاریخ تھی اور موریطانیہ کے ''سوامی دیویکانند کونشن سنٹر'' میں ''زی سائن ایوارڈ'' کی تقریب کے لیے یہاں لوگ اکٹھے ہوئے تھے۔

یہ تقریب روایتی طور پر ہندوستانی فلمی صنعت کے اداکاروں، نغموں اور رقص سے مزین تھی جس کے دوران درجنوں انعام تقسیم کیے گئے اور اتنی ہی تعداد میں تعریفی تقریریں بھی کی گئیں۔ شاہ رخ خان اس شام کا ''مہمان خصوصی'' تھا۔ تقریب کے اختتام پر اس نے اپنی تقریر میں یش چوپڑا کو عظیم خراج تحسین پیش کیا جس نے ہندوستانی فلمی صنعت میں متعدد سنگ میل عبور کرنے میں اس کی مدد کی..... ڈر، دل والے دلہنیا لے جائیں گے، ویر زارا۔ اس کے بعد شاہ رخ خان نے سٹیج پر یش اور یش کی فلموں میں کام کرنے والے دیگر اداکاروں اور موریطانیہ کے وزیراعظم نوین چندرارام گولم کے ساتھ مل کر رقص کیا جو ان عظیم شخصیات کی معیت میں قدرے سراسیمہ نظر آرہا تھا اس نے اپنے اس تشکر کا اظہار کیا کہ اس کا ملک اس شاندار تقریب کے انعقاد میں کامیاب رہا۔ یہ تقریب تمام رات جاری رہنے میں کسی بھی قسم کا امر مانع نہیں تھا لیکن شاہ رخ خان کے تخت کو ہوا میں اڑا دیا گیا۔ تخت سے اترنے کے بعد اس نے ایک نظر اسے دیکھا اور یوں تبصرہ کیا: ''اوہ ہو یہ تو بہت خوفناک ہے!'' بہر حال اس کے

ذریعے ایک حقیقت تو واضح ہوگئی کہ "شاہ رخ خان کنگ آف بالی وڈ" ہے۔
زی ٹی وی دنیا کے ایک سو تیس ممالک میں دیکھا جاتا ہے۔ انعامات کی یہ تقریب بار بار خاص طور پر مناسب اوقات میں نشر کی گئی۔ اس نشریاتی ادارے کے اندازے کے مطابق تقریباً دو سو ملین ناظرین نے اسے دیکھا۔ یہ تعداد مناسب تو ہے لیکن چونکا دینے والی نہیں ہے۔ صدی کے آخر تک شاہ رخ خان اور ہندوستانی فلمی صنعت نے اکثر غیر ملکی مقامات پر ناظرین کی بھاری تعداد کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ پولینڈ میں ناظرین پردہ سیمیں کے سامنے رقص کر رہے تھے جہاں "کبھی خوشی کبھی غم" مقامی زبان میں ترجمے کے ساتھ 2005ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ ہمسایہ ملک جرمنی میں ہندوستانی فلموں کے متعلق جوش و جذبہ اس قدر بڑھ چکا تھا کہ 2006ء میں جرمن زبان میں "Bollywood Rapid Eye Magazine" نامی رسالے کا اجراء کیا گیا۔ پہلے شمارے کے سرورق پر شاہ رخ خان کی تصویر تھی۔ اسی سال پیرس میں پرستاروں کا ایک ہجوم شاہ رخ خان اور اس کے ساتھی اداکاروں، پریتی زنٹا اور رانی مکرجی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے امڈ پڑا جو وہاں اپنی فلم "ویرزارا" کی افتتاحی نمائش کے موقع پر آئے تھے جب ہجوم کی تعداد پانچ ہزار تک پہنچ گئی تو تقریب گاہ کے دروازے بند کر دیے گئے۔

انگلستان میں نغموں اور رقص نے برطانیہ میں اداکاری کی تربیت فراہم کرنے والے سب سے اعلیٰ ادارے "British Academy of Films & Television Arts" کو بے حد متاثر کیا۔ جولائی 2006ء میں اس اکیڈمی نے ایک ہفتہ وار تعطیل کے موقع پر مشہور ہندی فلموں کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی جسے "BAFTA GOBS BOLLYWOOD" کا نام دیا گیا پھر وہاں جشن منایا گیا اور تصویریں اتریں۔ شاہ رخ، کرن اور یش چوپڑا بھی ان تقریبات میں شامل تھے۔ ایک بہت ہی لطف آمیز روایتی تقریب کے دوران عظیم برطانوی فلمساز ڈیوڈ لین روم اور اکیڈمی کے پہلے صدر نشین کو ہندوستانی فلمی صنعت کی طرف سے ایک یادگار تحفہ پیش کیا گیا۔ لیسٹر میں قائم شادی کی خدمات مہیا کرنے والے ایک ادارے "لاکھانی گروپ" نے نہایت ہی فنکارانہ انداز میں ایک ہندوستانی تخت تیار کیا تھا جس پر خوبصورت نقش و نگار کندہ تھے اس کے پائے بھی نہایت حسین تھے اور ساتھ دیے بھی روشن کیے گئے تھے۔ اس کی دیواروں میں سے روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔

عالمگیر سطح پر ہندوستانی فلمی صنعت کی طرف سے اس قسم کے متحرک اور ولولہ انگیز

اقدامات ہندوستانی معیشت اور تہذیب کی نشاۃ ثانیہ کے لیے کی گئی کوششوں کا ایک حصہ تھے۔
چین کے بعد 1990ء سے 2005ء تک ہندوستان ایک ایسا واحد ملک تھا جس نے بہت تیزی سے ترقی کی۔ معیشت کی ترقی کی رفتار جو اوسطاً چھ فیصد سالانہ تھی، بڑھ کر 2005ء میں سات اعشاریہ پانچ ہوگئی۔ یہ ایسا ہی تھا کہ جیسے ایک پسماندہ بدعنوان قوم جس کے رہنما بھی ضمیر فروش تھے اور عوام زبوں حال تھے اپنے گلے کے طوق اور پاؤں کی بیڑیوں کو جھٹک کر دنیا فتح کرنے کا ارادہ کر لے۔ دہائیوں پہلے 15 اگست 1947ء کو پہلے ہندوستانی وزیراعظم جواہر لال نہرو نے اپنے مشہور بیان میں اپنے عزم و ارادے کا اظہار کیا تھا۔ "یہ ایک ایسا لمحہ ہے جو اقوام کی تاریخ میں کبھی کبھار ہی آتا ہے۔ جب ہم پسماندگی سے باہر نکل کر جدت اختیار کرتے ہیں جب تاریخ کا ایک باب ختم ہو جاتا ہے اور جب ایک عرصے سے کچلی ہوئی قوم کی روح اپنے اظہار کی راہ تلاش کر لیتی ہے۔" ان کے یہ تاریخی الفاظ جو ایک آزاد ہندوستان کے قیام کی پہچان تھے ان کی گونج 1990ء کی دہائی میں سنائی دی جب اس قوم نے عالمگیریت کے لحاظ سے خود کو ڈھالا اور سنبھالا دیا۔ اس نئی ہزاروی میں ہندوستان 1950ء کی دہائی کا ہندوستان نظر آ رہا تھا، ایک نئی آزاد ہونے والی قوم جو اپنے روشن مستقبل کے لیے قابل اعتماد اقدامات اٹھاتی ہے۔ کم از کم شہری علاقوں میں ہندوستان نے وقت کے لمحات کو اپنی مٹھی میں اس یقین کے ساتھ بند کیا جیسے بیسویں صدی امریکہ کے نام تھی اسی طرح اکیسویں صدی ہندوستان کے نام ہوگی۔

اس قومی خود اعتمادی اور جائیت پسندی کا آغاز ایک مضبوط معیشت کے ذریعے ہوا جو چین کے برعکس نجی تجارتی و کاروباری آجروں کے ہاتھ میں تھی۔ بے انتہا بدعنوانی اور گندی سیاست اور ٹوٹے پھوٹے ملکی ڈھانچے کے باوجود معتدل ہندوستانی کاروباری افراد نے عالمی معیار کے حامل تجارتی و کاروباری ادارے تخلیق کیے اور اس طرح ایک نہایت ہی جدید اور ترقی پذیر بازار حصص کا قیام عمل میں آیا۔ ابلاغی و اطلاعاتی فنی مہارت اور کاروبار کے حوالے سے دنیا کو رہنمائی مہیا کی۔ 2006ء میں ابلاغی و اطلاعاتی فنی مہارت کے شعبے نے 36 ملین ڈالر کی آمدن پیدا کی جو مجموعی قومی آمدنی کا تقریباً 5 فیصد تھا۔ 19 جون 2006ء کے شمارے میں "ٹائم" نے سرورق کے مضمون کے حوالے سے "India's New Dawn" کے عنوان کے تحت یہ بتایا کہ ہندوستان میں ایک "نئی دنیا" تخلیق ہو چکی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ کی ملازمت آپ

کے بغیر ہی ہندوستان منتقل ہو چکی ہے۔ اس مضمون میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اب ہندوستان میں چین کی نسبت ''زیادہ کروڑ پتی'' افراد بستے ہیں۔ مزید یہ کہ دس امیر ترین ہندوستانی افراد برطانیہ میں اپنے ہم منصبوں سے زیادہ دولت مند ہیں۔

2002ء میں وسیع پیمانے پر کی گئی ایک غیر ملکی تحقیق کے مطابق آئندہ پچاس سال کے دوران ہندوستان کی معیشت تیز ترین رفتار سے ترقی کرے گی۔ اس جائزے میں یہ بھی پیش گوئی کی گئی کہ 2040ء تک ہندوستان کی معیشت جاپانی معیشت کو مات دیتے ہوئے امریکہ اور چین کے بعد دنیا کی تیسری بڑی معیشت بن جائے گی۔ مارچ 2006ء کے شمارے میں ''نیوز ویک'' نے لکھا: ''ہندوستان کی معیشت دنیا کی سب سے بڑی معیشت ہے۔'' آئی بی ایم، نوکیا اور ہنڈائی جیسے صف اول کے بین الاقوامی تجارتی اور کاروباری ادارے ہندوستان میں اپنی موجودگی کو استحکام بخش رہے ہیں۔ سرورق کے مضمون "The New India" کے عنوان کے تحت ''نیوز ویک'' نے بتایا: ''چند ماہ پہلے مالیاتی حلقوں میں یہ سرگوشی عام تھی کہ ہر شخص اور اس کا کتا اپنی دولت میں اضافہ کرنے کے لیے ہندوستان میں سرمایہ کاری کر سکتا ہے۔ اب یہ نظریہ زیادہ عام ہو گیا ہے کہ اب ''انسان'' کی بھی ضرورت نہیں رہی۔''

ہندوستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں ترقی کی رفتار روز افزوں ہے۔ 2006ء تک مختلف قسم کے پانچ ملین کنکشن (موبائل فون) ہر ماہ حاصل کیے جا رہے تھے۔ نئے نئے اور جدید مراکز خریداری تعمیر ہو رہے تھے، نیز کثیر المنزلہ عمارتیں بھی وجود میں آ رہی تھیں جن میں ملکی اور غیر ملکی تجارتی اور کاروباری اداروں کے پر تکلف دفاتر قائم تھے۔ عظیم الشان ہوٹل اور مہنگے ریستوران جیسے ''اُگ'' رہے تھے۔ درجنوں قسم کے رسائل و جرائد شائع ہونا شروع ہو گئے جن میں جدید اندازِ زندگی کے طور طریقوں کی نمائش کی جاتی لیکن اس قسم کا ایک بڑا ملک جہاں بے شمار اقوام بستی ہوں اس کے لیے خوشحالی اور خوشی حاصل کرنے کی خاطر عالمگیریت کا مہیا کردہ سادہ طریقہ اپنانا بہت ہی مشکل ہے۔

ہندوستان کے تیزی سی تبدیل ہوتے ہوئے منظر نامے نے بہت سے تلخ حقائق کو چھپا لیا ہے۔ ہندوستان کے پانچ لاکھ پچاس ہزار دیہات جہاں دو تہائی افراد آباد ہیں، ترقی سے محروم ہیں، مزید براں تین سو ملین سے زائد افراد ایسے ہیں جن کی آمدن یومیہ ایک ڈالر سے بھی کم ہے، علاوہ ازیں ہندوؤں اور مسلمانوں، امیروں اور غریبوں، طاقتوروں اور کمزوروں کے

درمیان صدیوں کی آمیزش کا نتیجہ، بم دھماکوں، قتل و غارت اور فسادات کی شکل میں ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ ملک میں موجود اس تفریق نے موجودہ دور میں واضح شکل اس وقت اختیار کی جب 2004ء میں قومی انتخابات کے موقع پر کانگریس کے ہاتھوں حکمران بی جے پی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ بی جے پی کی حکومت نے اپنے انتخابی نعرے کے طور پر "India Shining" and the "Feel Good Factor". کو اپنایا تھا اور وسیع پیمانے پر اکثریت حاصل کرنے کی پیش گوئی کی تھی لیکن ایک عام ووٹر سیاستدانوں، سیاسی تبصرہ نگاروں اور مختلف پیش گوئیوں سے زیادہ سمجھدار اور عقل مند ثابت ہوا۔ ایک عام ووٹر کے نزدیک ہندوستان اس قدر چمکدار اور روشن نہیں تھا لہٰذا اس نے سیاستدانوں کو میدان سے باہر کر دیا۔

لیکن ان مشکلات اور مسائل کے باوجود تیسری دنیا کے ایک پسماندہ اور لڑکھڑاتے ملک کی حیثیت سے ہندوستان کی معیشت ایک عظیم مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی اور بین الاقوامی معیار کا نقش ثانی دنیا کے سامنے نہایت فخر کے ساتھ پیش کر سکی۔ طاقتور مغربی ذرائع ابلاغ نہایت تعریفی انداز میں اس تبدیلی کی خبر دے رہے تھے۔ مختلف قسم کے اخبار و جرائد مختلف قسم کی سرخیاں جما رہے تھے مثلاً "CAN INDIA FLY?" (سرورق کی کہانی اکانومسٹ 3-9 جون 2006ء) "AN ECONOMY UNSHACKED" (فارن افیئرز جولائی/اگست 2006ء) اور "INDIA INC" (سرورق کا مضمون ٹائم 26 جون 2006ء)۔ ڈیووس (DAVOS) میں منعقد ہونے والے ''ورلڈ اکنامک فورم 2006ء'' میں ہندوستان کا مدمقابل کوئی نہ تھا۔ وزیر خزانہ پی۔ چدم برم کی قیادت میں ممتاز صنعتکاروں اور پالیسی سازوں پر مشتمل ایک "DREAM TEAM" نے ان تھک اور سرتوڑ کوشش کے بعد ہندوستان میں موجود ہر ''مصنوعہ'' کو عالمی منڈیوں میں متعارف کروایا، ان مصنوعات میں ہندوستانی فلمیں، ان کے صوتی نمونے، پشمینہ شالیں، ہندوستانی باورچی اور بڑے بڑے اشتہاری تختے جن پر INDIA EVERY WHERE تحریر تھا شامل ہیں۔

ہندوستانی معیشت میں بہتری آنے کے باعث تہذیبی اقدار میں نکھار پیدا ہو گیا۔ تہذیب بھی ترقی کرنے لگی۔ ہندوستان کے متعلق دنیا کے خیالات و تصورات تبدیل ہو گئے۔ اب ہندوستان سانپوں کی پوجا کرنے والا ایک اجنبی سیارہ نہیں رہا تھا جہاں خاوند کی موت پر ان کی بیواؤں کو بھی ان کے ساتھ ہی ''ستی'' ہونا پڑتا تھا اور گائے کے باعث

آمدورفت رک جاتی تھی۔ اگرچہ ہندوستان کے بعض علاقوں میں ملیریا ابھی بھی موجود ہے،
ہڈیوں کے ڈھانچوں پر مشتمل بچے گداگری کرتے ہیں لیکن ہندوستانی تہذیب وتمدن اب
فائیو سٹار ہوٹلوں سے جگمگا رہا ہے جہاں پاستا اٹلی سے درآمد کیا جاتا ہے، رس بھری کا جام پائین
سے منگوایا جاتا ہے اور مختلف قسم کے مانوس بین الاقوامی نام مثلاً میکڈونلڈ، کوک اور ''سب
وے'' (زیرزمین ریلوے سٹیشن) اب ہندوستان میں عام ہو چکے ہیں۔ ہندوستان کا شہری
علاقہ اب عالمی معیار کے ریستورانوں، جدید شراب خانوں، لذیذ کھانوں اور مستند مصنوعات
مثلاً Cartier, Trussardi, Barberry کے ذریعے بین الاقوامی زبان ومعیار کا مرکز بن چکا
ہے۔ یہاں ایسی جدید دکانیں بھی موجود ہیں جہاں ایک ''ہینڈ بیگ'' کی قیمت اکثر
ہندوستانیوں کی ماہانہ تنخواہ سے بھی زیادہ ہے۔ 2006ء میں پہلے ہندوستانی ''رولز رائس'' شوروم
کا افتتاح ممبئی میں ہوا۔

اسی دوران ہندوستان بین الاقوامی جدید مصنوعات کا مرکز بن چکا تھا اور اسی طرح
مقامی صنعت کار اور فیشن ڈیزائنر اپنی مصنوعات کی نمائش، میلان، لندن اور نیویارک میں کر
رہے تھے۔ ہندوستانی مصنفین کی ایک نئی نسل اپنی تخلیقی خدمات کے عوض لاکھوں ڈالر وصول کر
رہی تھی اور مقامی کتابوں کے بے شمار زبانوں میں ترجمے ہو رہے تھے۔ اسی طرح نیلام گھروں
میں ہندوستانی فن پارے مہنگے داموں غیر ملکی خریداروں کے ہاتھوں فروخت ہو رہے تھے۔
اب عالمی گیر سطح پر یہ تاثر منظر عام پر آ چکا تھا کہ بالآخر ہندوستان کا زمانہ آن پہنچا ہے۔
برصغیر کی ایک بہت ہی زیادہ متمدن منڈی 'ہندوستانی فلمی صنعت' اپنی قسم کی فلموں کے
باعث دنیا بھر میں اپنا غلبہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ عالمی سطح پر بہت سی دیگر فلمی صنعتیں
معدوم ہو چکی تھیں لیکن ہندوستانی فلمی صنعت نے ہالی وڈ کا اثر اور تسلط قبول کرنے سے انکار کر
دیا اور اپنے لیے نئی اور علیحدہ راہیں تلاش کیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اخراجات اور آمدن کے
لحاظ سے ہندوستانی فلمیں ابھی بھی بہت پیچھے ہیں...... یعنی مہنگی سے مہنگی ہندوستانی فلم کی
لاگت ہالی وڈ کی فلموں میں چند منٹ پر مشتمل ''Visual Effect'' سے کم ہوتی ہے لیکن چند ایک
ہندوستانی فلمیں ایسی تھیں جنہوں نے مغرب کو اپنی طرف توجہ مرکوز کرنے پر مجبور کر دیا۔ حالانکہ
ہندوستانی فلمیں مغربی فلمی منڈی میں رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں اور ناظرین
نغموں اور ترجمے کے ساتھ مسلسل تین گھنٹوں تک ہندوستانی فلمیں دیکھنے سے بہت زیادہ پس د

پیش کرتے تھے...... لیکن ہندوستانی فلموں کے متعلق عالمی رائے تبدیل ہو چکی تھی پھر بھی کئی
تنقید نگار ہندوستانی فلم کو طربیہ جذبات نگاری کا مرقع سمجھتے تھے لیکن درحقیقت اب ہندوستانی
فلمیں نہایت ہی بے مثال خوبصورت اور قابل اعتماد، ذریعہ تفریح سمجھی جانے لگی تھیں۔

اب صف اول کے فلمی میلے بھی ہندوستانی فلموں کی تلاش میں تھے۔ کینز (Cannes)
برلن، ٹورنٹو اور وینس کے فلمی تقسیم کار ممبئی آ کر ان ہندوستانی فلموں کو ڈھونڈتے تھے جو ان کی
منڈیوں میں ان کے لیے نفع بخش ثابت ہو سکیں۔ اس سے پہلے مقامی ہدایتکار نغموں کے بغیر
فلمیں بنا کر مغربی ماحول کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کر چکے تھے لیکن انہیں کچھ حاصل نہ ہوا
تھا۔ بہرحال اہم ہندوستانی اداکاروں اور ہدایتکاروں کو میلے کے منصفین کے سامنے مدعو کیا
جانے لگا تھا۔ ہندی فلمی صنعت تعلیم وتربیت کا ایک ذریعہ بھی بن چکی تھی۔ مشہور برطانوی اور
امریکی یونیورسٹیوں میں ماہر بشریات، علماء اور تاریخ دان، ہندوستانی فلمی صنعت کی تاریخ کے
متعلق تحقیق کرتے نظر آنے لگے۔ ہندوستانی فلمی صنعت نے ایک ایسا معیار حاصل کر لیا جسے
نیویارک یونیورسٹی کا ماہر بشریات ڈاکٹر ڈیجاس وینی گانتی ''تہذیبی قانونی حیثیت'' قرار دیتا
ہے یعنی ایک ایسے معاشرے کی طرف سے قبولیت کا اظہار جس کی بنیاد اس کے روایتی ناظرین
نہیں ہیں۔

شدید تمازت اور حرارت سے بھرپور ممبئی کے فلم سٹوڈیو میں مارے مارے پھرتے
فلمسازوں کو اب یہ احساس ہو گیا تھا کہ اب وہ عالمی تہذیبی تغیر وتبدل کے ممتاز کردار ہیں۔
بہت سے فلمسازوں نے مغربی معیار کے مطابق فلم بنانے کے متعلق خواب دیکھے...... یعنی
تائیوان کے ایک ڈائریکٹر Ang Lee کی فلم Crouching Tiger, Hidden Dragon کے
مانند فلمیں جس میں ایک لاجواب نسلی معقولیت موجود تھی لیکن پھر بھی اس فلم نے امریکہ میں
128 ملین ڈالر کی مجموعی آمدن حاصل کر لی لیکن کچھ فلمسازوں کی خواہش تھی کہ وہ مغربی ناظرین
تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ہندی فلموں کے مروجہ مقبول انداز کو تبدیل کر دیں۔ بہرحال
ہندوستانی فلمی صنعت صرف اپنی شرائط پر ہی ہالی وڈ کے ساتھ اپنا ناطہ جوڑنا چاہتی تھی۔ 2004ء
میں "MIRAMAY FILMS" کے سربراہ ہاروے وِنسٹن نے ممبئی کا دورہ کیا۔ ایک شام شاہ
رخ خان، ادتیا اور کرن سمیت فلمی صنعت کے منتخب سرکردہ افراد کے ساتھ گپ شپ میں صرف
کی لیکن یہ بات چیت بہتر تعلقات قائم کرنے سے آگے نہ بڑھ سکی۔ کرن نے کہا: ''ہاروے

ونسٹن آیا اور چلا گیا۔ اس نے ہمارے ساتھ رابطہ کیا اور نہ ہی ہم نے اس کے ساتھ رابطہ کیا۔
ہمارا دنیا میں واحد ایسا ملک جو اس قدر آزادی کے ساتھ کام کرتا ہے کہ ہمیں غیر ملکی سٹوڈیو کی
ضرورت نہیں ہے۔'' لیکن 2005ء میں غیر ملکی فلمی صنعت نے فیصلہ کر لیا کہ انہیں ''ہالی وڈ'' کی
ضرورت ہے۔ اسی سال اکتوبر میں ''سونی پکچرز انٹرٹینمنٹ'' نے ہندی زبان میں ایک فلم
''سانوریا'' بنانے کا اعلان کیا جو نغموں کے ساتھ ساتھ رومان کا امتزاج تھی اور اس میں نئے
اداکاروں نے کام کرنا تھا اور ہدایتکاری کے فرائض سنجے بھنسالی نے انجام دینے تھے۔

یہ گفتگو ہالی وڈ اور اگر وسیع النظری سے دیکھا جائے تو عالمگیر سطح پر محض اس لیے ممکن تھی
کیونکہ ''ہالی وڈ'' مادر پدر آزاد مغرب کے مانند کام نہیں کر سکتا تھا۔ اب جرائم پیشہ گروہوں کی
حکومت ختم ہو چکی تھی ان گروہوں کے سرغنے یا تو گرفتار ہو چکے تھے (ابو سلیم 2002ء میں گرفتار
کر لیا گیا تھا) یا وہ مشرق وسطیٰ اور زیر زمین چلے گئے تھے۔ (2003ء میں امریکہ نے داؤد کو
عالمگیر دہشت گرد قرار دیا اور اس کے اثاثے منجمد کر دیے) فلمی صنعت میں سابقہ طریقہ بحال
ہو چکا تھا جس کے مطابق عوامی سرمائے کے کاروباری ادارے قائم ہو چکے تھے جو کمپیوٹر کے
ذریعے آمدن کا حساب رکھتے تھے۔ چیکوں کے ذریعے ادائیگیاں اور وصولیاں کرتے تھے اور
صرف ''کہانی کے مسودے'' تک محدود رہتے تھے۔

بہرحال ہندوستانی فلمی صنعت نے باقاعدہ ''تجارتی و کاروباری ادارے'' کی حیثیت
حاصل کر لی تھی۔ یہ صنعت ایک بہت ہی بڑے مشترکہ خاندان میں تبدیل ہو گئی جہاں طاقتور فلمی
''سلطنتیں'' مثلاً یش اور ادتیا نہایت مستحکم انداز میں داخل ہو چکی تھیں۔ ابھی کچھ پہلو ایسے تھے
جہاں جدیدیت کی ضرورت تھی ...... دور افتادہ مقامات سے حاصل ہونے والی آمدن کی نگرانی
ابھی بھی ناممکن تھی اور ذاتی تعلقات قانونی معاہدات سے ابھی بھی زیادہ اہم سمجھے جاتے تھے
لیکن مجموعی طور پر ہندوستانی فلمی صنعت پھل پھول رہی تھی۔ 2006ء میں ایک غیر ملکی تحقیقی
ادارے کے جائزے کے مطابق یہ انکشاف ہوا کہ Indian Entertainment and Media
Industry کا یہ اندازہ ہے کہ ہندوستانی فلمی صنعت نے گزشتہ سال بیس فیصد شرح کے حساب
سے شاندار ترقی کی ہے اور آئندہ پانچ سال کے لیے بھی ترقی کی یہی رفتار برقرار رہنے کی توقع
ہے۔ اس وقت (2005ء) فلمی صنعت میں 68 بلین روپے کی سرمایہ کاری موجود ہے اور
2010ء تک سرمایہ کاری کا تخمینہ 152 بلین تک پہنچنے کی توقع ہے۔

ہندوستانی فلمی صنعت کی اس ترقی کے محاذ پر شاہ رخ خان کی حیثیت ہراول دستے کی سی
تھی۔ گزرتے ماہ و سال میں اس کی کامیاب فلموں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا لیکن شاہ رخ
خان محض اب وہ اداکار نہیں رہا تھا جو حیرت انگیز اور انتہائی کامیاب ہے اور دولت کے پیچھے
بھاگتا ہے۔ وہ اب نئے، ترقی پذیر اور جدید ہندوستان کا استعارہ بن چکا تھا۔ 2005ء میں
حکومت ہند نے اسے سرکاری طور پر ایک ''مثالی شہری'' کے منصب سے نوازا۔ شاہ رخ خان کو
ملک کا چوتھا اعلیٰ شہری انعام پدم شری عطا کیا گیا اور اس طور اس کی فن کے حوالے سے بے مثال
اور ممتاز خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ جنوری 2007ء میں یہ اعلان کیا گیا کہ لندن میں واقع مادام
تساؤ کے عجائب گھر میں اس کا موی مجسمہ نصب کیا جائے گا۔ وہ ہندوستانی فلمی صنعت کا تیسرا
اداکار تھا جس کا موی مجسمہ بنایا گیا۔ اس سے پہلے امیتابھ بچن اور ایشوریہ رائے کے موی مجسمے
اس عجائب گھر میں نصب کیے جا چکے ہیں۔

فلمی دنیا میں پندرہ سال بسر کرنے کے بعد شاہ رخ خان نے کہا کہ اب وہ ایک ایسے
مقام پر ہے جہاں اس نے اپنے لیے کچھ حدود متعین کر لی ہیں اور وہ ان کے مطابق کام کر رہا
ہے۔ ''اب کسی نئے انقلاب کی توقع نہیں۔ جب یہ دور ختم ہو جائے گا تو ایک اور دور کا آغاز ہو
جائے گا۔'' لیکن اب اس نے ان کرداروں کا انتخاب کیا جن کے باعث راج / راہول پر مبنی
طرز اداکاری اختتام پذیر ہوا۔ کرن کی تیسری فلم 2006ء میں تیار ہونے والی ''کبھی الوداع نہ
کہنا'' جدید ہندوستان اور لامذہبیت پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس فلم میں شاہ رخ
خان فٹ بال کا ایک ایسا کھلاڑی ہے جس کا شاندار مستقبل کار کے ایک حادثے کے بعد
دھندلا جاتا ہے اور وہ لنگڑا ہو جاتا ہے۔ وہ اب بہت ہی تلخ مزاج اور خبطی ہو جاتا ہے اور اپنی
بیوی کی ایک ''فیشن میگزین'' میں اعلیٰ ملازمت سے حسد کرنے لگتا ہے اور وہ اپنے چھ سالہ بیٹے
کے ساتھ بھی نہایت گھٹیا اور برا سلوک کرتا ہے۔ بالآخر اسے ایک خاتون کی بانہوں میں تسکین
اور راحت حاصل ہوتی ہے جو پہلے ہی سے شادی شدہ ہے۔ شاہ رخ جو ہندوستانی فلموں کا ایک
نمائندہ رومانی ہیرو تھا اور ایک مثالی خاوند تھا اس فلم میں دکھایا جاتا ہے کہ اس نے شادی شدہ
ہونے کے باوجود ایک دوسری عورت سے تعلقات قائم کر رکھے ہیں حتیٰ کہ وہ کسی دوسرے مرد
کی بیوی کے ساتھ ہم بستری بھی کرتا ہے۔

دو ماہ اس کی فلم ''ڈان DON'' ریلیز ہوئی۔ یہ فلم امیتابھ بچن کی 1978ء کی ایک فلم کی

''ری میک Remake'' تھی جس میں امیتابھ بچن نے دو کردار ادا کیے۔ ایک کردار ایک جرائم پیشہ گروپ کے خوفناک سرغنے کا تھا اور دوسرا کردار گلی کوچوں میں گا بجا کر اپنی روزی کمانے والے ایک شخص کا تھا جس کی شکل جرائم پیشہ گروہ کے سرغنے سے مشابہ تھی۔ پولیس اس شخص کو جرائم پیشہ گروہ کے راز جاننے کے لیے ایک مخبر کی حیثیت سے بھرتی کر لیتی ہے۔ 2006ء میں بننے والی یہ فلم "Mission Impossible" کی طرز پر ہیجان خیز تھی جس میں شاہ رخ ایک بین الاقوامی مجرم کا کردار ادا کرتا ہے جس کے لیے بندوقیں، ہتھیار، منشیات اور سنہرے بالوں والی خوبصورت لڑکیاں کھلونوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس سے پہلے بننے والی فلم "DON" کی کہانی ایک سادہ اور غریب گلی کوچوں میں گا بجا کر روزی کمانے والے شخص کے گرد گھومتی ہے جبکہ بعد میں تیار ہونے والی فلم "DON" کی کہانی مجرموں کے ایک سرغنے کی کہانی ہے۔ وہ شاندار لباس پہنتا ہے اور اپنے ہیلمٹ سے لوگوں کو قتل کرتا ہے۔ فلم میں اس کا تکیہ کلام یہ مکالمہ ہوتا ہے ''ڈان کا انتظار تو گیارہ ملکوں کی پولیس کر رہی ہے لیکن ایک بات سمجھ لو ڈان کو پکڑنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔'' ایک بار پھر اس کے باوجود کہ شاہ رخ خان لوگوں کی گردنیں توڑتا ہے مخبروں کو قتل کر دیتا ہے اور قتل کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے لیکن پھر بھی ناظرین اسے ناپسند نہیں کرتے اور اس کے لیے ہمدردانہ جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ ''کبھی الوداع نہ کہنا'' اور ''ڈان'' دونوں فلمیں بہت ہی کامیاب ثابت ہوئیں۔ جنوری 2007ء میں شاہ رخ خان نے دوبارہ ٹی وی پر کام شروع کر دیا اور ''کون بنے گا کروڑ پتی'' کی میزبانی کرنے لگا۔ اس بار بھی شاہ رخ خان امیتابھ بچن کے نقش قدم پر چل رہا تھا جو اس سے پہلے دو پروگراموں کی میزبانی کر چکا تھا۔ فلمساز کی حیثیت سے شاہ رخ خان اپنی فلموں میں نئے نئے تجربات کرنا چاہتا تھا۔ وہ Superman اور Batman جیسی فلمیں بنانا چاہتا تھا۔ اپریل 2006ء میں اس نے "Red Chillies VFX" نامی ادارہ قائم کیا تاکہ وہ مندرجہ بالا فلموں جیسے صوتی اور نظری تاثرات تخلیق کر سکے۔ شاہ رخ کی خواہش تھی کہ وہ ایک ایسی فلم بنائے بلکہ اس کی ہدایتکاری بھی کرے جو عالمگیر سطح پر مقبولیت کے درجے پر فائز ہو سکے۔ ''میں ایک ایسی فلم بناؤں گا جسے ایک دنیا پسند کرے گی۔ گھاٹ کوپر میں موجود سینما گھر میں موجود ایک عام شخص سے لے کر سٹیون سپل برگ تک ہر شخص اسے دیکھے گا۔''

شاہ رخ خان ہندوستانی فلمی صنعت اور ہندوستان دونوں کے لیے ایک قطعی اور مستند سفیر

کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے ہندی فلموں کو دور افتادہ علاقوں کی رسائی میں کر دیا۔ لہٰذا پچاس سال سے زائد عمر کی ایک آسٹریلوی گھریلو خاتون جس کا نام سینڈی مان ہے نے کہا: ''شاہ رخ خان نے اس کی زندگی میں ولولہ، طلسم اور خوشیاں بھر دیں۔'' وہ انٹرنیٹ کے ذریعے شاہ رخ خان کے حوالے سے پرستاروں کی چھ کلبیں چلا رہی ہے جو شاہ رخ خان کے متعلق یادگار واقعات، رسائل، جرائد، ڈی وی ڈی جمع کرتی ہیں اور انٹرنیٹ کے ذریعے شاہ رخ خان کے دیگر پرستاروں کے ساتھ تعلقات استوار کرتی ہیں۔ اگلے سال اس نے چاند پر ایک قطعہ خرید کر شاہ رخ خان کے لیے مخصوص کر دیا۔ سینڈی کا خیال ہے کہ شاہ رخ خان میں ایک قسم کا وقار اور شان موجود ہے کہ جیسے اسے خدا کا لمس حاصل ہوا ہو۔''

شاہ رخ خان کے ساتھ اس ''عقیدت'' کی کہانیاں دنیا بھر میں مختلف جذبوں اور ولولوں کے لحاظ سے بار بار دہرائی جا رہی ہیں۔ وہ خواتین بھی دکھائی دیں جنہوں نے شاہ رخ خان کے گھر کے دروازے پر جا کر مطالبہ کیا کہ وہ جس پانی سے منہ دھوئے گا وہ اسے پی لیں گی۔ کئی خواتین نے اپنے خون میں ڈوبے ہوئے قلم سے اسے خط لکھے۔ لکھنؤ میں رہنے والے وشال نامی ایک نوجوان پرستار نے اپنا نام تبدیل کر کے شاہ رخ رکھ لیا کیونکہ بقول اس کے اس کے گردے میں موجود سرطان اس وجہ سے ختم ہو گیا کہ شاہ رخ خان نے اس کے لیے دعا کی تھی۔

اب شاہ رخ خان کی زندگی ایک ایسی شاندار اور نفیس نہج پر ہے کہ اب وہ مزید یہ نہیں بتا سکتا کہ اداکاری اور حقیقت میں کیا فرق ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کی زندگی ایک "PS2 Game" جیسی ہے۔ ''میں ایک افسانوی دنیا میں رہتا ہوں، میری شخصیت بھی مصنوعی ہے اور میں خود بھی غیر حقیقی ہوں۔'' لیکن شاہ رخ خان نے اپنی زندگی میں بے حساب ذاتی المیے کو بھی برداشت کیا ہے اور شاندار کامیابی کا ذائقہ بھی چکھا ہے، ان دونوں انتہائی تجربات نے اسے دنیا میں ناموری اور شہرت کے باوجود غرور سے الگ رہنے کی سمجھ عطا کی ہے۔

جس طرح ماضی میں بڑے اداکار غرور اور تفاخر کا شکار ہو جاتے تھے شاہ رخ نے ایسا رویہ کبھی نہیں اپنایا۔ اسے اپنے اعلیٰ مقام کا احساس ہے لیکن وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایک دن قہقہوں کی یہ چکاچوند خاموش ہو جائے گی، اس کے لیے داد و تحسین کے نعرے معدوم ہو جائیں گے۔ شاہ رخ کو بخوبی علم ہے کہ ایک دن اس کی یہ دیومالائی حیثیت ماند پڑ جائے گی اور ناظرین اس سے اکتا کر ایک نیا ''دیوتا'' تخلیق کر لیں گے۔

شاہ رخ نے کہا: ''مجھے معلوم ہے کہ اب سب کچھ ختم ہونے والا ہے۔ ہر قسم کی داد و تحسین، انعامات اور صلوں کے بعد میں ایک ایسا بوڑھا شخص ہوں گا جو تقریبات میں اس لیے شرکت کرے گا کہ لوگ اسے عزت سے سٹیج پر بلائیں گے۔ میں یہ سب کچھ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں یہ سوچتا ہوں کہ میں دلیپ کمار اور امیتابھ بچن کے مانند عظیم بنوں گا۔ ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو۔ ممکن ہے کہ میں ایک میلے کچیلے دیہات میں رہنے والا میلا کچیلا شخص بن جاؤں لیکن اس وجہ سے مجھے لوگوں کے دل بہلانے سے کوئی نہیں روک سکتا اور مجھے ایک جذبے اور شوق کے مانند لوگوں کے دلوں کے اندر رہنے سے بھی کوئی منع نہیں کر سکتا۔''

اسے یہ ناممکن خواب دیکھنے سے اور اسے حقیقت بنانے سے بھی کوئی نہیں روک سکا کہ وہ ہمیشہ ایک بڑے اور عظیم اداکار کی حیثیت سے زندہ رہے۔ شاہ رخ کا کہنا تھا: ''میری دادی اماں کہا کرتی تھیں زیادہ فوٹو مت کھچواؤ، ہر فوٹو کے ساتھ زندگی کے تین سیکنڈ کم ہو جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ بے شمار کیمرے بیک وقت میری اس قدر زیادہ تصویریں کھینچیں کہ میں صرف ایک لمحہ زندہ رہوں۔ تصویریں اتارتے اتارتے کیمرے بند ہو جائیں اور کوئی شخص یہ پوچھے کہ کیا ہوا؟ س کی تصویر اترتے ہی وہ مر گیا۔'' میرا خیال ہے کہ اس جہان سے جانے کا اس سے اچھا طریقہ کوئی اور نہیں۔''

❀❀❀